شعری سلسلہ
سلیم احمد
کُلیاتِ سلیم احمد
(مکمل مجموعہ کلام)
alhamra
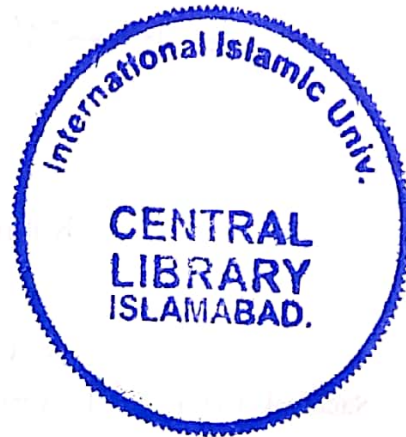
(مکمل مجموعہ کلام)

alhamra

طبع اول: فروری 2003
طابع: الحمرا پرنٹنگ پریس
ناشر: شفیق ناز۔ الحمرا پبلشنگ۔ اسلام آباد

Kulliyat-i Saleem Ahmad
Saleem Ahmad

Saudipak Tower, Jinnah Avenue, Islamabad - Pakistan

Printed in Pakistan - ISBN: 969-516-111-1

از عبداللہ عتیق بابر

بیاض

اکائی

چراغِ نیم شب

مشرق

بازیافت

فہرست

بیاض

اکائی

چراغ نیم شب

مشرق

فصل اول

فصل دوم

بازیافت

بیاض

اِنتساب

محمد حسن عسکری کے نام

تصویر

آج سے سولہ تیرہ برس پہلے کی بات ہے، ایک سانولا سلونا لڑکا احمد عبدالقیوم کے بر آمدے میں بیٹھا ہری مرچوں کے ساتھ گرم گرم بھنے چنے کھاتے ہوئے نٹشے اور اقبال پر بڑی دھواں دھار بحث کر رہا تھا۔ مجھے بحث کرتے ہوئے لڑکے اچھے نہیں لگتے، لیکن جب نٹشے اور اقبال کے ساتھ نظیر اکبر آبادی بھی آکر بیٹھ گئے تو میں نے لڑکے کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ایسا تپا ہوا چہرہ، ایسا دہکا ہوا چہرہ کہ خیال آیا اس بار گوتم نروان حاصل کیے بغیر ہی بستی میں لوٹ آیا ہے۔ میں نے پوچھا "میاں تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے پلٹ کر اس نوعمری میں بڑے جلال سے مجھے دیکھا اور اپنے ریشم کی طرح ملائم بالوں کو جو بار بار اس کی پیشانی پر آپڑتے تھے، ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا۔ "سلیم احمد" اور پھر اسی جلال کے عالم میں نٹشے، اقبال اور نظیر اکبر آبادی کو جلدی جلدی تاش کے پتوں کی طرح پھینٹنے لگا۔ مجھے اس کا یہ انداز بہت پیارا لگا۔

گوتم کی ایک حرکت مجھے اب تک بہت کھٹکتی ہے۔ جنگل کی طرف وہ بھلے کو جاتے، لیکن انہیں بیوی کو جگا کر یہ بات بتادینا چاہیے تھی۔ یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ کسی اخلاق یا مذہبی فلسفہ کا آغاز بداخلاقی سے ہو ہی نہیں سکتا۔ سلیم احمد کو اگر پھر کبھی صحرا کی طرف جانے کی ہوک اٹھی تو اس

کے بیوی بچے کیا سوچیں گے۔ میں نے پھر اس کی بحث میں مخل ہوتے ہوئے ایک سوال کیا۔ ''میاں! تمہاری شادی ہو چکی ہے یا نہیں؟'' اس اچانک سوال پر اس نے دفعتاً اقبال کے ''مرد مومن'' نطشے کے ''انسان کامل'' اور نظیر اکبر آبادی کے ''سو ہے وہ بھی آدمی'' کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے سے اٹھادیا اور مسکراتے ہوئے میری جانب رخ کر کے بڑے جم کر جواب دیا۔ ''جی نہیں! میری شادی نہیں ہوئی ہے، اب فرمائیے۔'' میں نے کہا۔ ''فرمانا کیا ہے۔ یہ بحث وحث چھوڑو، چلو کسی اچھے حکیم کے پاس چلتے ہیں۔'' حکیم کے پاس تو خیر وہ کیا جاتا، الٹی میری ملاقات سید ذوالفقار علی بخاری سے کرادی۔

ہندو دیومالا کے کرداروں کی طرح سلیم احمد کے کئی چہرے ہیں۔ سلیم احمد جو اپنے یار دوستوں کے ساتھ اس بات پر قہقہے لگا رہا ہے کہ لوگ سڑک پر چاٹ کھانے کو تہذیبی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ جو ۴۷ء کے فسادات کے بعد ہندوستان سے آتے ہوئے پیسہ نہیں لایا، کتابیں نہیں لایا، سفارشی خط نہیں لایا صرف اپنی شیروانی لایا جسے اب بھی پہن کر جب باہر نکلتا ہے تو خود کو پورا آدمی سمجھتا ہے۔ سلیم احمد کا ایک چہرہ وہ ہے جو کبھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں دودھاری تلوار لیے بیٹھا رہتا تھا اور ایک چہرہ یہ بھی ہے کہ آج جب حضرت قبلہ ذہین شاہ تاجی کی محفلوں میں وہ ادب سے سر جھکائے بیٹھا ہوتا ہے تو سرکار دوعالم ﷺ کے نام پر اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ سلیم احمد جو دن میں بیک وقت تین فلمی کہانیوں پر کام کرتا ہے، جو ویدوں کا حافظ ہے، جو نماز کے بعد کانٹ اور ہیگل کا مطالعہ کرتا ہے، جو سینٹ اگسٹائن کے ٹوٹے پھوٹے خدا کو خالی اوقات میں جوڑتا رہتا ہے، جو ریڈیو کے ڈرامے لکھتا ہے، جس نے نئی نظم میں پورے آدمی کی تلاش سے مایوس ہو کر پچھلے سال شادی کرلی، جس نے چوہوں اور مینڈکوں پر تجربہ کرنے کے بجائے معاشرے کی تبدیل ہوتی ہوئی قدروں کے انجکشن خود اپنی ہی غزلوں کو دیئے اور بدنام ہوا اور بڑے دکھ سہے۔

اس جنگل میں آپ سلیم احمد کو کہاں تلاش کریں گے۔ سلیم احمد جو ایک بڑا غزل گو شاعر ہے، جو بہت اچھا ڈرامہ نگار ہے، جو تنقید میں اصولی معاملات پر امام غزالی کی طرح ہنٹر کھینچے بیٹھا رہتا ہے، جو ایک بڑے خاندان کا تنہا کفیل ہے، جس نے دوستوں سے ایذا اٹھانے کے بعد بھی انہیں دعائیں دی ہیں، جو نروان کی تلاش میں جس درخت کے نیچے جا کر بیٹھا، اس کی تپش سے وہ درخت ہی جل

اٹھا۔ بہت مجبور ہو کر اب وہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے پاس جا بیٹھا ہے۔ جہاں نہ کوئی صحرا ہے اور نہ کوئی درخت، ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے مشورہ دیا کہ "بیاض" کے ساتھ تصویر شائع نہ کراؤ کیونکہ تمہاری ہر تصویر جھوٹی ہو گی۔ اس نے کہا "لفظوں میں تو سما سکتی ہے؟" میں نے سوچا تمیں پینتیس سال کا تیکھے خطوط کا شیروانی پہنے ہنستا ہنساتا، اچھا خاصا معقول آدمی ہے۔ لفظوں میں تصویر آ تو سکتی ہے، لیکن اب جب میں یہ تصویر کھینچنے بیٹھا ہوں تو خیال آرہا ہے کہ جس طرح خوشبو کو، روشنی کی کیفیت کو، ابلتے ہوئے سمندروں کی جھلاہٹ کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح سلیم احمد کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آسان ترکیب یہ ہے کہ حریت کے کالموں میں روزانہ اس کی جو تصویر چھپتی ہے، اسے دیکھ لیجئے اور یقین کر لیجئے کہ یہ سلیم احمد نہیں ہے۔

ریاض فرشوری

گزارش

گزارش ہے کہ میں نے یہ کتاب ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لیے نہیں
لکھی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے سے میں جسمانی ہی نہیں
نفسیاتی بلوغت کا بھی مطالبہ کرتا ہوں۔

شعر و ادب کے پڑھنے والے کو بالغ ہونا چاہیے اور نڈر ہونا چاہیے۔ اس مجموعہ میں شاعری کتنی ہے یا ہے بھی کہ نہیں، اس بارے میں مجھ سے زیادہ آپ کو فیصلہ کرنا چاہیے، لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، پوری بے خوفی سے کہا ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں سے بھی اسی بے خوفی کی امید رکھتا ہوں۔ میں نے شاعری نہ ہونے یا کم ہونے کی بات انکسار کے طور پر نہیں کی۔ انکسار کے معنی میری لغت میں یہ کبھی نہیں رہے کہ کسی انسان پر وحی آئے اور وہ ابو جہل کی دل جوئی کی خاطر انکساراً اس سے انکار کرے۔ جس پر وحی آئے، اسے وحی کا دعویٰ کرنا چاہیے۔ انکسار کے صرف ایک معنی ہیں، اپنی حیثیت کو پہچاننا۔ آدمی کچھ لوگوں سے بڑا اور کچھ لوگوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اسے جاننا چاہیے کہ وہ کس سے بڑا ہے اور کس سے چھوٹا۔ پھر ان کے حسب مراتب ان سے سلوک کرنا چاہیے۔ میں صحیح معنی میں انکساراً عرض کرتا ہوں کہ میں اردو شاعری کی موجودہ حالت

کو دیکھتے ہوئے اس مجموعے کی اشاعت سے شرمندہ نہیں ہوں۔ شاعری کے بارے میں ایک اور بات مجھے کہنی ہے کہ میں چاند، بادل اور دریا کے الفاظ استعمال کرنے کو شاعری نہیں سمجھتا۔ بعض لوگوں جنہیں صرف اس قسم کے الفاظ پر وجد آتا ہے، شاعرانہ اور غیر شاعرانہ الفاظ اور مضامین کی قیدو تخصیص کے قائل ہوتے ہیں۔ ان کا نظریہ صحیح ہو یا غلط، میں اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ خود رحمی اور رقت کے جذبات بھی مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں ہیں۔ یہ عناصر کسی حد تک مجھے بھی اپنی پیشروؤں سے وراثت کے طور پر ملے ہیں مگر میں نے ان سے شعوری جنگ کی ہے۔ کاش میں اس جنگ میں اس سے زیادہ کامیاب ہوتا۔ اب رہ گیا بعض ایسے الفاظ کے استعمال کا معاملہ جنہیں اس زمانہ کی جعلی مہذب سوسائٹی قبول نہیں کرتی تو اس سے معذرت کیے بغیر مجھے اس بات پر زور دینا ہے کہ اس سوسائٹی کو میر، سودا، نظیر اور آتش کی پوری کلیات کا مطالعہ بجبر کرانا چاہیے۔ یہ ایک تہذیبی خدمت ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ ان بزرگ ترین شعرائے اردو نے درسی ضروریات کے لیے شاعری نہیں کی، لیکن میں نے بھی اس مجموعہ کی تشکیل اس امید پر نہیں کی ہے کہ اسے بھی کسی دن نصاب میں شامل کر لیا جائے گا۔

آخر میں ایک بات اور! یہ کتاب جیسی کچھ بھی ہے، میری شعوری کاوش کا نتیجہ ہے۔ ویسے بھی میں شاعری کو شعور کی اولاد سمجھتا ہوں۔ رہ گئی لاشعوری کیفیت تو گزارش یہ ہے کہ زندگی اور ادب دونوں میں ہمارا سلسلہ نسب ماں سے نہیں، باپ سے چلتا ہے۔

سلیم احمد

حُسن جب سے ہوا ہے کم آزار
عشق بھی بن گیا ہے دنیا دار

گو نہ غالبؔ کو ہو ہمیں تو ہے
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

عشق میں کھو کے عزتِ سادات
میرؔ کی طرح کیوں پھریں ہم خوار

ہم نہ درویش ہیں نہ صوفی و رند
رنگِ آتشؔ ہمیں نہیں درکار

طرزِ حسرتؔ پہ ہم نہیں لہلوٹ
ہم کو چکی کے کام سے ہے عار

ہم روش پر فراقؔ کی کیوں جائیں
منزلِ غم نہیں ہمارا دیار

ربط رکھتے ہیں گو یگانہ سے
اُن کا مسلک مگر ہے تیغ کی دھار

ان کا اپنا جُدا معاملہ ہے
ہم کو ہے اپنے کام سے سروکار

حال تجھ سے چھپا نہیں میرا
اے مرے عکس میرے آئینہ دار

ایک مٹی سے ہے ہمارا خمیر
ایک کپڑے کے ہیں شعار و دثار

جو مرا حال ہے وہی تیرا
تو میرا صید میں ہوں تیرا شکار

میں لکھوں تو پڑھے کہ ہو برعکس
ہیں بہرحال ہم شریکِ کار

تجھ کو معلوم ہے کہ ہم دونوں
اپنی حالت سے چاہتے ہیں فرار

بے خودی ڈھونڈتے ہیں فرصت میں
تلخیِ زندگی سے ہیں بے زار

روح میں گھل گئی ہے بے کیفی
اور اعصاب پر تھکن ہے سوار

کھنچ رہی ہیں رگیں تشنج سے
دکھ رہا ہے بدن کا اک اک تار

خون میں رچ گئی ہے تلخی زہر
نشہ زیست کر رہا ہے اُتار

آج جس پر خزاں کی یورش ہے
کل یہی زندگی تھی صبحِ بہار

بستیاں شوق کی ہوئی ویراں
قلعے خوابوں کے ہوگئے مسمار

کیا کریں ہم نفس کدھر جائیں
کس سے دل کا سکون مانگیں ادھار

کوئی رہبر نہ رہنما نہ رفیق
کوئی رستہ نہ منزلیں نہ دیار

بے تعلق ہوئے تو ایک ہوئے
کوئی دشمن رہا نہ کوئی یار

گونج بھی لوٹ کر نہیں آتی
الامان وحشتِ زندگی کی پکار

ہم ہیں اے جان ڈوبنے والے
میں ابھاروں تجھے تو مجھ کو اُبھار

اب یہی اک علاج ہے اپنا
اپنی پستی کا خود کریں اقرار

ہے بلندی کہیں جو فطرت میں
خود ہی آ جائے گی بروئے کار

آج میں تجھ سے عہد کرتا ہوں
تو بھی کر عہد اے مرے غم خوار

خود کو دھوکے میں ہم نہ رکھیں گے
ہم نہ باندھیں گے جھوٹ کا طومار

ہوسِ جاہ تنگِ عشق سہی
ہم کو جب ہے تو کیوں کریں انکار

ہم بھلا کس پہ جان دیتے ہیں
سرفروشی کا کیوں کریں اظہار

ہم کو ایمان سے ہے جان عزیز
کیوں کہیں خود کو صاحبِ ایثار

آئینہ کیوں خلوص کو دکھلائیں
اپنے دل میں بھرا ہوا ہے غبار

کیوں کریں فخر چاکِ دامن پر
پیرہن چاہیے ہمیں زرتار

آن پر آ کے جان دے بیٹھیں
خیر ایسے نہیں ہیں ہم خود دار

ہم نہ سقراط ہیں کہ زہر پئیں
ہم نہ عیسیٰ کہ پائیں عزتِ دار

مفت بن باس لے کے عمر گنوائیں
کوئی ہم رام جی کے ہیں اوتار

ہم نہ دیں گے کسی کو درسِ عمل
کرشن کے روپ سے ہیں ہم بیزار

کربلا سے بہت یہ نسبت ہے
مانتے ہیں حُسین کو حقدار

اِس سے بڑھ کر نہ ہم میں تاب نہ دم
سر کٹانے پہ ہم نہیں تیار

بس بہت ہے یہ اعتراف سلیم
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

صحرا میں اذان دے رہا ہوں

دل حُسن کو دان دے رہا ہوں
گاہک کو دکان دے رہا ہوں

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں

ہر کہنہ یقیں کو از سرِ نو
اک تازہ گمان دے رہا ہوں

گونگی ہے ازل سے جو حقیقت
میں اُس کو زبان دے رہاں ہوں

میں غم کو بسا رہا ہوں دل میں
بے گھر کو مکان دے رہا ہوں

بے جادہ و راہ ہے جو منزل
میں اُس کا نشان دے رہا ہوں

جو فصل ابھی کٹی نہیں ہے
میں اُس کا لگان دے رہا ہوں

حاصل کا حساب ہو رہے گا
فی الحال تو جان دے رہا ہوں

رکھوں جو لحاظ مصلحت کا
کیا کوئی بیان دے رہا ہوں

ترے سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہوں
تجھے بھی کچھ بدلتا جا رہا ہوں

نہ جانے تجھ کو بھولا ہوں کہ خود کو
بہر صورت سنبھلتا جا رہا ہوں

طبیعت ہے ابھی طفلانہ میری
کھلونوں سے بہلتا جا رہا ہوں

حقیقت کو مکمل دیکھنا ہے
نظر کے رخ بدلتا جا رہا ہوں

چلا ہے مجھ سے آگے میرا سایہ
سو میں بھی ساتھ چلتا جا رہا ہوں

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں
سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

بہت نازاں ہوں محرومی پہ اپنی
اسی پر ہاتھ ملتا جا رہا ہوں

کسی کا وعدۂ فردا نہیں میں
تو کیوں فردا پہ ٹلتا جا رہا ہوں

عشق میں جس کے یہ احوال بنا رکھا ہے
اب وہی کہتا ہے اس وضع میں کیا رکھا ہے

لے چلے ہو مجھے اس بزم میں یارو لیکن
کچھ مرا حال بھی پہلے سے سنا رکھا ہے

حالِ دل کون سنائے اسے فرصت کس کو
سب کو اس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھا ہے

دل بُرا تھا کہ بھلا، کام وفا کے آیا
یار جانے بھی دے اس بحث میں کیا رکھا ہے

اے صبا آکہ دکھائیں تجھے وہ گل جس نے
باتوں ہی باتوں میں گلزار کھلا رکھا ہے

دیکھ اے دل نہ کہیں بات یہ اس تک پہنچے
چشمِ نم ناک نے طوفان اٹھا رکھا ہے

حُسن چاہے جسے ہنس بول کے اپنا کرلے
دل نے اپنوں کو بھی بیگانہ بنا رکھا ہے

دل جو اس بزم میں آتا ہے تو جاتا ہی نہیں
ایک دن دیکھنا دیوانہ ہُوا رکھا ہے

حال مت پوچھ محبت کا ہوا ہے کچھ اور
لا کے کس نے یہ سرِ راہ دیا رکھا ہے

انتظام ایسا کہ گھٹتی ہی نہیں رونقِ بزم
ہم سے کتنے ہیں کہ وعدہ پہ لگا رکھا ہے

ہوش تو پہلے ہی کھو آئے تھے اس محفل میں
اب اگر جائیں تو پھر دل بھی گیا رکھا ہے

تیرے آنے کی خبر پا کے ابھی سے دل نے
شکوہ کو اور کسی دن پہ اٹھا رکھا ہے

بارہا یوں بھی ہوا تیری محبت کی قسم
جان کر ہم نے تجھے خود سے خفا رکھا ہے

دشت و در خیر منائیں کہ ابھی وحشت میں
عشق نے پہلا قدم نامِ خدا رکھا ہے

ہجر میں رنج بھی کرتے ہیں پہ اتنا بھی سلیم
یار تو نے تو عجب حال بنا رکھا ہے

جس کا انکار بھی انکار نہ سمجھا جائے
ہم سے وہ یارِ طرح دار نہ سمجھا جائے

اتنی کاوش بھی نہ کر میری اسیری کے لیے
تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

اب جو ٹھہری ہے ملاقات تو اس شرط کے ساتھ
شوق کو درخورِ اظہار نہ سمجھا جائے

نالہ بلبل کا جو سنتا ہے تو کھل اٹھتا ہے گل
عشق کو مفت کی بیگار نہ سمجھا جائے

عشق کو شاد کرے غم کا مقدر بدلے
حسن کو اتنا بھی مختار نہ سمجھا جائے

بڑھ چلا آج بہت حد سے جنونِ گستاخ
اب کہیں اس سے سرِ دار نہ سمجھا جائے

دل کے لینے سے سلیم اس کو نہیں ہے انکار
لیکن اس طرح کہ اقرار نہ سمجھا جائے

جنابِ دل کی بھی خوش فہمیاں بلا کی ہیں
اسی سے داد کے طالب ہیں جس سے شاکی ہیں

جو چپ رہے ہیں کبھی لب بنازِ خوش گوئی
تو اس نگاہ نے باتیں ہزارہا کی ہیں

خبر تو زلف کی کچھ دے تری گلی کی ہوا
کہ الجھنیں تو وہی جانِ مبتلا کی ہیں

تمہارے حسن کی باتیں بھی لغزشیں ٹھہریں
تو لغزشیں یہ محبت میں بارہا کی ہیں

لاکھ قائل ہو مگر منہ سے نہ مانے کوئی
یوں بھی اے عشق سناتا ہے فسانے کوئی

سنگِ در چھوڑ کے اب راہ پہ آ بیٹھے ہیں
جیسے آئے گا یہاں سے بھی اٹھانے کوئی

دور رہنے کے نکالے ہیں ہزاروں حیلے
کاش ڈھونڈے یونہی ملنے کے بہانے کوئی

خواب ہی خواب ہیں سب جور و کرم شادی و غم
ایسے خوابوں سے بدلتے ہیں زمانے کوئی

خود بخود آج گریبان پہ نظر جاتی ہے
گل کھلایا نہ ہو صحرا میں صبا نے کوئی

اپنا کیا جاتا ہے بن جائے ترا کام سلیم
ہم تو سمجھائیں مگر بات بھی مانے کوئی

مدت سے گو پیام بھی تیرا ملا نہیں
تو مجھ کو بھول جائے یہ دل مانتا نہیں

الفاظ پر نہ جا کہ بیاں گو نیا نہیں
یہ ماجرا وہ ہے جو کسی نے سنا نہیں

کس بے جہت سفر پہ رواں قافلہ ہوا
منزل نہیں مقام نہیں مرحلہ نہیں

دل دیکھنے چلا تھا طلسمِ حیات کو
بس یہ کسر رہی ہے کہ پتھر بنا نہیں

جو قیس و کوہکن پہ ہوا تھا سو ہم پہ ہے
اے حاضرینِ بزم یہ قصہ نیا نہیں

اے داورِ حیات ترے لطف کے نثار
دل وہ مجھے دیا جو کسی کام کا نہیں

دل دے چکے تو جان بھی نذرِ وفا کرو
انکار کا سلیم کوئی راستہ نہیں

اللہ رے سلیم تری بدگمانیاں
اتنی سی بات پر کہ وہ ہنس کر ملا نہیں

ہر چند ہم نے اپنی زباں سے کہا نہیں
وہ حال کون سا ہے جو تو نے سنا نہیں

ایسا بھی اب نہیں ہے کہ نازِ صبا اٹھائیں
مانا کہ زلف یار سے وہ سلسلہ نہیں

کیا حسنِ احتیاط ہے کیا رکھ رکھاؤ ہے
محفل میں دیکھتا ہے تو پہچانتا نہیں

یوں بھی ہزار روگ ہیں دل کو لگے ہوئے
پھر اس پہ یہ ملال کہ وہ پوچھتا نہیں

کتنا دیارِ درد کا موسم بدل گیا
تجھ کو نگاہِ ناز ابھی کچھ پتہ نہیں

تو بدگماں سہی پہ کبھی مل سلیم سے
یہ امرِ واقعہ ہے کہ دل کا بُرا نہیں

کیا خبر عشق ہے اس بات پہ خوش یا مغموم
کہ اُسے حالِ تمنا بھی نہیں ہے معلوم

رکھ رکھاؤ کو ترے مان گئے نرگس ناز
ایک عالم کو گنہگار کرے، پھر معصوم

خلوتِ شوق میں افسانہ در افسانہ ہوئی
وہ اُچٹتی سی نظر جس کا نہ تھا کچھ مفہوم

اب تو نیرنگِ محبت سے ہے کچھ اور امید
رہ چکے لُطف پہ شاد اور ستم پر مغموم

عشق اتنا بھی توجہ پہ نہو شاد کہ آج
حُسن اندازِ تغافل سے ہوا ہے محروم

دلِ صد چاکِ زلیخا کو نہ دیکھے کوئی
چاکِ پیراہنِ یوسف کی مچے شہر میں دھوم

سمجھتے ہیں مزاجِ حُسن کو پر کیا سمجھتے ہیں
بس اتنا ہے کہ ہم اس کو بھی اپنا سا سمجھتے ہیں

زیاں ہوتے ہیں کیا کیا عشق میں یارو نہ سمجھاؤ
یہ اپنا کام ہے ہم خوب یہ دھندا سمجھتے ہیں

نگاہِ ناز ان کے حق میں تیرا فیصلہ کیا ہے
یہ اپنا کام ہے ہم خوب یہ دھندا سمجھتے ہیں

تپاکِ حُسن کی کیا بات اک دنیا اسی کی ہے
مگر ہم ہیں کہ اس کو آج بھی تنہا سمجھتے ہیں

مزاجِ حُسن یہ کیا طرح ڈالی ہے جدائی کی
کہ ملنے کو ترے ہم وعدۂ فردا سمجھتے ہیں

الجھتے ہیں وہ ربطِ باہمی کے ذکر سے اتنے
اسے گویا ریاضی کا کوئی مسئلہ سمجھتے ہیں

سلیم ان سے نہ کہیے گا کبھی موسم نہیں اچھا
کہ ان باتوں کو بھی وہ ہجر کا دُکھڑا سمجھتے ہیں

کسی محفل میں مدت سے غزل خواں ہم نہیں جاتے
کسے اب یاد ہیں وہ عہد و پیماں، ہم نہیں جاتے

نہ ہونے سے ہمارے کون ایسا فرق پڑتا ہے
خدا آباد رکھے بزمِ جاناں، ہم نہیں جاتے

صبا کے ہاتھ خوشبو بھیج کر عہدِ بہاراں کی
ہمیں کیوں تنگ کرتے ہیں گلستاں، ہم نہیں جاتے

حرم کا پوچھنا کیا گھر خدا کا ہے مگر اے دل
وہاں تو سب کے سب ہوں گے مسلماں، ہم نہیں جاتے

بلاوے تو بہت آئے مگر شہرِ نگاراں میں
وہی ہے امتیازِ جان و جاناں، ہم نہیں جاتے

عجب جی لگ گیا ہے ان دنوں اس دشتِ ویراں میں
سندیسے بھیجتا ہے شہرِ جاناں، ہم نہیں جاتے

ہمیں دو گز زمیں کو شہر والے منع کیا کرتے
مگر راس آگیا ہے اب بیاباں، ہم نہیں جاتے

بجا انسان کی عظمت، سفر بھی چاند کا برحق
سلیم اس کا برا کیا ماننا، میاں ہم نہیں جاتے

شعر میں ڈھلنے سے پہلے یوں قرارِ دل نہ تھیں
کاہشیں دنیا کی تیرے درد میں شامل نہ تھیں

اب جو بھٹکے ہیں تو کیا کیا راہ پر الزام ہیں
ورنہ یہ گمراہیاں کس دن سرِ منزل نہ تھیں

ابتدائے عشق میں اک بار مل کر کھو گئیں
خوب تھیں وہ راحتیں جو ہم مزاجِ دل نہ تھیں

اب جو پوچھا ہے کسی نے تو اُمڈ آئے ہیں اشک
ورنہ غم کی شدتیں احساس میں شامل نہ تھیں

تیرگی تھی اور اِک طوفانِ دریا کا خروش
دور شمعوں کی قطاریں بھی سرِ ساحل نہ تھیں

ہائے کس منزل پہ آکر راز یہ دل پر کھلا
حسن کی سرشاریاں بھی عشق سے غافل نہ تھیں

دیدنی ہے آج ان آنکھوں کی وضعِ احتیاط
جیسے ہم ایسوں سے ملنے کی کبھی قائل نہ تھیں

اُس نے پوچھا بھی سلیم اور جو کہا پورا ہوا
ہائے کیا کیا حسرتیں اظہار کے قابل نہ تھیں

کتنے دل تنگ ہوئے گوشہ تنہائی میں
چھاؤنی چھائیں گے اب کوچۂ رسوائی میں

تو جنہیں بھول گیا کوششِ دانائی میں
اب بھی انداز وہی ہیں ترے سودائی میں

جانِ خلوت ہی سمجھتے ہیں اسے اہلِ نظر
لاکھ وہ طاق ہوا انجمن آرائی میں

منہ چھپانے کا سبب کچھ نہیں کھلتا سرِ بزم
وہ نظر سے کبھی ہٹتے نہیں تنہائی میں

دل خوں گشتہ نے اب رنگ بھرے ہیں کیا کیا
ورنہ کیا رکھا تھا اے گل تری رعنائی میں

ایک وہ میری وفا ہے کہ زمانہ دیکھے
ایک وہ تیرا کرم جو نہ ہو تنہائی میں

سیرِ آئینہ بجا ہے مگر اتنا کہہ دے
کون سی بات نہیں تیرے تمنائی میں

ہے وہی خوئے وفا اور وہی آپ سلیم
حُسن تو مفت ہی بدنام ہے خودرائی میں

ملی وہ خوئے وفا جان مارنے والی
شبِ فراق بھی ہنس کر گزارنے والی

رقیبِ شکر و شکایت وہی تری فطرت
مجھے بگاڑ کے دنیا سنوارنے والی

ہلوں نہ اپنی جگہ سے ہزار وحشت ہو
بہار کون ہے مجھ کو پکارنے والی

تیری گلی میں گئی اور بار پا نہ سکی
نسیمِ صبح گلوں کو نکھارنے والی

شہیدِ ناز کو کیا کیا گماں ہیں اور وہ نگاہ
مزاج پوچھ کے چھدرا اتارنے والی

عجب سلوکِ دو رُو ہے نگاہِ ساقی کا
سرور دے کے وہ نشہ اتارنے والی

سلیم ہم بھی سفینے کے بادباں کھولیں
اٹھے جو موج کوئی دل ابھارنے والی

سلیمؔ نفع نہ کچھ تم کو نقدِ جاں سے اٹھا
کہ مال کام کا جتنا تھا سب دکاں سے اٹھا

برا لگا مرے ساقی کو ذکرِ تشنہ لبی
کہ یہ سوال مری بزم میں کہاں سے اٹھا

نگاہِ ناز بھی تھی مسکرانے والوں میں
عجیب لطف غرض غم کی داستاں سے اٹھا

تمام عمر کی محرومیوں کا حاصل تھا
وہ لطفِ خاص جو اک شب کے میہماں سے اٹھا

سلیمؔ راہِ وفا نقشِ پا کو ترسے گی
اب اعتبار اگر میرِ کارواں سے اٹھا

مری غزل میں ایک نیا سوزِ جاں بھی ہے

میری غزل میں ایک نیا سوزِ جاں بھی ہے
مانا ابھی گرانیِ لفظ و بیاں بھی ہے

کچھ دل بھی ہے نشاطِ تمنا سے شاد کام
اور کچھ تری جفا پہ کرم کا گماں بھی ہے

کیا اس ہجومِ شوق سے گھبرا نہ جائے گا
مانا وہ بدگمانِ وفا مہرباں بھی ہے

کچھ نازِ تمکنت بھی ہے پاسِ حیا کے ساتھ
پھر بارِ آرزو سے ذرا سرگراں بھی ہے

تکلیفِ التفات نہ دوں اس نگاہ کو
با وصفِ جور و ناز جو آرامِ جاں بھی ہے

مائل کرم پہ ہے مگر اللہ رے احتیاط
پیمانِ آرزو سے مرے بدگماں بھی ہے

اس یارِ دل شکن پہ ہیں دلداریاں بھی ختم
جو ہم سے سرگراں بھی ہے اور مہرباں بھی ہے

تو جس طرح سنے یہ ہے تیرا معاملہ
غم امرِ واقعہ بھی ہے اور داستاں بھی ہے

کچھ عسکری کا فیض بھی ہے شاملِ غزل
اور کچھ سلیم اپنی طبیعت رواں بھی ہے

(الف)

چاہتا کیا ہے اِلتفاتِ یار
بھول جاؤں وہ لذتِ انکار

آ گیا راہ پر بالآخر یار
لیک بعد از خرابی بسیار

حال دل پوچھنے پہ ہے اصرار
کتنے ظاہر پرست ہیں غمخوار

چڑھتے سورج کا مول کیا آنکیں
شام تک ہے یہ گرمی بازار

ترکِ الفت کے عذر ہیں لاکھوں
خوئے بد را بہانۂ بسیار

کارواں زحمتِ سفر نہ کریں
منزلیں کوچ پر ہیں خود تیار

(ب)

کتنا بدلا ہے رنگِ لیل و نہار
حُسن اور عشق کا وہی ہنجار

وہ اُدھر بامِ خود نمائی پر
یہ اِدھر کوئے اشتیاق میں خوار

پوچھتا کون ہے محبت کو
گرم اہلِ ہوس کا ہے بازار

جاں خراشی نہ سینہ کاوی ہے
ٹھپ ہے اہلِ وفا کا کاروبار

ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے ہیں
شہرِ دل کے تمام ٹھیکیدار

ہم ہیں منشی عدالتِ دل کے
روز لیتے ہیں عشق کا اظہار

درج کرتے ہیں قطرہ قطرہ اشک
اور نفس در نفس فغاں کا شمار

متن خالی ہے حُسنِ مضموں سے
جدولیں لاکھ ہوں مرصع کار

کوئی مسند طرازِ عدل نہیں
حُسن ہے سو خرد کا جانب دار

پاس تیرے نہیں زر و گوہر
اے غمِ عشق نذرِ درد گزار

حُسن کی دید کائنات کی سیر
عشق اپنے وجود کا اقرار

(ج)

ہجر میں حرصِ سیر بھی بیکار
طبقہ دوزخ کا خطہ گلزار
یہ گلِ ترکہ عقربِ رنگیں
یہ صبا ہے کہ سانپ کی پھنکار

قیدِ وحشت سے رستگاری کیا
درِ زنداں بھی صورت دیوار
آئینہ آئینے سے گرمِ نظر
سایہ سائے سے برسرِ پیکار

روزنِ در جماہی لیتا ہے
آہ بھرتا ہے رَخنہ دیوار
مہرِ رَخشاں کا دستِ نادیدہ
سر پہ کھینچے ہے آتشیں تلوار

ہم کو پوچھا ہمارے بعد سلیم
جیسے سوتے کو کوئی کرلے پیار

عشق اور ننگِ آرزو سے عار
دلِ خود دار پر خدا کی مار

اور کیا دیکھنا ہے ذوقِ نظر
حُسن اور آئینے سے ہو بیزار

شکوۂ جَور ہے نہ شوقِ کرم
یوں بھی آنا تھا اہلِ دل کو قرار

(ق)

شاد اب کیوں نہیں دلِ مغموم
حُسن کو خود جفا سے ہے انکار

لطف ایسا کہ کچھ نہیں تخصیص
جیسے سب کے لیے کھلا بازار

ایک بول، ایک دام، سودا نقد
اور نہ کچھ بھاؤ تاؤ کی تکرار

سکۂ کم عیار داغِ جگر
پوچھ اس کی نہیں کہیں زنہار

سنگ ریزوں کے دام اٹھتے ہیں
پارۂ دل ہے مفت بھی بیکار

سرد مہری ہے بیچ کی دلال
جس کا دونوں طرف سے ہے بیوپار

رہن ہے اس کے نام جو کچھ ہے
حُسن کا ناز، عشق کا پندار

غرض اس ربط سے ہوئے ہیں بہم
عشقِ بے کیف و حُسنِ کم آزار

گانٹھتے ہیں پھٹے ہوئے جذبات
ہو کے سید بنے سلیم چمار

سرد مہری ہے بیچ کی دلال
جس کا دونوں طرف سے ہے بیوپار

رہن ہے اس کے نام جو کچھ ہے
حُسن کا ناز، عشق کا پندار

غرض اس ربط سے ہوئے ہیں بہم
عشقِ بے کیف و حُسنِ کم آزار

گانٹھتے ہیں پھٹے ہوئے جذبات
ہو کے سید بنے سلیم چمار

کارِ تخلیق میں ڈالا ہے مشینوں نے خلل
رحمِ مادر کی جگہ ڈھال کے رکھ دی بوتل
شیر پستاں میں نہیں سچ ہوئی ہے بے رس
طفل گہوارے میں، بستر پہ ہے شوہر بے کل
مرد نامرد ہیں اِس دور کے، زن ہے نازن
اور دنیا کی ہر اک شے ہے اسی کا سمبل
جمع تفریق میں گو طاق ہے جُفتی کی مشین
کیجئے کیا کہ غلط آتا ہے پھر بھی ٹوٹل
زور وہ اور ہے پاتا ہے بدن جس سے نمو
لاکھ گودے کوئی ٹانگوں میں دبا کر موسل
پرورش کر نہیں سکتی کبھی غنچے کی نسیم
دو گھڑی بھی کبھی ٹکتی نہیں گھر میں شفتل
بال سُنبل کے پریشان ہوئے بن کنگھی
آنکھیں نرگس کی بھی بے نور ہوئیں بن کاجل
مادہ سرعتِ پرواز میں ہے برق مثال
اس کے برعکس خیالات کے ٹٹّو اڑیَل
زچگی فکر کے گھر میں ہو تو دایہ نہ ملے
فصد جذبات کی کھلوائیں تو نشتر کھٹّل
بال اِدراک کے بڑھ جائیں تو حَجام کا کال
کپڑے احساس کے پھٹ جائیں تو سوزن میں خلل

آ کے اب جنگل میں یہ عقدہ کھلا
بھیڑیے پڑھتے نہیں ہیں فلسفہ

ریچھنی کو شاعری سے کیا غرض
تنگ ہے تہذیب ہی کا قافیہ

کھال چکنی ہو تو دھندے ہیں ہزار
گیدڑی نے کب کوئی دوہا سنا

گورخر کی دھاریوں کو دیکھ لو
سوٹ چوپائے بھی لیتے ہیں سلا

لومڑی کی دُم گھنی کتنی بھی ہو
ستر پوشی کو نہیں کہتے حیا

شہر میں ان کے جو گزرا تھا سلیم
لکھ دیا ہے میں نے سارا ماجرا

سوانگ بھرتا ہوں ترے شہر میں سودائی کا
کہ یہی حال ہے اندر سے تماشائی کا

بزم کے حال پہ اب ہم نہیں کڑھنے والے
انتظامات میں کیا دخل تماشائی کا

ہم تو سَو جھوٹ بھی بولیں وہ اگر ہاتھ آئے
کوئی ٹھیکا تو اٹھایا نہیں سچائی کا

دلِ خوں گشتہ کسے جا کے دکھائیں یارو
شہر میں کام نہیں لالۂ صحرائی کا

لوگ کہتے ہیں ہوس کو بھی محبت، جیسے
نام پڑ جائے مجاہد کسی بلوائی کا

یہ نہیں ہے کہ نوازے نہ گئے ہوں ہم لوگ
ہم کو سرکار سے تمغہ ملا رسوائی کا

اُن کو ٹوٹا ہوا دل ہم بھی دکھائیں گے سلیم
کوئی پوچھ آئے وہ کیا لیتے ہیں بنوائی کا

نہ پوچھو عقل کی، چربی چڑھی ہے اس کی بوٹی پر
کسی شے کا اثر ہوتا نہیں کم بخت موٹی پر

کفن سے دوسروں کے جو سلاتے ہیں لباس اپنا
وہ جذبے ہنس رہے ہیں عشق سادہ کی لنگوٹی پر

یہی عیش ایک دن اہلِ ہوس کا خون چاٹے گا
ابھی کچھ دن لگا رکھیں وہ اس کتے کو روٹی پر

نہ جانے کیسے نازک تار کو مضراب نے چھیڑا
کہ وجد آخر انہیں بھی آگیا نوچا کھسوٹی پر

محبت کچھ بڑی ہے عمر میں اور ہے ہوس چھوٹی
مگر دل ہے کہ ہے سو جان سے لہلوٹ چھوٹی پر

شوق تھا ہم کو بہت قوم کی حمالی کا
عشق کو ترک کیا نام لیا حالؔی کا

دار و منصور کے قصے ہوئے ہم سے تازہ
ہم نے چمکا دیا مضمون یہ قوالی کا

دل کی حالت یہ ہوئی درسِ خودی اپنا کر
مصرعہ خشک ہو جیسے کسی اقبالؔ کا

لایئے زہر بھی پی لیں مگر اتنا کیجئے
درس کم دیجئے سقراطؔ کی نقالی کا

گُل و گلزار پہ اشعار تو لکھے ہیں سلیمؔ
اب یہ لازم ہے کہ پیشہ بھی کرو مالی کا

اب ان کے ساتھ پھرتا ہے کیسا لگا ہوا
تھا دل کو خود نمائی کا ہوکا لگا ہوا

وہ دل نہیں جو باز رہے دستبرد سے
پگڑی کی تاک میں ہے اُچکا لگا ہوا

ایوانِ دل میں غم کی سجاوٹ کہاں رہی
بس اک کھنڈر میں رہ گیا جالا لگا ہوا

دُزدانِ شب سے کوئی یہ کہہ دے پُکار کے
ظلمت کی گھات میں ہے اُجالا لگا ہوا

تنہا کوئی ملے تو کریں دل کی بات بھی
ہر آدمی کے ساتھ ہے سایہ لگا ہوا

بوسیدہ ہوچکی ہے یہ جذبات کی قبا
حُسنِ غزل کا لاکھ ہو گوٹا لگا ہوا

بولی چھٹی ہے چاند کی اہلِ زمیں کے نام
بازارِ کہکشاں میں ہے پرچہ لگا ہوا

اہلِ ہوس کی بھیڑ بھڑکے میں کٹ گئی
ہے عشق اپنے کام سے تنہا لگا ہوا

آخر سلیم عشق نے رُسوا کیا ہمیں
تھا اپنے ساتھ ساتھ یہ شُہدا لگا ہوا

نہ جانے کس کی آمد ہے کہ تارے
دو رویہ مشعلیں لے کر کھڑے ہیں

کوئی پوچھے سُنے گا کون اِن کی
جنابِ عشق کیوں ضد پر اَڑے ہیں

نہ بولی عقل کچھ باتوں پہ دل کی
کہ حضرت عمر میں اُس سے بڑے ہیں

ہوس نے بارہا پٹّی پڑھائی
اُنہی میں کون سے موتی جڑے ہیں

اِدھر بھی اک کرن اے ماہِ رخشاں
کہ سائے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں

جنہیں کل عشق بننا ہے وہ جذبے
نظر کی رشوتوں پر پل رہے ہیں

تری جانب سے دل میں وسوسے ہیں
یہ کتے رات بھر بھونکا کیے ہیں

لباس درد بھی ہم نے اتارا
یہ کپڑے اب پرانے ہو چکے ہیں

اتاریں کینچلی اب تلخ جذبات
کہ وہ اپنے میں گھٹ کر رہ گئے ہیں

نہ ہو مایوس خشک آنکھوں سے اے دل
کہ صحراؤں میں بھی دریا بہے ہیں

سلیم اچھی غزل ہے تیری مانا
مگر یہ پھول گھورے پر کھلے ہیں

ٹھپ ہوچکی ہے حُسنِ خیالات کی دکان
ایسے میں کیا چلے گی غزلیات کی دکان

اُترن پرانی فکر کی بکتی ہے شہر میں
سُونی پڑی ہے تازہ خیالات کی دکان

سودے میں حرفِ حق کے دوالہ نکل گیا
کھولیں گے ہم بھی کذب و خرافات کی دکان

ہاں اہلِ درد ساکھ بڑھانے کا وقت ہے
حکماً ہوئی ہے بند سوالات کی دکان

وہ بھیڑ اہلِ حق کی کہ اللہ تری پناہ
جیسے ہر ایک گام پہ آیات کی دکان

فہرست قیمتوں کی درِ دل پہ ٹانگئے
وہ جانچنے کو آئیں گے جذبات کی دکان

ہم چاندنی کا مول چکاتے ہی رہ گئے
دُزدِ سحر نے لوٹ بھی لی رات کی دکان

یہ سب بِکاؤ مال ہے خورشید ہو کہ ماہ
کھولی ہے کہکشاں نے بھی ذرات کی دکان

جس شے کو مَس کرو وہ بدل جائے دفعتاً
دنیا بنی ہوئی ہے طِلسمات کی دکان

شاعر ہیں آپ افسرِ عالی مقام بھی
میں آپ کو کہوں گا کمالات کی دکان

گاہک کا کال دیکھ کے دھندا بدل دیا
کھولی تھی پہلے ہم نے بھی جذبات کی دکان

پہلو میں نقدِ دل ہے تو کیا غم تمہیں سلیم
آخر کہیں تو ہوگی مدارات کی دکان

ہے ہوس کو بھی دعوئ ایثار
چور کہتا ہے میں ہوں ساہوکار

اپنی ہستی سے جو رہیں سرشار
کام ان کا نہیں حیات سدھار

عشق کا زور دل پہ چلتا ہے
مرتے کو مارتے ہیں شاہ مدار

ہاتھ اک دوسرے کی جیب میں ہے
اِس تعلق پہ دوستی کا مدار

حالتِ یاس میں گنہ کا خیال
رات کی تیرگی میں دیدۂ مار

گوشۂ مصلحت میں بیٹھا ہوں
حق کا انکار ہے نہ ہے اقرار

عشق کے حال کا پتہ تو چلے
شہرِ دل سے نکالئے اخبار

بات اب بھی وہی محبت کی
بن کے شہری رہے سلیم گنوار

کاٹ دی خار زارِ غم میں حیات
مرحبا اے جنونِ خوش اوقات
عشق صورت تو اپنی پہچانے
آئینہ لے کے آئے ہیں حالات
جان سی شے کا مول ایک نگاہ
دیکھ لی اہلِ حُسن کی اوقات
چست صدری پہن کے بیٹھے ہیں
دل کی مسند پہ عشق کے جذبات
ہم تو مرتے ہیں خوش قبائی پر
بھاڑ میں جائے عشقِ ذات و صفات
داغِ خورشید کھا کے چہرے پر
لوٹ آئی ہے دن کے بھیس میں رات

(ق)

اک نظر دیکھتے ہی بھانپ گیا
میں اسے وہ مجھے کہ ہے بدذات
اُس نے زلفوں کے دام پھیلائے
میں نے چھیڑی غمِ حیات کی بات
میں سناتا تھا اُس کو اپنے شعر
وہ دکھاتا تھا مجھ کو اپنی گات
چھیڑ تھی، کھیل تھا مگر بے رنگ
اس میں شامل نہ تھے کہیں جذبات

تو کوئی اور ہے میں اور ہوں، ایسا کیوں ہے
یہ سوال آج محبت نے اٹھایا کیوں ہے

حال جب دل کا سنائیں کہ ذرا بات چلے
وہ تو ہر بات پہ کہتا ہے کہ ایسا کیوں ہے

دل لیا، کام یہ تیرا ہے مجھے کیا مطلب
میں نہ لینے میں نہ دینے میں، مکرتا کیوں ہے

کوچۂ یار میں ہم جیسے بہت کھیت رہے
نگہِ ناز پہ احساں کوئی دھرتا کیوں ہے

میں تو ہر قرض سے بے باق ہوں، آنہ، پائی
عشق نے کھولا مرے نام کا کھاتا کیوں ہے

تیرا پڑتا نہیں کھاتا تو نہ لے جنس وفا
گھوم پھر کے اسی اک مال پہ ٹکتا کیوں ہے

ہاں اُسے قدر نہیں وہ نہیں قائل دل کا
عشق پھر جاکے اُسی کوچے میں مرتا کیوں ہے

تو نہیں اور سہی جس سے تھا پیمانِ وفا
پھر نہ جانے مری نظروں کو یہ دھوکا کیوں ہے

اتنے خوش فہم نہیں جو اسے اپنا سمجھیں
لیکن اس بات کو سوچیں تو اکھرتا کیوں ہے

عشق میں تو یہی ہوتا ہے گلہ کیا مری جاں
دل کے مٹ جانے کا افسوس بھی کرتا کیوں ہے

نالہ بلبل کا جو سنتا ہے تو کھل اٹھتا ہے گُل
لیکن اس بات پہ تجھ کو یہ اچنبھا کیوں ہے

ﷲ دل کو ایسا بھی تعلق نہیں تجھ سے لیکن
نام بھی لے کوئی تیرا تو دھڑکتا کیوں ہے

حال کہہ دو گے مرا، لاؤ گے اس کو یارو؟
اور جو وہ سُن کے بگڑ جائے کہ مرتا کیوں ہے

ہے وہی بات "در ایامِ جوانی" والی
میں نے کیا ایسا کیا، شہر میں چرچا کیوں ہے

وہ بلاتے بھی نہیں اور بٹھاتے بھی نہیں
دل سے پوچھو کہ وہیں جاکے پسرتا کیوں ہے

حُسن سے شکوہ بھی کرتے ہیں تقاضہ بھی سلیم
عشق ایسا ترا دنیا سے نرالا کیوں ہے

ہم ہیں اور راہِ کوئے بدنامی
مرحبا اے ہوائے خوش کامی

اس کا دل اپنے حق میں پارۂ سنگ
ختم ہے جس پہ نازک اندامی

ہم نے شکوہ کبھی کیا نہ کریں
شکوہ ہے اعترافِ ناکامی

(ق)

کلمۂ حق کہیں تو ہم جانیں
ورنہ کیا رستمی و بہرامی

پہلے مختون عقل کو کرلیں
زندگی پھر بنائیں اسلامی

سر منڈاتے ہیں ہم سے آ کے خیال
اپنا پیشہ ہوا ہے حجامی

یوں بھی ہونا تھا اے دلِ ناکام
ہجر اور تجھ پہ عیشِ درد حرام

(ق)

ہو رہی ہے متاعِ دل نیلام
بولی چھوٹے گی جانے کس کے نام

دل کا سودا کہاں چکانے جائے
خود نہیں زلف کی گرہ میں دام

پھر اسی سے امیدِ دلداری
پھر وہی ہم وہی جنونِ خام

روشِ گمرہی مبارک باد
پھر وہی لغزشیں وہی انعام

پھر زمانے کی ساکھ بگڑی ہے
پھر محبت ہے موردِ الزام

تجھ کو چاہا تو شاعری بھی کی
آم کے آم گٹھلیوں کے دام

عشق نے کب سے توقع پہ لگا رکھا ہے
روز کہتا ہے کہ بس کام بنا رکھا ہے

اور کیا چاہیے بے کیف ہیں کیوں حضرتِ دل
حُسنِ مطلق کو تو گھٹنے پہ بٹھا رکھا ہے

قرض مع سود وصولیں گے کسی دن تجھ سے
دل کے کھاتے پہ ترا نام چڑھا رکھا ہے

حُسن کے سینکڑوں انداز ہیں لیکن ہم کو
عشق نے ایک ہی ڈھرّے پہ لگا رکھا ہے

(ق)

منہ بسورے رہیں گو سینہ ہو غم سے خالی
وضع داری کا عجب ڈھونگ رچا رکھا ہے

منمناتی ہوئی آواز میں پڑھتے ہیں غزل
جسم فربہ ہے مگر دل کو گھلا رکھا ہے

اس سے کب بات ہوئی کس نے کیا عہدِ وفا
ہم نے بھی دل سے یہ مضمون بنا رکھا ہے

داستانِ غمِ دوراں پہ وہ کہتے ہیں سلیم
قصۂ ہجر کا عنوان نیا رکھا ہے

خال و خط پر کروں غزل خوانی
ذوق میرا نہیں ہے ایرانی

جامہ زیبوں کو شرم آتی ہے
دیکھ کر آئینے کی عریانی

اب ہماری صفائی کون کرے
دل بنا ہے گواہِ سلطانی

کفر نے میرے کچھ تو کام کیا
بڑھ گیا ان کا ذوقِ ایمانی

مختصر یہ کہ دل گیا اپنا
ورنہ یہ داستاں ہے طولانی

وہ تو آزاد کر چکے ہیں سلیم
میں ہوں اپنی وفا کا زندانی

خیر پھر دل کی آئے گی باری
چور جاتے رہے کہ اندھیاری

مہربانی کی کیا ضرورت ہے
کم نہیں آپ کی طرح داری

فیصلہ کیا ہے اے عدالتِ ناز
عشق مجرم ہے وہ بھی اقراری

رفتہ رفتہ یہاں تک آئے ہیں
چال میں آگئی ہے سرشاری

اب تو ہے حسن کے رفیقوں میں
کون کھائے گا عشق کی ماری

خواب کیا کیا وفا نے دیکھے ہیں
حُسن اور عشق کی طرف داری

اس پہ ثابت نہیں ہے کوئی ستم
سب گواہانِ دل ہیں انکاری

مدح خواں دورِ حُسن کے ہیں سلیم
شعر کہتے ہیں ہم بھی سرکاری

عشق اور اتنا مہذب چھوڑ کر دیوانہ پن
بند اوپر سے تلے تک شیروانی کے بٹن

عشق کی دیوانگی وضع جنوں کے ساتھ تھی
چاکِ دل بھی سل گیا جب سے سیا ہے پیرہن

دل کو مژدہ ہو کہ وہ بھی خیر سے جاتی رہی
آہ سے پہلے جو کچھ محسوس ہوتی تھی دُکھن

اُن کو جلوت کی ہوس محفل میں تنہا کر گئی
جو کبھی ہوتے تھے اپنی ذات سے اک انجمن

شاخِ گُل بن کر لچکتے ہیں ہوس کی بزم میں
یہ وہی ہیں جن میں تھا تلوار کا سا بانکپن

ط خوشنما لفظوں کی رشوت دے کے راضی کیجیے
روح کی توہین پر آمادہ رہتا ہے بدن

مرگِ شہرِ آرزو کا کرچکے ماتم سلیم
آؤ ان لاشوں کو اب لفظوں کا پہنائیں کفن

یہ مانا اہلِ دل اُس پر نچھاور جان کرتے ہیں
وہ کہتا ہے کہ آخر مجھ پہ کیوں احسان کرتے ہیں

بُرا ہو وسوسوں کا غم پنپنے ہی نہیں پاتا
بہت کم بخت چوہے فصل کا نقصان کرتے ہیں

وہ آئیں یا نہ آئیں محفلِ دل کی صدارت کو
بہر صورت ہم اُن کے نام کا اعلان کرتے ہیں

ٹھہر بے تابیِ دل ان سے ملنے کی بھی ٹھیرے گی
مثل ہے جلد بازی کام میں شیطان کرتے ہیں

ہماری نکتہ چینی کو بھلا خاطر میں کیا لائیں
وہ ایسے ہیں کہ آئینے کو بھی حیران کرتے ہیں

جنابِ عشق ان پر آپ کا کچھ بس نہیں چلتا
ہمارے نام جاری روز اک فرمان کرتے ہیں

وہ ہم کو جاں نثاروں میں نہیں گنتے حقارت سے
ہم ان پر جان کیا ایمان تک قربان کرتے ہیں

جب ان کی یاد سے بھی رنجِ تنہائی نہیں جاتا
بلا کر بے خودی کو درد کا مہمان کرتے ہیں

ہمارے دعویٰ ایثار پر وہ ہنس کر کہتا ہے
یہ اچھے برہمن نکلے کہ الٹا دان کرتے ہیں

محبت کا صلہ بھی مل رہے تو بات ہی کیا ہے
نظر انداز ہم فی الحال یہ امکان کرتے ہیں

یہ کیا کم ہے حرم سے کفر کا الزام تو پایا
چلو اب کفر ہی کو حاصلِ ایمان کرتے ہیں

سلیم اب کے رہا کیا حال دل کے نفع و نقصاں کا
سنا ہے اس گلی میں آپ بھی دوکان کرتے ہیں

اتنا یاروں کو نہ سوجھا کہ لگا کر لاتے
یوں نہ آتا تو کوئی بات بنا کر لاتے

جانے کیا بول اٹھے دل کا ٹھکانہ کیا ہے
ایسے وحشی کو تو پہلے سے پڑھا کر لاتے

یوں بھی سنتا ہے کہیں کوئی فسانہ غم کا
ایسے مضموں کو ذرا اور بنا کر لاتے

ہم تو اس بزم میں اے دل رہے تیری خاطر
کچھ اشارہ بھی جو پاتے تو بُلا کر لاتے

رنگِ محفل کی بڑی دُھوم سنی ہے یارو
کیا بگڑ جاتا ہمیں بھی جو دِکھا کر لاتے

آج ہی تم کو نہ آنا تھا، چلو جاؤ سلیم
ورنہ ہم آج تمھیں اس سے مِلا کر لاتے

دیکھ رسوائی نہو بات بڑھاتا کیوں ہے
دل کو سمجھائیں گے ہم بھی کہ وہ آتا کیوں ہے

مجھ سے بیزار اگر ہے تو یہ پرسش کیسی
اور مائل بہ کرم ہے تو ستاتا کیوں ہے

جب یہ ذلت ہی اٹھانا ہے ہمارا منظور
روز ایما و اشارت سے بلاتا کیوں ہے

چپ رہوں میں تو جھلک اٹھتے ہیں کیوں آنکھ میں اشک
اور کہوں حال تو ہنس ہنس کے جلاتا کیوں ہے

جب سمجھتا ہے ہر اک بات میری انہونی
پھر اشاروں میں ہر ایک بات سُجھاتا کیوں ہے

دل لیا ہو تو چلو شرمِ تقاضہ سمجھیں
جب نہیں کچھ بھی تو پھر آنکھ چُراتا کیوں ہے

میں جسے بھول گیا اس کو بھی جو یاد نہیں
آنکھوں آنکھوں میں وہی بات جتاتا کیوں ہے

ہائے وہ حُسنِ تغافل کہ نہ پوچھا اک دن
روز یہ شخص مری بزم میں آتا کیوں ہے

خانہ آباد جنوں کا مگر اس موسم میں
مجھ کو ظالم ترے کوچے سے اٹھاتا کیوں ہے

بزمِ اغیار سہی محفلِ پندار سہی
دل ہے خوددار تو اس بزم میں جاتا کیوں ہے

حُسنِ بیداد پہ جیتے ہیں محبت والے
جَور سے تُو مری جاں ہاتھ اٹھاتا کیوں ہے

ہاں وہ بیگانہ وفا سے ہے، کرم سے عاری
دل سے پُوچھو کہ اسے حال سناتا کیوں ہے

عشق کی اب تو بہت پوچھ ہے سرکاروں میں
آبرو پھر اسی کوچے میں گنواتا کیوں ہے

دل الہنا تو بہت دیتا ہے خواری کا سلیمؔ
اس سے پوچھو مجھے لے کر وہاں جاتا کیوں ہے

اب رہیں شاد یا رہیں ناشاد
کرلیا عشق ہرچہ بادا باد

حرف کیوں آئے نازِ شیریں پر
خونِ فرہاد برسرِ فرہاد

آشیاں ایک شاخ کا پابند
بجلیاں قیدِ ابر سے آزاد

جو اِدھر حال ہے وہی ہے اُدھر
ایک جیسے ہیں صید اور صیاد

(ق)

ایک ہی شاخ پر ہیں آسودہ
خار اور گل کہ ہیں بہم اضداد

کیا یہ ممکن نہیں کہ چشمِ کرم
تجھ سے ہو خانۂ وفا آباد

گُل کھلائے زمینِ کوچۂ غیر
اور مری مُشتِ خاک بھی برباد

کچھ تو ایسا ملا محبت میں
فکرِ دنیا سے ہوگئے آزاد

عاشقی بن گئی تھی رسمِ کہُن
ہم نے ڈالی مگر نئی بنیاد

ان کا رتبہ مجھے نہیں معلوم
ان کے خادم مگر ہیں ابنِ زیاد

ہم گدایانِ عشق ہیں ہم پر
بھونکتے کیا سگانِ دنیا زاد

(ق)

گوشِ گل پر گراں ہے نغمہ بھی
کیا سنے گا وہ درد کی روداد

کچھ تو ہوتی نگاہ میں تاثیر
رنگ لاتی کہیں تو کچھ فریاد

اُس کے دامن پہ داغ رہ جاتا
خونِ ناحق کی کچھ تو ملتی داد

(ق)

یوں نہ ہوگا جفا کا استحصال
یوں نہ مانے گا وہ ستم ایجاد

اب کے تیشہ چلے گا خسرو پر
جوئے خوں اب کے لائے گا فرہاد

شہر ہیں اور بھی سلیم بہت
ہے کراچی مگر عروسِ بلاد

دھرا کیا ہے زبانی پیار کے رنگیں فسانوں میں
کھرے کھوٹے کا سب احوال کھل جائے گا رانوں میں

جواں بدمست راتیں سانس بھی آہستہ لیتی ہیں
لہو سرگوشیاں کرتا ہے سرشاری کے کانوں میں

سمٹ آتی ہے روحِ بے قراری ایک نقطہ پر
وہ نقطہ مثلِ ساعت پھیلتا جاتا ہے جانوں میں

مثالِ موج پیچیدہ بہم غلطیدہ و رقصاں
دھڑکتی ساعتیں پرواز کرتی ہیں زمانوں میں

سیہ ٹھہری ہوئی بے حس فضائیں چیخ اٹھتی ہیں
کہ ساری زندگی تحلیل ہوجائے گمانوں میں

سحر ہوتے یہ گونگا تجربہ محسوس کرتا ہے
کہ رچ کر رہ گیا ہے ذائقہ خوں کا زبانوں میں

ہوس آگے کی ہو جن کو سو اپنا کام وہ جانیں
ہمیں تو لطف سارا آگیا حیلے بہانوں میں

یقیناً تلخ گوئی سے ہوئے ہیں بے مزا لیکن
سمجھ بیٹھے تھے ہم کو وہ نرے افسانہ خوانوں میں

اگر دل چاہتے ہیں پھر ہمارے پاس آئیں گے
یہ شے وہ تو نہیں ہے جس کو پاجائیں دکانوں میں

کہاں تک نت نئی تاویل سے سمجھائیں ہم دل کو
بہت کم ربط ہوتا ہے سلیم ان کے بیانوں میں

ہیں بدگماں سلیم کے حُسنِ بیاں سے ہم

غمہائے تازہ مانگتے ہیں آسماں سے ہم
رکھتے ہیں لاگ اپنے دلِ شادماں سے ہم

الجھے ہوئے نہ تھے کرم و جور اِس قدر
لائیں وہ سادگی تمنا کہاں سے ہم

اک رسمِ نالہ پر ہے مدارِ وفا ہنوز
واقف نہیں ہیں لذتِ دردِ نہاں سے ہم

ہر درد، دردِ عشق نہیں اے دلِ خراب
کتنے خجل ہیں اس کرمِ رائیگاں سے ہم

جو دل کی بات ہے وہ زباں پر نہ آسکے
تنگ آگئے ہیں شیوۂ حُسنِ بیاں سے ہم

کتنا خلوص، کتنی خلش، کتنی آگ ہے
پہچانتے ہیں عشق کو طرزِ فغاں سے ہم

کیا ارتباطِ عشق یہی ہے کہ بے سبب
کچھ سرگراں سے وہ ہیں تو کچھ بدگماں سے ہم

بھٹکے پھریں گے دشت و بیاباں سے تاحرم
لے اٹھ چلے ہیں آج ترے آستاں سے ہم

باوصفِ اضطراب یہ فقرے نپے تُلے
ہیں بدگماں سلیم کے حُسنِ بیاں سے ہم

خود کو کہتے ہیں جو ناکامِ وفا کہتے ہیں
تُو وفا کیش سہی ہم تجھے کیا کہتے ہیں

رسم و رہ کیا ہے ترے شہرِ کرم کی اے دوست
پوچھتا ہے کوئی احوال تو کیا کہتے ہیں

حُسن کو کچھ نگہِ یاس سے پالا نہ پڑا
یہ وہ ظلمت ہے جسے جلوہ رُبا کہتے ہیں

اے گلِ تازہ تجھے رنگِ چمن کیا معلوم
بادِ صرصر کو یہاں لوگ صبا کہتے ہیں

کس کو معلوم ہے جز رمز شناسانِ غزل
ابر کیا چیز ہے اور کس کو ہوا کہتے ہیں

بات ہے تیری نگہ تیرے سخن کی ورنہ
کیا مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

ہم وہ خوددارِ وفا ہیں کہ برنگِ غالبؔ
نگہِ لطف کو توہینِ وفا کہتے ہیں

کیا رنگ تیرے جور میں لطفِ نہاں کے ہیں
لیکن بھرے ہوئے مرے حُسنِ گماں کے ہیں

اے قصہ گوئے حُسن ہمیں بھی ذرا ابھار
کردار ایک ہم بھی اسی داستاں کے ہیں

ہر انقلابِ تازہ تری بزم سے اٹھا
نام اس کا ہوگیا یہ نصیب آسماں کے ہیں

گم ہے تمام بزم کہ سحر و فسوں تمام
تیرے سکوت میں مرے حُسنِ بیاں کے ہیں

اک حسنِ تازہ کار سے ہے واسطہ سلیم
ورنہ وفا شعار ہم ایسے کہاں کے ہیں

مائل پرسشِ غم چشمِ کرم ہو کہ نہ ہو
اور کبھی ہو تو خدا جانے یہ غم ہو کہ نہ ہو

آج جی بھر کے رُلا اے غمِ ہجراں مجھ کو
جانے پھر لمحۂ فرصت یہ بہم ہو کہ نہ ہو

ہم سے چھوٹی ہے نہ چھوٹے گی یہ رسمِ فریاد
تجھ سے پابندیِ آئینِ ستم ہو کہ نہ ہو

اے تصور اسی اک لمحہ کو دے شانِ ابد
کیا خبر پھر کوئی مائل بہ کرم ہو کہ نہ ہو

از فغاں تا بہ غزل فیض ہے اس کا جاری
وہ مرے دل کی خلش جو ترا غم ہو کہ نہ ہو

دیکھنا یہ ہے کہ تاثیر کہاں تک پہنچی
دل پہ جو کچھ بھی گزرتی ہے رقم ہو کہ نہ ہو

دیر سے چل کے ہر اک گام پہ تھی فکر سلیم
ہم سے کیا جانئے تکریمِ حرم ہو کہ نہ ہو

ایک تو بزمِ خاص ہو اور وہ پھر بلائیں بھی
بات کبھی جو یوں بنے پھر تو سلیم جائیں بھی

میرے سوالِ شوق کی گونج کہاں کہاں گئی
چونک پڑی نگاہِ ناز جاگ اٹھیں فضائیں بھی

آگ تھی کچھ دبی دبی درد تھا کچھ تھما تھما
یاد مگر وہ آگئے چلنے لگیں ہوائیں بھی

آنے کا احتمال ہے یونہی سا کچھ خیال ہے
دل کا عجیب حال ہے اور جو کہیں وہ آئیں بھی

کوئی مقام بھی تو ہو دَیر سہی حرم سہی
اٹھ کے دیارِ ناز سے عمر کہیں گنوائیں بھی

لطف و کرم کی بات کیا آنکھ بھر آئی ہے سلیم
یاد کبھی جو آگئیں بھولی ہوئی جفائیں بھی

مری محرومیوں کا ہے ترے دل پر اثر پھر بھی
یہ مانا تجھ کو کچھ مطلب نہیں مجھ سے مگر پھر بھی

زمانہ ہو گیا راہِ وفا چھوڑے ہوئے لیکن
کھٹکتا ہے ان آنکھوں میں غبارِ رہگزر پھر بھی

وفا ہونے کی خوش فہمی تو کب تھی اہلِ فرقت کو
بہت یاد آیا تیرا وعدۂ نامعتبر پھر بھی

غنیمت ہے جو تیری آرزو میں دن گزر جائیں
مری قسمت میں ہے ہر چند محرومی مگر پھر بھی

انہیں لمحوں میں دنیا کو بدل دینا بھی ممکن ہے
یہ لمحاتِ جنوں ہوتے ہیں یوں تو مختصر پھر بھی

زمانہ ہو گیا ترکِ رہ و رسمِ محبت کو
مگر دھوکا سا دیتا ہے وہ اندازِ نظر پھر بھی

سلیم اس کی نگاہِ ناز کی باتیں بھی کرتا چل
یہ مانا داستانِ غم ہے تیری مختصر پھر بھی

شوخ بھی ہے وہ جفا پرور خود آرا بھی بہت
اوّل اوّل اس پہ ریجھا دل ہمارا بھی بہت

یاس ہے آنے سے اس کے پھر بھی اے وعدہ کی یاد
دل کو اس عالم میں ہے تیرا سہارا بھی بہت

آزمایا ان کو پیہم تو نے وہ بھی جور سے
جن کو تھا تیرے کرم کا اک اشارہ بھی بہت

ان کے ترکِ عشق پر دل میں ترے شک بھی نہیں
ورنہ اہلِ غم کو تھا اتنا سہارا بھی بہت

کیجیے کیا دل کو بے مہری کے باوصف اے سلیم
وہ وفا ناآشنا لگتا ہے پیارا بھی بہت

بے رُخی حد سے بڑھی اور صرف اتنا ہی نہیں
اب تو یہ عالم ہے گویا ربط کچھ تھا ہی نہیں

پوچھتی ہے وہ نظر کیا ہے محبت کا مآل
بے خودیٔ عشق کہتی ہے کہ سوچا ہی نہیں

حالِ دل ناگفتنی ہے ہم جو کہتے بھی تو کیا
پھر بھی غم یہ ہے کہ اس نے ہم سے پوچھا ہی نہیں

بزم یاراں میں ہیں کیا کیا تذکرے چپ ہیں تو ہم
جیسے وہ حُسنِ دل آرا ہم نے دیکھا ہی نہیں

شکوۂ بیگانگی جن کو ہے ان سے کیا کہیں
التفاتِ دوست کا مارا پنپتا ہی نہیں

حُسن کی ہر کج ادائی بے رخی، بے گانگی
سعیٔ ضبطِ آرزو تھی کوئی سمجھا ہی نہیں

کیا شکایت کیجئے اس بدگمانِ شوق سے
وہ ہمیں اپنے وفاداروں میں گنتا ہی نہیں

سارے شکوے سب گلے اپنی جگہ لیکن سلیم
کس طرح کہہ دوں کہ اس کو میری پروا ہی نہیں

سوچ میں گم بیکراں پہنائیاں
عشق ہے اور ہجر کی تنہائیاں

رات کہتی ہے کہ کٹنے کی نہیں
درد کہتا ہے کرم فرمائیاں

بین کرتی ہے دریچوں میں ہوا
رقص کرتی ہیں سیہ پرچھائیاں

خامشی جیسے کوئی آہِ طویل
سسکیاں لیتی ہوئی تنہائیاں

کون تو ہے؟ کون میں؟ کیسی وفا؟
حاصلِ ہستی ہیں کچھ رسوائیاں

یاد سے تیری سکوں یوں آگیا
صبح دم جیسے چلیں پُروائیاں

چھوٹ کر مجھ سے یہ رنگا رنگ بزم آرائیاں
تجھ کو بھی محسوس کیا ہونے لگیں تنہائیاں

حُسن نے خوئے تغافل سے توجہ ہی نہ کی
دید کے قابل تھیں ورنہ عشق کی رعنائیاں

صبح وعدہ شام ہونے آئی وہ آئے نہیں
دھوپ دیواروں پہ پہنچی بڑھ چلیں پرچھائیاں

ہر ادا میں اک تلون ہر نفس اک بے کلی
کیا توجہ کیا تغافل کیا کرم فرمائیاں

فصلِ گل یوں آئی، یوں رخصت ہوئی جیسے سلیم
ایک حیلہ تھا کہ ہوجائیں مری رسوائیاں

نکل نہ آئے کہیں رخ تری شکایت کا
اگر کہوں کہ زمانہ نہیں محبت کا

غرورِ کم ہنراں دیکھ کر یہ راز کھلا
غرورِ سایۂ معکوس ہے ندامت کا

جفائے دہر کی تلخی بھی کچھ بیاں میں رہے
اسی میں رنگ ابھرتا چلے محبت کا

وہ لفظ آئے جو نشتر ہو اور مرہم بھی
معاملہ یہ نہیں ہے زباں پہ قدرت کا

سبھی پہ وار چلے گو کسی پہ وار نہو
کہ امتحاں یہی ہے خلوصِ ہمت کا

سمجھ سکو تو یہی ناز بھی ہے، عجز بھی ہے
ملا نہ دہر میں کوئی مری طبیعت کا

نہ کی پرسش اگر اس نے گلہ کیا
وہ خود ہی جانتا ہے پوچھتا کیا
سہارا دے کوئی تو ڈوبتے کو
کوئی تو ہو خدا کیا ناخدا کیا
جسے ہم بھول بیٹھے تھے کبھی کے
وہی درد آج پھر دل میں اٹھا کیا
خبر ہے شہر بھر میں مرگِ دل کی
یہ قصہ آپ نے بھی کچھ سنا کیا
معمہ ہے کہ کھلتا ہی نہیں ہے
نگاہِ ناز نے ایسا کیا کیا
قیامت ہے کہ خود کو بھول بیٹھا
ہمیں تو خیر وہ پہچانتا کیا
اشارہ کیجئے ہم جان دیں گے
ذرا سی بات کا ہے سوچنا کیا
اسی کے ہیں ہوئے ہیں جب سے اپنے
وفا کی ابتدا کیا انتہا کیا
کبھی اتنی بھی بیگانہ نہیں تھیں
اُن آنکھوں کو سلیم آخر ہوا کیا

دکھائے سادگی شوق نے سماں کیا کیا
رہے ہیں عشق میں رنجور و شاداں کیا کیا

صبا کی چاپ پہ ہوتے رہے گماں کیا کیا
نفس نفس پہ بڑھا اضطرابِ جاں کیا کیا

کسی کی سادہ قبائی کا دھیان آیا ہے
نگاہِ شوق میں جھلکے ہیں گلستاں کیا کیا

سرشک خوں، نگہِ یاس، نالۂ سوزاں
ملے ہیں اہلِ محبت کو ترجماں کیا کیا

بہت ہے فکرِ مدلل، پہ روبرو اس کے
کلام آتے ہیں بے ربط درمیاں کیا کیا

ملی نہ تھاہ سمندر کھنگالتے ہی رہے
مزاجِ حُسن کے ہیں یوں تو رازداں کیا کیا

اگر کہوں بھی کسی سے تو کون سمجھے گا
نگاہِ لطف میں نشتر بھی تھے نہاں کیا کیا

غرورِ تشنہ لبی نے سراب ہی سمجھا
نظر کے سامنے دریا رہے رواں کیا کیا

مجھے گماں بھی نہ تھا بات تھی زمانے کی
کلام آگئے بے لطف درمیاں کیا کیا

گداز شمع کو سمجھے کوئی نہیں اتنا
ملے ہیں گرمی محفل کے مدح خواں کیا کیا

سلیمؔ کچھ بھی نہ تھی موج و تازیانہ و برق
نگاہِ ناز پہ ہوتے رہے گماں کیا کیا

سلیم دل کو میسر سکوں ذرا نہ ہوا
اگرچہ ترکِ محبت کو اک زمانہ ہوا

وہ بے خودی تھی محبت کی بے رُخی تو نہ تھی
پہ اُس کو ترکِ تعلق کا اک بہانہ ہوا

اُسی سے داد کا طالب ہوں روبرو جس کے
بیانِ دردِ محبت بھی اک فسانہ ہوا

وہ چوبِ خشک ہوں محرومِ آتشِ سوزاں
کہ بن جلائے جسے قافلہ روانہ ہوا

نشاطِ درد میں فرصت کہاں کہ غور کریں
سلیم کیا ہوا الفت میں اور کیا نہ ہوا

مرے دل کی کیفیت بھی نہ سمجھ میں میری آئی
اسے پا کے بھی ہے گویا وہی عالمِ جدائی

مجھے کچھ بتا کہ کیا ہیں تری الجھنیں کہ مجھ سے
کبھی اس قدر محبت کبھی اتنی کج ادائی

کبھی تیری شخصیت کا مجھے یوں بھی دھیان آیا
کہ ستم کی یاد آئی نہ کرم کی یاد آئی

مرے حالِ غم کو سن کر جو سلیم اتنا چپ ہو
چلو اب ہمیں بتا دو تمہیں کس کی یاد آئی

امیدیں ہیں بہت دردِ جگر سے
یہ بدلی دیکھئے برسے نہ برسے

نہ جا کارِ جنوں کی وسعتوں پر
لیے جا کام عمرِ مختصر سے

خوشا یہ کاوشِ ضبطِ تمنا
نظر ملنے نہیں دیتے نظر سے

مری طبعِ تلون کیش کو ہے
سکوں اک وعدۂ نامعتبر سے

سلیم اس در سے پھر جیتے نہ پلٹے
نہ جانے کس گھڑی نکلے تھے گھر سے

ابھی ہے حاملِ صد اضطراب میرا جنوں
کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں تری نگہ کا سکوں

جمالِ یار کا احساس کہہ گیا مجھ سے
سکون و صبر کی قدریں بھی کر شریکِ جنوں

جو خود وہ دیں تو جہنم بھی ہے قبول مجھے
ملے جو مانگ کے فردوس بھی تو ٹھکرا دوں

جو ہو سکے تو مجھے مضطرب ہی رہنے دے
کہ اضطراب سے بڑھتا ہے میرے دل کا سکوں

سلیمؔ دیکھ کے احوال تیرا ڈرتا ہوں
خراب کر کے نہ رکھ دے ترا یہ زورِ جنوں

حسرتِ پس ماندگاں کی یاد میں یوں کھو گئے
اہلِ منزل کارِ منزل سے بھی غافل ہو گئے

بزمِ فطرت میں بھی کوئی غم گسارِ دل نہیں
داستانِ غم کے چھڑتے ہی ستارے سو گئے

کیسا اِس نفرت کے سناٹے میں گھبراتا ہے دل
اے محبت کیا ترے ہنگامہ آرا سو گئے

قافلے لٹتے بھی ہیں، مٹتے بھی ہیں، بڑھتے بھی ہیں
حسرت ان پر ہے جو منزل پر پہنچ کر کھو گئے

سوز و سازِ عشق کو سمجھے کوئی اتنا نہیں
یوں تو حالِ عشق پر کچھ ہنس گئے، کچھ رو گئے

ہم نے سمجھا تھا بہل جائیں گے باتوں میں سلیم
وہ تو اس کے ذکر سے کچھ اور چُپ چُپ ہو گئے

بن گئے خواب اس کے جور و کرم
اب نہ وہ شادمانیاں ہیں نہ غم

آئے جا آج اہلِ درد کو یاد
جانے پھر کب ملے یہ فرصتِ غم

دل کو کیا کیا گمان ہوتے ہیں
اُس کے انداز ہیں بہت مبہم

ہائے نیرنگِ آرزو کہ مجھے
لطف ہی راس آسکا نہ ستم

کیا قریب آگئی مری منزل
آج کیوں ڈگمگا رہے ہیں قدم

پھر سلیم اُس کے در پہ جا پہونچے
گو نہ جانے کی کھاچکے تھے قسم

ستم کی یاد سے بھی جس کے دل تڑپ جائے
نہ جانے کیا ہو جو اُس کے کرم کی یاد آئے

بہت دنوں میں جو دیکھیں نوازشیں تیری
نہ جانے کیوں مری آنکھوں میں اشک بھر آئے

تری نگاہ سے کیا ان کا کچھ تعلق ہے
کہ مجھ کو بھولے ہوئے غم پھر آج یاد آئے

ہزار بار نگاہوں نے تیری مجھ سے کہی
وہ بات جو مرے ہونٹوں پہ آئے، رک جائے

جنونِ بادیہ پیما کو سازگار نہیں
وہ عقل جو اسے ہر ہر قدم پہ سمجھائے

تری نگاہ کی بدمستیاں ارے توبہ
کہ چھپ کے جام میں موجِ شراب تھرائے

کسے خبر ہے کہ طوفاں بدوش ہوتا ہے
وہ ایک قطرہ جو پلکوں پہ آ کے رک جائے

سلیم یہ بھی کوئی رُخ وفا کا ہے شاید
جبھی تو اُس کی محبت پہ آپ پچھتائے

دل خراب نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
نگاہِ ناز پہ الزام آئے ہیں کیا کیا

خلوصِ عشق کے باوصف تیری غفلت پر
خیال اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا

کسی کو شک ہے کسی کو گماں کسی کو یقین
تری نظر نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا

نگاہِ ناز بھی ہے کب سے گوش بر آواز
سکوتِ غم نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا

سلیم تیری غزل میں وہ سوزِ عشق نہیں
اگرچہ عشق کے پہلو دکھائے ہیں کیا کیا

وضع اپنی چھوڑ کر یوں مہرباں ہونا نہ تھا
تجھ کو اس درجہ بھی ہم سے سرگراں ہونا نہ تھا

تیرے غم سے اب کہاں وہ رونقِ بزمِ جنوں
جور میں تجھ کو حریفِ آسماں ہونا نہ تھا

عذر کیوں کیجئے کہ تھی دشوار وضعِ احتیاط
شکوہ کیا کیجئے کہ اتنا سرگراں ہونا نہ تھا

ایک بھی دھوکا نہ کھا پائے بنامِ آرزو
یوں بھی عمرِ رائیگاں کو رائیگاں ہونا نہ تھا

مثلِ گردِ راہ سمجھے چل کے آخر رہ گئے
اپنی قسمت میں شریکِ کارواں ہونا نہ تھا

مدتوں بعد یادِ زلف آئی
دُور کے اُن سے سلسلے نکلے

ترکِ الفت کے بعد بھی اُن سے
وہی دل کے معاملے نکلے

جن پہ دھوکا تھا قُربِ منزل کا
دور کوسوں وہ قافلے نکلے

سخت جانی ہماری کام آئی
کچھ تو قاتل کے حوصلے نکلے

یادِ منزل بھی ہوگئی دشوار
ہر قدم پر وہ مرحلے نکلے

دیدنی ہے اب اس کی ویرانی
آپ دل سے مرے بھلے نکلے

دیدنی ہے ہماری زیبائی
ہم کہ ہیں حُسن کے تمنائی

بس یہ ہے انتہا تعلق کی
ذکر پر اُن کے آنکھ بھر آئی

تو نہ کر اپنی محفلوں کو اُداس
راس ہے ہم کو رنجِ تنہائی

ہم تو کہہ دیں سلیم حال ترا
کب وہاں ہے کسی کی شنوائی

اور تو کیا دیا بہاروں نے
بس یہی چار دن کی رسوائی

ہم کو کیا کام رنگِ محفل سے
ہم تو ہیں دُور کے تماشائی

وہ جنوں کو بڑھائے جائیں گے
اُن کی شہرت ہے میری رسوائی

معتقد ہیں ہماری وحشت کے
شہر میں جس قدر ہیں سودائی

عشق صاحب نے دل پہ دستک دی
آیئے مرشدی و مولائی

یہ زمانے کا جبر ہے کہ سلیم
ہو کے میرتیؔ بنے ہیں سودائیؔ

سلیم دشتِ تمنا میں کون ہے کس کا
یہاں تو عشق بھی تنہا ہے حُسن بھی تنہا

بنے وہ بات کہ اہلِ وفا کے دن پھر جائیں
مزاجِ یار کی صورت بدل چلے دنیا

اُڑا کے لے ہی گئیں بُوئے پیرہن! تیرا
سبک خرام ہواؤں پہ کوئی بس نہ چلا

مزاجِ عشق ہو مانوسِ زندگی اتنا
کہ مثلِ خلوتِ محبوب ہو بھری دنیا

مثالِ صبح مری خلوتوں میں کون آیا
وہ روشنی ہے کہ پلکیں جھپک رہی ہے فضا

ہمیں پہ جب نہ توجہ ہوئی تو ہم کو کیا
بلا سے آپ کسی کے لیے ہوں قہر و بلا

وہ تو ہے، یاد ہے تیری کہ میری حسرت ہے
یہ کون ہے مرے سینے میں سسکیاں لیتا

کڑھے تو اپنی جگہ، خوش رہے تو اپنی جگہ
سلیم ہم نے کسی سے کچھ کہا نہ سنا

ترک ان سے رسم و راہِ ملاقات ہوگئی
یوں مل گئے کہیں تو کوئی بات ہوگئی

دل تھا اُداس عالمِ غربت کی شام تھی
کیا وقت تھا کہ تجھ سے ملاقات ہوگئی

رسم جہاں نہ چھوٹ سکی ترکِ عشق سے
جب مل گئے تو پرسش حالات ہوگئی

خو بو رہی سہی تھی جو تجھ میں خلوص کی
اب وہ بھی نذرِ رسمِ عنایات ہوگئی

وہ دشتِ ہول خیز وہ منزل کی دھن وہ شوق
یہ بھی خبر نہیں کہ کہاں رات ہوگئی

کیوں اضطراب دل پہ تجھے آگیا یقیں
اے بدگمان شوق یہ کیا بات ہوگئی

دلچسپ ہے سلیمؔ حکایت تری مگر
اب سو بھی جا کہ یار بہت رات ہوگئی

خدا کرے کہ رہے اہلِ درد سے آباد
جہاں فغاں بھی ہے نغمہ وہ محفلِ فریاد

وہی ہجومِ تمنا وہی دلِ برباد
مسافروں سے کہیں دشت بھی ہوئے آباد

غمِ جہاں سے رہے وقف نالہ و فریاد
سلیم دے نہ سکے ہم وفائے حُسن کی داد

چمن میں کون سی راحت تھی اے دلِ ناشاد
نجانے کیوں تجھے رہتا ہے شکوۂ صیاد

بشرطِ ضبط غزل کوئی ہو ہی جائے گی
سلیم آج طبیعت ہے مائلِ فریاد

کیا جھوٹ کیا سچ اللہ جانے
تیری نگہ کے لاکھوں فسانے
دیوانہ مانے تو کس کی مانے
جتنی زبانیں اتنے فسانے

انداز اُس کا احوال میرا
کچھ میں نہ سمجھوں کچھ وہ نہ جانے
میری وفا کا وہ معترف ہے
اپنی جفا کو مانے نہ مانے

چاہو تو آؤ چاہو نہ آؤ
دونوں کے آساں حیلے بہانے
اللہ اتنی خود اعتمادی
دل اب چلا ہے ان کو بھلانے

گم کردہ منزل کیا سوچتا ہے
چھوڑ آیا پیچھے کتنے ٹھکانے
آخر سلیم ان باتوں کا حاصل
کس کو چلا ہے تو آزمانے

تری نگاہ کا مفہوم کوئی کیا جانے
تراشتی ہے تمنا ہزار افسانے
ازل سے گوش بر آوازِ پا ہیں ویرانے
جنوں کی کونسی منزل میں اب ہیں دیوانے
ترے سلوک کو سمجھا نہیں ہے دنیا نے
ابھی تو عام ہیں جور و کرم کے افسانے
گزر چکے ہیں مقامِ جنوں سے دیوانے
تری نگاہ اب اٹھی ہے کس کو سمجھانے
وہ جن کو راس نہ آئی تھی تیری قربت بھی
ہیں تجھ سے چھوٹ کے کس حال میں خدا جانے
یہاں نہ ڈھونڈا نہیں اب کہ کوئے جاناں سے
چلے گئے ہیں تلاشِ سکوں میں دیوانے
جو اہلِ دل پہ ہیں الزام سب بجا لیکن
تری نظر سے بھی منسوب کچھ ہیں افسانے
سلیم تو ہی سمجھ لے مزاجِ دنیا کو
ترا مزاج تو سمجھا نہیں ہے دنیا نے

بندگی بے اثر نہ ہوجائے
کعبہ بھی تیرا گھر نہ ہوجائے

اے شبِ غم کہیں ترے ہاتھوں
زندگی کی سحر نہ ہوجائے

حالِ دل کہہ نہ دیں کہیں نظریں
ضبط بھی بے اثر نہ ہوجائے

اے تغافل شعار دیکھ کہیں
مجھ کو میری خبر نہ ہوجائے

اتنا غم اور اس پہ ایسا ضبط
مجھ کو میری نظر نہ ہوجائے

ذوقِ سجدہ سے اپنے ڈرتا ہوں
سر کہیں وقفِ در نہ ہوجائے

تیری مسرور زندگی پہ کہیں
میرے غم کا اثر نہ ہوجائے

جھوم کر اٹھی گھٹائیں دورِ پیمانہ چلا
خیر مقدم کو ہمارے سارا میخانہ چلا

کل اسی محفل میں ہم تشنہ لبوں کی دھوم تھی
ظرف اپنا دیکھنے کو آج پیمانہ چلا

جاگتے تاروں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئیں
آخر شب تک تری آنکھوں کا افسانہ چلا

خوش گمانی کا بھلا ہو ہم اسی کے ہو رہے
وہ جو اپنا بن کے آیا اور بے گانہ چلا

کون پُرساں تھا ہمارا بزمِ ساقی میں مگر
وہ نظر اٹھی تو میخانے کا میخانہ چلا

مصلحت اندیشیوں کی آنکھ سے بچ کر سلیم
پھر اُسی محفل کی جانب شوق دُزدانہ چلا

جس کو ٹھکرا کے چلا تھا وہ مسرت مل جائے
کیا یہ ممکن ہے کہ پھر مجھ کو محبت مل جائے

نازِ خونی کفنی جاں کا عوض ہے لیکن
اس کی بخشش ہے اگر عجزِ ندامت مل جائے

ہوسِ جاہ کی راہوں میں بھٹکنا کب تک
اب تو کوچہ میں ترے کنجِ قناعت مل جائے

دیکھ ایسا نہ ہو اے دل کہ وفا نبھ نہ سکے
اور اس کو کوئی پہلوئے شکایت مل جائے

تنگئ جیب و گریباں سے ہوا ہوں دل تنگ
پھر وہی چاک گریباں وہی وحشت مل جائے

حُسنِ بیاں وہ دے کہ صداقت کہیں جسے

اِس عرصۂ طلب میں قناعت کہیں جسے
وہ کام ڈھونڈتا ہوں کہ فرصت کہیں جسے

اے کاش ربطِ جور میں پیدا نہ ہو کبھی
وہ رنگِ بے رخی کہ عنایت کہیں جسے

جاری ہے رزم گاہِ دل و جاں میں مستقل
پیکارِ آرزو کہ محبت کہیں جسے

صد شکر اس کے جور سے قائم ہے آج تک
وہ ایک ربطِ خاص، شکایت کہیں جسے

تا عمر تلخ کام رہے اور نہ پاسکے
وہ غم کہ زندگی کی حلاوت کہیں جسے

تنگ آگیا ہوں جھوٹے نگینوں کے کام سے
حُسنِ بیان وہ دے کہ صداقت کہیں جسے

یہ بزمِ کہکشاں یہ انجم و مہتاب اپنے ہیں
حقیقت ہو نہ ہو پر آنکھ اپنی خواب اپنے ہیں

خدا رکھے یہ میری چشمِ تر جب تک سلامت ہے
امیرِ شہر کی کیا فکر ہے سیلاب اپنے ہیں

یہ کہہ کر میری تنہائی مری ہمت بڑھاتی ہے
جہاں میں جس قدر بھی لوگ ہیں بیتاب، اپنے ہیں

دلِ زندہ کی جتنی داستانیں ہیں، ہماری ہیں
کتابِ عشق میں شامل ہیں جتنے باب، اپنے ہیں

مری آنکھوں نے رونے کو مجھے رکھا کراچی میں
نہ ہو پنجاب تو کیا غم مرے دو آب اپنے ہیں

جا کے پھر لوٹ جو آئے وہ زمانہ کیسا
تیری آنکھوں نے یہ چھیڑا ہے فسانہ کیسا

آنکھ سرشارِ تمنا ہے تُو وعدہ کرلے
چال کہتی ہے کہ اب لوٹ کے آنا کیسا

مجھ سے کہتا ہے کہ سائے کی طرح ساتھ ہیں ہم
یوں نہ ملنے کا نکالا ہے بہانہ کیسا

اس کا شکوہ تو نہیں ہے نہ ملے تم ہم سے
رنج اس کا ہے کہ تم نے ہمیں جانا کیسا

خود بھی سوچا تھا بہت اس نے بھی پوچھا تھا بہت
حال جب خود ہی نہ سمجھے تو سنانا کیسا

تجھ کو پانے کی ہوس تھی سُو کسے تھا معلوم
اپنے ہی آپ کو کھو بیٹھیں گے، پانا کیسا

تیرے پیراہنِ رنگیں کی پھبن ہو جیسے
رنگِ دنیا مری آنکھوں میں سمایا کیسا

سائے کو سائے میں گم ہوتے تو دیکھا ہوگا
یہ بھی دیکھو کہ تمہیں ہم نے بھلایا کیسا

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہے کیسا اندھیر
سوچتا میں ہوں کہ زلفوں کا ہے سایہ کیسا

تو نے گلزار کھلائے چمن آباد کیے
یہ تو سب کچھ ہے مگر عشق ہے تنہا کیسا

اپنی رفتار پہ آجائیں تو کیا موجِ ہوا
اور تھم جائیں تو ٹھہرا ہوا دریا کیسا

نقشِ لرزاں میں کوئی شکل ہے جانی بوجھی
شمع کی لو کا ہے دیوار پہ سایہ کیسا
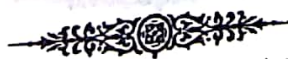
بجا یہ رونقِ محفلِ مگر کہاں ہیں وہ لوگ
یہاں جو اہلِ محبت کے جانشیں ہوں گے

کہاں سے آج مری روح میں چمک اٹھے
وہ تیرے دکھ جو تجھے یاد بھی نہیں ہوں گے

زمانہ گرمِ سفر ہے کہیں تو پائے گا
وہ دل جو مہر و محبت کی سرزمین ہوں گے

میں کر رہا ہوں تری چشم نم سے اندازہ
کہ آنے والے زمانے بہت حسیں ہوں گے

سلیم گھر سے نکل کر نہ جاؤ صحرا میں
ہوا کے راگ بہت درد آفریں ہوں گے

دل تھا کہ لاکھ رنگ سے محوِ جمال تھا
یہ ان دنوں کی بات ہے جب بے خیال تھا

چپ چاپ دُکھ سے پُورنگہ کے تپاک میں
تُو جس کو پوچھتا ہے وہ میرا سوال تھا

وہ دن نہو کہ مجھ سے وفا ترک تُو کرے
اور میں کہوں کہ مجھ کو یہی احتمال تھا

تیرے کرم سے دُور یہ حالت نہ تھی سدا
وہ دن بھی تھے کہ دکھ مرے دل پر وبال تھا

کیوں ضبط اس قدر کہ لبوں پر وبال ہو
بوسے میں کیا دھرا ہے، وہ عجزِ سوال تھا

اس بیکراں سکوں میں جو رشکِ جنوں بنا
اک اضطراب تھا کہ بہ حدِ کمال تھا

اس نے کہا سلیم ابھی پیار مت جتاؤ
مہکیں گے خود ہی پھول انہیں عطر مت لگاؤ

ہر لمحہ اک بہار نئی ہے نیا ہے پیار
بوسے تمام پچھلی بہاروں کے بھول جاؤ

موجِ گریز پا بھی ہے ساحل سے باوفا
پر مجھ سے کوئی عہد نہ لو، خود قسم نہ کھاؤ

یہ مت کہو کہ حُسن ترا لازوال ہے
ہے چودھویں کے چاند پہ اک رات کا بناؤ

میں، 'تم' یہ رات، ہائے کوئی جاوداں نہیں
جلدی سلیم پیار کرو، لفظ مت گنواؤ

آج گو گردشِ دوراں سے ہیں مانندِ غبار
اک نئے عہدِ محبت کی بنا ہیں ہم تم

عشق کے پیرہنِ جاں میں مہک ہے اپنی
گو پریشاں ہیں مگر بوئے وفا ہیں ہم تم

نفس تازہ زمانے کو ملے گا ہم سے
جس سے تازہ ہوں دل وجاں وہ ہوائیں ہم تم

چونک اٹھا ہے زمانہ کہ سنا ہو جیسے
کسی بھولے ہوئے نغمے کی صدا ہیں ہم تم

لوگ گو کفر کہیں اپنا تو ایمان ہے یہ
ایک ہوجائیں اگر مل کے خدا ہیں ہم تم

گلشن میں کہاں بہار آئی
چھوڑی ہے صبا نے یہ ہوائی

ہر برگ زبانِ التجا ہے
ہر پھول ہے کاسۂ گدائی

دامن بھی کہیں صبا نہ چھولے
اللہ رے کلی کی پارسائی

شبنم کا ہے آئینہ شکستہ
ہوتی نہیں گل کی رونمائی

سوسن نے زبان تک نہ کھولی
لٹتی رہی باغ کی کمائی

کچھ کم نہیں جرمِ چشم پوشی
نرگس نے نگاہ کیوں چرائی

سبزہ کو ملے چمن نکالا
کیوں گھر میں ہو غیر کی سمائی

بیگانوں کی طرح کچھ نہ بولا
سب بھول کے رسمِ آشنائی

سُن گُن بھی صبا نے لی نہ ہرگز
بنتی تھی بہار کی کھلائی

پہرے پہ کھڑے ہوئے تھے شمشاد
اوپر کی بلا کہاں سے آئی

کہکشاں اک ہجومِ شعلہ و شاں
چاند شہزادۂ سمن اندام
مشتری کو ملا ہے خلعتِ زر
زہرہ کہتی ہے، "اور مرا انعام؟"
حکم مریخ کو یہ پہونچا ہے
ہاتھ سے رکھ دے تیغِ خوں آشام
ہے عطارد حساب پر مامور
لکھتا جاتا ہے جمع و خرچ تمام
قطب کو حکم ہے ٹلے نہ کہیں
خواہ کتنا بھی ہو ضروری کام
دیدنی تھا شفق کی تزئیں سے
رات سے پہلے اہتمامِ شام
ڈوبتے آفتاب کو حسرت
"میں نہ جاؤں، یہیں رہوں اس شام!"
جاتے جاتے شفق بھی پوچھ گئی
"محفل خاص ہے کہ مجمع عام؟"

تجھے یقین نہیں ہے مگر سن اے مری جاں
تری نظر سے ہے وابستہ میرے دل کا قرار

تجھے یقین نہیں ہے پہ اے سکونِ حیات
رہا ہوں تیرے لیے میں ازل سے سینہ فگار

تجھے یقین نہیں ہے پہ ایک عمر کے بعد
کھلا یہ راز کہ تجھ بن جیا ہوں میں بے کار

کھلا یہ راز کہ چاہا تجھی کو تھا میں نے
اگرچہ تجھ سے کیا میں نے بارہا انکار

سُو چند روز شرف دے کے ہمکلامی کا
بنادیا دلِ سوزاں کو خطہِ گلزار

سو چند روز جو ہمراہیوں میں گزرے ہیں
تمام عمر کروں گا انہی دنوں کا شمار

خدا کرے تری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
خدا کرے چمنِ لب رہے یونہی گلبار

وہ آنکھ جو کبھی اٹھتی نہیں ہے میری طرف
رہوں گا اس کے تصور سے عمر بھر سرشار

وہ لب جنہیں میں تصور میں چھو نہیں سکتا
رہوں گا ان کے تصور سے عمر بھر میخوار

تمام عمر ترے خواب ہی میں گزرے گی
تمام عمر رہوں گا ترے لیے بیدار

تمام عمر دہکتی رہے گی روح میں آگ
تمام عمر نہ آئے گا دل کو صبر و قرار

خدا کرے مرے غم کا اثر نہ تجھ پہ پڑے
ہزار ہوں مرے جیسے ترے سکوں پہ نثار

دیکھ کر پہلے پہل تجھ کو عجب عالم ہوا
ان دنوں حساس بھی تھا دل بہت معصوم بھی

مجھ سے بڑھ کر کون خوش ہوگا کہ تو میرا ہُوا
کوئی اندر سے یہ کہتا ہے رہو مغموم بھی

کب تلک اُلجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتا رہوں
زندگی دی ہے تو دے اس کو کوئی مفہوم بھی

مجھ سے بیگانہ رہا، تنہائیوں کے دکھ سہے
حُسنِ بے پروا ترا ظالم بھی ہے مظلوم بھی

خندۂ گُل سب نے دیکھا، زخمِ گُل دیکھے گا کون
تم ہی کہہ دو حالِ دل ہے کچھ تمہیں معلوم بھی

درکار اک حسین ہے جو پارسا بھی ہو
کھل کھیلنے میں طاق بھی ہو باحیا بھی ہو

ویسے تو یوں رہے کہ تعلق نہ واسطہ
لیکن نظر چرا کے ہمیں دیکھتا بھی ہو

ہر چند ناز و غمزہ پہ مائل نہ ہو مگر
ڈھب دل کو مار رکھنے کے سب جانتا بھی ہو

کچھ سادگی مزاج میں ہو، کچھ بناؤ بھی
بھولا لگے مگر ذرا چیتا ہوا بھی ہو

دن رات کی تمیز اٹھا دے جب آملے
پھر ان میں امتیاز کرے اور جُدا بھی ہو

وہ سب صفات ہوں جو حسینوں میں عام ہیں
اور پھر بطور خاص کچھ اُن کے سوا بھی ہو

ایسا تو ایک یارِ خداداد ہو سلیم
پھر وہ ہزار جان سے ہم پر فدا بھی ہو

فیضِ موسم ہے کہ دُزدیدہ نگاہی کا اثر
یہ جو اک مستی سی میرے خون میں صہبا کی ہے

حُسن سر تا پا کرم ہے اپنے دل کو کیا کروں
دل کے ہاتھوں تجھ پہ تہمت رنجشِ بیجا کی ہے

میں پرستار آئینہ کا ہوں کہ تُو ہے خود پرست
لوگ کہتے ہیں بہت خواہش مجھے دنیا کی ہے

کیسی لالچ، کیا قناعت آج میری روح میں
تشنگی صحرا کی ہے آسودگی دریا کی ہے

حُسن ہے ایک محفلِ خنداں
عشق اک کاروانِ نوحہ گراں
میں ہوں ساحل کی طرح افتادہ
ہے تری موجِ اِلتفات کہاں
اجنبی ہوں دیارِ غربت میں
زندگی انتظارِ ہم نفساں
جانے کن منزلوں میں لے آیا
مجھ کو اک کاروانِ عمرِ رواں
تو نہ سمجھے مرے سکوت کی بات
میں نہ جانوں ترے جہاں کی زباں
آسماں صد ہزار آنکھوں سے
کس کی جانب ازل سے ہے نگراں
وہ بھی تھے جن کی تشنہ کامی کو
راس آیا ہجومِ شُعلہ رخاں
میں نہیں اِلتفات کے قابل
اے مرے سوزِ حسرتِ پنہاں
دل پہ کیا کیا گھٹا برستی ہے
آج ہے کون اس طرف نگراں
داستانیں بنا گیا کیا کیا
میرا الجھا ہوا سا طرزِ بیاں
عشق ہے انتظارِ صُبحِ ابد
حُسن ہے ایک عالمِ اِمکاں

زور اتنا بھی عبث فکرِ پریشاں باندھا
بیتِ ابرو کو فقط مطلعِ دیواں باندھا

یہ نہ لکھا کہ نہیں حُسن کا روکش کوئی
مفت میں آئینے کو دیدۂ حیراں باندھا

اس پہ جھومے ہیں کہ زلفوں کو گھٹائیں لکھا
اس پہ پھولے ہیں کہ لب کو گلِ خنداں باندھا

جیسے تازہ ہی رہے گی گلِ مضموں کی بہار
اِس تکلف سے ترے رخ کو گلستاں باندھا

ایسے چلتے ہوئے مضموں پہ کیا نازِ سخن
قدِ بالا کو ترے سرو خراماں باندھا

یادِ رخ سے نہ گیا جاتے ہوئے وقت کا غم
بہتے پانی پہ عبث نقشِ گلستاں باندھا

حرم و دَیر پہ تاریک گھٹائیں چھائیں
تارِ گیسو سے دِل گبرو مسلماں باندھا

حاصلِ عمر مرا نیم نگاہی اس کی
سعی بے حدا سے اچٹتا ہوا پیکاں باندھا

عہد یہ دل سے کیا تھا کہ نہ چاہیں گے انہیں
عہد کو توڑ کے پھر اک نیا پیماں باندھا

شاخِ بے رنگئ مطلق سے جسے دل کہیے
چند گل توڑ کے گلدستہ امکاں باندھا

خود نمائی بھی رہی عجزِ وفا میں شامل
سر پہ دستار کی صورت ترا احساں باندھا

عشق کے بازوئے قدرت میں ہے کس بَل کِس کا
رسنِ جادۂ وحشت سے بیاباں باندھا

متفرق اشعار

اشعار کا چسکا ہے سبب ترکِ عمل کا
پڑھوائیں ہوس کو کوئی دیوان غزل کا

عشق کے نام پہ کب ہم نے اٹھایا گھاٹا
صبح تک بھول گئے رات کا چوما چاٹا

وہ دن گئے جب خیر سے تھا شوقِ نگارش
اب اپنی غزل گوئی ہے جذبات کی خارش

ہم نے اے ملکۂ دل تجھ سے چھپا رکھا ہے
اپنے سینے میں جو آباد ہے چاکیواڑہ

تاج کانٹوں کا پہن کر سنگ و آہن جھیل کر
حضرتِ دل آئے ہیں الفت کا ناٹک کھیل کر

ہمیں پودا سمجھ رکھا ہے قومی باغبانوں نے
کہ ہر موسم میں خوشخبری سناتے ہیں بہاروں کی

وہ انساں ہیں مگر ہے شوق ان کو شمع بننے کا
سو ہم بھی ایک شب ان کو شبستاں میں سجالینگے

ہے چوٹ برابر کی ہوس اور وفا میں
دیکھیں تو سہی آپ یہ جذبات کا دنگل

قدم قدم پہ گنہ سے ہمیں ڈراتے ہیں
میاں ضمیر ہیں گویا خدا کے ٹھیکے دار

ہمارے خون سے پل کر سماج کے گن گائے
سلیمؔ میں تو کہوں گا ضمیر کو غدار

دل ہے شاید درد سے خالی سلیم
آپ کا لہجہ بہت غمناک ہے

عشق میں اور تو کیا ہونا تھا
ایک مجموعہ کی تالیف ہوئی

وہ نہ سمجھے ہزار سمجھایا
روح اور جسم کچھ جدا تو نہیں

ریاکاری لبوں نے سیکھ لی ہے
کوئی حالت ہو یہ ہنستے رہیں گے

سو جتن سے بھی مرض جاتا نہیں
شاعری اپنے لیے سوزاک ہے

جنہیں کل عشق بننا ہے وہ جذبے
نظر کی رشوتوں پر پل رہے ہیں

اکائی

اِنتساب

طاہرہ بیٹی کے نام

وہ دن جو بیت گئے، زندگی کا حاصل تھے

یکم ستمبر ۱۹۸۳ء کی شام کو، جب سلیم احمد کے جسد خاکی کو زیرزمین آرام کرنے کے لیے قبر میں اتارا جارہا تھا تو معاً میں نے محسوس کیا کہ ماضی کے دریچے کھل گئے ہیں اور گزرے دنوں کے منظر ایک ایک کر کے تیزی کے ساتھ نظروں کے سامنے آرہے ہیں۔ میں نے اور سلیم احمد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز میرٹھ نامی بستی میں کم و بیش ایک ساتھ کیا تھا۔ میرٹھ جس کی طویل تاریخ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہے، میرٹھ جہاں راون کی سسرال تھی۔ میرٹھ جسے اندرپرستھ کی تعمیر کے صلے میں پانڈوؤں کے سب سے بڑے بھائی یدھسٹر نے، ماہی نامی معمار کو جاگیر کے طور پر دیا تھا اور جہاں اس نے اپنا محل تعمیر کیا تھا۔ اس محل کے آثار آج تک اندر کوٹ نامی محلے میں پائے جاتے ہیں۔ جاٹوں کی روایت کے مطابق یہاں مہاراٹھ گوت آباد تھی اور یہی مہاراٹھ بگڑ کر میرٹھ ہو گیا۔ آج بھی اس پورے علاقے میں جاٹ کثرت سے آباد ہیں۔ یہ وہی میرٹھ ہے جو اس زمانے میں غزنویوں کی سلطنت میں شامل تھا، جب لاہور ان کا دارالحکومت تھا۔ فتح دہلی کے بعد قطب الدین ایبک نے غیاث الدین بلبن کو میرٹھ کا حاکم مقرر کیا تھا جس کی ایک مسجد کے آثار گڑھ مکھنیشر میں آج بھی موجود ہیں۔ اسی میرٹھ میں میری اور سلیم احمد کی ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں فرسٹ ائیر کے طالب علم تھے اور ادب کی دنیا میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ دن رات یہی

اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہی موضوعِ سخن تھا اور یہی مقصدِ زندگی تھا۔ ہم دونوں نئی نئی کتابیں پڑھتے، تبادلہ خیال کرتے اور گھنٹوں انہی مسائل میں گم رہتے تھے۔ سلیم احمد اس وقت میرٹھ کے نوجوان شعراء میں سب سے ممتاز تھے۔ ہنرؔ تخلص کرتے تھے اور اقبال کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ "دائرہ ادبیہ" کے ایک جلسے میں جو ہر ہفتے فیضِ عام کالج میں ہوتا تھا، سلیم احمد نے ایک نظم سنائی جس کا ٹیپ کا مصرع "انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب" تھا۔ یہ نظم اتنی پسند کی گئی تھی کہ ساری محفل مجسم واہ واہ، سبحان اللہ بن کر رہ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ "دائرہ ادبیہ" کے ایک اور جلسے میں سلیم احمد نے جب ایک غزل سنائی تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور اس شعر پر تو وہ بے ساختہ داد ملی کہ آج بھی وہ آوازیں میرے وجود کا حصہ ہیں:

زمین والوں کی مشکلوں کو سمجھ سکیں گے نہ عرش والے
کہ آسماں سے زمیں کے اوپر نگاہ پڑتی ہے طائرانہ

اس زمانے میں سلیم احمد اور میں بے قرار روحوں کی طرح سارے میرٹھ شہر کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ میرٹھ کالج کے ہوسٹل سے بھیا وحید الدین کی لال کوٹھی تک، وہاں سے بیگم پل، خیر نگر، کمبوہ دروازہ، رشید چائے والے کی دکان، کبھی کوٹھی جنت نشان کی طرف، کبھی نواب اسماعیل خاں کی کوٹھی کی طرف، کبھی رزمی صدیقی کے ہاں پُروا فیاض علی، جہاں لیلیٰ مجنوں والے ماسٹر روبی سے ملاقات ہوتی اور اکثر بھینسای گراؤنڈ اور نادر علی بلڈنگ جہاں حکیم فرخ آبادی کا مطب تھا اور جہاں سلیم احمد کا گھر بھی تھا۔ کبھی سی پٹ بازار یا ویلی بازار سے ہوتے گزری سے گزرتے قاری محمد یونس کے گھر۔ اس تمام عرصے میں کسی نہ کسی ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی اور یوں معلوم ہوتا کہ ہم جلد ہی کائنات کے رازہائے سربستہ دریافت کرلیں گے۔ اسی اثناء میں کام کے منصوبے بنتے، نئی تحریروں پر بات ہوتی۔

گرمیوں کے موسم میں ہم جہاں سے گزرتے، چنبیلی، موتیا اور بیلے کی خوشبوؤں سے گلی کوچے مہکے ہوتے۔ چاندنی راتوں میں رات کی رانی کی مہک قدم قدم پر تازہ دم کرتی۔ یہ خوشبوئیں آج بھی مشامِ جاں کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ ادب اور شعر و شاعری اس شہر کی روح میں اسی طرح شامل

تھے، جس طرح زر پرستی آج ہماری روح میں شامل ہے۔ اسی ادب پرور ماحول اور اسی تخلیقی فضا کا اثر تھا کہ فرزندانِ میرٹھ نے اردو ادب میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ آج ان کے نام تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ اسماعیل میرٹھی، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر کرار حسین، انتظار حسین سلیم احمد، شمیم احمد، عالمتاب تشنہ، احمد ہمدانی، امید فاضلی، قیصر زیدی، ڈاکٹر صفدر حسین، حفیظ میرٹھی، نخشب جارچوی، بوم میرٹھی، حامد اللہ افسر، ساغر نظامی، ندرت میرٹھی وہ چند نام ہیں جن کے کاموں سے ہم سب واقف ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ اپنی زندگی کے اسی زمانے میں سلیم احمد اور میں روز ایک افسانہ لکھتے۔ کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی عصمت چغتائی، منٹو کے رنگ میں اور کبھی ناصر علی دہلوی کے رنگ میں ادبِ لطیف تخلیق کرتے۔ روزانہ شام کو سڑکوں پر بے مقصد گھومتے ہوئے کسی پیڑ کے نیچے یا کمپنی باغ کے سرسبز و شاداب لان پر بیٹھ کر اپنے اپنے افسانے پڑھتے، اُن پر تبادلۂ خیال کرتے اور اگلے افسانے کی تیاری میں لگ جاتے۔ دو تین سال کے عرصے میں ہم نے سینکڑوں افسانے لکھے اور بے شمار کتابیں پڑھیں۔ اس کاوش سے لکھنے کی مشق ہو گئی اور ادب کا ذوق سنور گیا۔

سلیم احمد کی وفات نے ماضی کے نہاں خانے میں جو دریچہ کھولا ہے، اس سے یادوں کی برات اتر آئی ہے۔ بہت سے دھواں دھواں چہرے صاف نظر آرہے ہیں۔ گم شدہ واقعات کے سرے دوبارہ ہاتھ آگئے ہیں۔ اسی زمانے میں تحریک پاکستان نے زور پکڑا۔ سلیم احمد نے خاکساروں کا بیلچہ سنبھال لیا اور میں لیاقت علی خاں کے الیکشن میں مصروف ہو کر قرب و جوار کے گاؤں دیہات کے دوروں پر نکل گیا۔ اس دور میں تصورِ پاکستان نے ادب کی جگہ لے لی تھی۔ میں نے ایک پمفلٹ لکھا جس میں دو قومی نظریے کی وضاحت کے ساتھ پاکستان کی معاشی خوشحالی کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا اور ہم میرٹھ سے بچھڑ کے جب دوبارہ ملے تو کراچی میں تھے۔ وہ کراچی جو پاکستان کی شہ رگ ہے۔ جہاں ہم نے اپنی تعلیم پوری کی اور زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا اور وہ بنے جو آج ہم نظر آتے ہیں۔

سلیم احمد اب ہم میں نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنا سفر ہم سب سے پہلے طے کر لیا۔ میرٹھ میں

تھے، جس طرح زر پرستی آج ہماری روح میں شامل ہے۔ اسی ادب پرور ماحول اور اسی تخلیقی فضا کا اثر تھا کہ فرزندانِ میرٹھ نے اردو ادب میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ آج ان کے نام تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ اسماعیل میرٹھی، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر کرار حسین، انتظار حسین سلیم احمد، شمیم احمد، عالمتاب تشنہ، احمد ہمدانی، امید فاضلی، قیصر زیدی، ڈاکٹر صفدر حسین، حفیظ میرٹھی، نخشب جارچوی، بوم میرٹھی، حامد اللہ افسر، ساغر نظامی، ندرت میرٹھی وہ چند نام ہیں جن کے کاموں سے ہم سب واقف ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ اپنی زندگی کے اسی زمانے میں سلیم احمد اور میں روز ایک افسانہ لکھتے۔ کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی عصمت چغتائی، منٹو کے رنگ میں اور کبھی ناصر علی دہلوی کے رنگ میں ادبِ لطیف تخلیق کرتے۔ روزانہ شام کو سڑکوں پر بے مقصد گھومتے ہوئے کسی پیڑ کے نیچے یا کمپنی باغ کے سرسبز و شاداب لان پر بیٹھ کر اپنے اپنے افسانے پڑھتے، اُن پر تبادلۂ خیال کرتے اور اگلے افسانے کی تیاری میں لگ جاتے۔ دو تین سال کے عرصے میں ہم نے سینکڑوں افسانے لکھے اور بے شمار کتابیں پڑھیں۔ اس کاوش سے لکھنے کی مشق ہو گئی اور ادب کا ذوق سنور گیا۔

سلیم احمد کی وفات نے ماضی کے نہاں خانے میں جو دریچہ کھولا ہے، اس سے یادوں کی برات اتر آئی ہے۔ بہت سے دھواں دھواں چہرے صاف نظر آرہے ہیں۔ گم شدہ واقعات کے سرے دوبارہ ہاتھ آگئے ہیں۔ اسی زمانے میں تحریک پاکستان نے زور پکڑا۔ سلیم احمد نے خاکساروں کا بیلچہ سنبھال لیا اور میں لیاقت علی خاں کے الیکشن میں مصروف ہو کر قرب و جوار کے گاؤں دیہات کے دوروں پر نکل گیا۔ اس دور میں تصورِ پاکستان نے ادب کی جگہ لے لی تھی۔ میں نے ایک پمفلٹ لکھا جس میں دو قومی نظریے کی وضاحت کے ساتھ پاکستان کی معاشی خوشحالی کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا اور ہم میرٹھ سے بچھڑ کے جب دوبارہ ملے تو کراچی میں تھے۔ وہ کراچی جو پاکستان کی شہ رگ ہے۔ جہاں ہم نے اپنی تعلیم پوری کی اور زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا اور وہ بنے جو آج ہم نظر آتے ہیں۔

سلیم احمد اب ہم میں نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنا سفر ہم سب سے پہلے طے کر لیا۔ میرٹھ میں

بھی وہ مقبول اور ہر دل عزیز تھے اور کراچی میں بھی وہ سارے شہر کے محبوب تھے۔ زندگی ہی میں برادرم مظہر یوسف صاحب نے کہا تھا کہ وہ ان کا مجموعۂ کلام شائع کریں گے، لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ کام، جس کا آغاز مظہر یوسف صاحب نے سلیم احمد کی زندگی میں کیا تھا، ان کی وفات کے بعد پورا ہو گا۔ اکائی "تنظیمِ احبابِ میرٹھ" کی طرف سے شائع کی جا رہی ہے، لیکن دامے، درمے، قدمے اس کی اشاعت کا سہرا مظہر یوسف صاحب کے سر ہے۔ "تنظیمِ احباب میرٹھ" دراصل میرٹھ کالج اور فیضِ عام کالج کے ان سابق طلبہ کی ویسی ہی ایک انجمن ہے جیسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ہے۔ یہ ایک ثقافتی انجمن ہے جو علم وادب اور تعلیم و تہذیب کی اس شمع کو روشن رکھنا چاہتی ہے جو ہمیشہ سے فرزندانِ میرٹھ کا طرۂ امتیاز رہا ہے تا کہ یہ روشنی اسی طرح پاکستان کے در و بام کو بھی منور کرتی رہے جس طرح کبھی میرٹھ کے در و بام کو روشن کرتی تھی۔

سلیم احمد کا تخلیقی سفر جو میرٹھ میں شروع ہوا تھا، کراچی میں اس وقت انجام کو پہنچا جب ان کی تخلیقی قوت اپنے شباب پر تھی۔ سلیم احمد نے شاعری میں، ڈرامے میں، فکر و تنقید میں، صحافت میں وہ کارنامے انجام دیئے ہیں جن کا اثر عہدِ حاضر پر گہرا پڑا ہے اور جن کا رشتہ آنے والے زمانے سے بھی گہرا ہے۔ "اکائی" سلیم احمد کی شاعری کا ایک اہم مجموعہ ہے جس میں ان کی غزل کا منفرد لہجہ اور آہنگ واسلوب متعین ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لہجہ ہے جس نے غزل کی روایت میں اضافہ کیا ہے اور جو تاریخِ غزل میں سلیم احمد کی پہچان ہے۔

"اکائی" کی اشاعت پر میں "تنظیم احباب میرٹھ" کے سب اراکین کو فرداً فرداً مبارک باد دیتا ہوں۔ "اکائی" کی اشاعت سے دراصل انہوں نے اس روایت کا آغاز کیا ہے جو نہ صرف ان کا عظیم ورثہ ہے بلکہ انہیں ہمیشہ سے عزیز بھی رہی ہے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۸۴ء

ڈاکٹر جمیل جالبی

شیروانی کے بٹن سے خاک لالہ وگل تک

سلیم احمد کی غزل گوئی میں شیروانی کے بٹن سے خاکِ لالہ و گل تک کئی نوع کی پیکاریں کئی سمتوں کی جستجو، اضطراب و سکون کے دائرے کسی ایک نکتہ سے مراجعت کا گمان کسی ایک اٹھتے ہوئے اگلے قدم کے احساس کے مراحل پے در پے ملتے ہیں۔ وہ اس دور جدید کے پر مغز بالغ اور بے تاب غزل گو ہیں جو روایات وجدت فکر کو اپنے کمال فن میں سمیٹ سکتے ہیں

عشق اور اتنا مہذّب چھوڑ کر دیوانہ پن
بند اوپر سے تلے تک شیروانی کے بٹن

اردو کا جدید ادب عہد فرنگ کے آغاز سے اس کے انجام بخیر تک کا پیدا کردہ ہے۔ اس دور نے ہمارے معاشرے میں، ہماری نفسیات میں، ہماری نامیاتی اور سیاسی زندگی میں بے شمار تغیرات برپا کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں از سر نو اپنے تاریخی شعور کو اپنے معاشرتی ادراک کو بار بار نئی کسوٹیوں پر پرکھنا پڑا۔ اس امتحان میں شکست وریخت کے جن لرزہ خیز ہنگاموں سے گزرنا پڑا، وہ آزادی کے پینتیس سال بعد بھی ہمارے لیے ایک سانحے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ساری تہذیبی مناسبتوں کے بدلنے کا اولین احساس یوں تو غالبؔ کے یہاں پہلے بھی ملے گا، مگر غالبؔ کے یہاں اس کی وضاحت ہے۔ کمشنر صاحب بہادر سے لے کر ملکہ وکٹوریہ کے قصائد تک تو غالبؔ کا فریضہ رزق تھا، مگر

سر سید احمد خاں کی کتاب پر تقریظ میں یہ کہنا کہ صاحبانِ انگلستان را نگر۔ تغیر کا ایک صاف اشارہ تھا۔ یہ تغیر کئی معرکوں سے ہوتا ہوا فکری محاذ پر پورے عروج میں اقبالؔ کے ہاں ملتا ہے۔ اقبال کی بانگ درا سے لے کر پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق تک پوری توانائی، جلال و عظمت سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے، وہی ہمارا سرمایہ ہے۔

بات یہ ہے کہ اشیائے محرک و جامد، صدیوں کے جماؤ سے ایک ہی چکر میں لگی رہتی ہیں۔ جب وہ دائرہ ٹوٹتا ہے تو معاشرتی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ذہن کا سارا ساز و سامان بدل جاتا ہے۔ تمدن اور تہذیب کے ایک قوس سے نکل کر انسانی ذہن جب جستجو کا نیا رخ اختیار کرتا ہے تو نئی تہذیبی قدریں، نظام فکر، نئے تجربات کی بنا پر چیزوں کو دیکھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ اس کی بدلتی ہوئی ماہیت نئی حرارتوں سے منسلک ہوتی ہے۔ وہی ایک جغرافیائی حدود میں پرورش پانے والی روایت جو ذہن کو یکے بعد دیگرے نسل در نسل روکے ہوئے تھی، ایک ٹھہراؤ پیدا کیے ہوئے تھی، نئی ہواؤں نئے اجزاء کی آنچ سے ایک اور قالب ڈھونڈنے لگتی ہے۔ موضوعِ سخن بدلنے لگتا ہے۔ لب و لہجہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ دوسرے شعبہ ہائے فکر کی بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ صرف مشرق کی سب سے زیادہ معروف صنفِ سخن غزل کو ہی لیجیے، جس کا دورِ اول ہماری روایات شعری میں عہدِ غلاماں سے عہدِ عالمگیری تک آیا۔ خسرو، نظیری، عرفی، فیضی اور کئی اساتذۂ سخن (آخری فارسی گویانِ ہند غالب، شبلی اور اقبال) عہدِ عالمگیری جب بکھرنے لگا اور خلفشار ہر مد میں جاری و ساری تھا تو پہلی بار یہ شعور جاگ اٹھا کہ فارسی ہمارے احساسات، ہمارے ذہنی کرب کا ساتھ نہیں دے رہی۔ ہم کسی دوسری زبان میں کراہ رہے ہیں، فریاد کر رہے ہیں، ہمیں نئے سانچوں کی ضرورت ہے۔ اس انتشار کے نشاط و غم کے مساوی ایک نئی زبان، ایک نئے محاورے کی تلاش، جو عوام میں پیدا ہو کر شرفاء کا امتیاز ہو گئی۔ زندگی اپنے وجود کا نیا اعتراف چاہتی تھی۔ میر اور میر کے دور میں دو بڑے کام ہوئے۔ ایک یہ کہ ساری تبدیلیوں کو جو ایک جان لیوا کرب میں لپٹی ہوئی تھیں، زبان و بیان کا ایک نیا قالب ملا جو ہماری شعری روایات بن گیا۔ دوسرے یہ کہ بڑے شعراء نے نجی، ذاتی، سماجی، نفسیاتی تجربوں کی گہرائی میں صداقتوں کا ایک سلسلہ قائم کر کے نئے آنے والوں کے تجربات کے لیے ایک راہ، ایک جان کاری کے در کھول دیئے۔

فارسی سے اردو غزل کی طرف آنا ایک معاشرتی ضرورت تھی۔ دانتے نے "ڈوائن کمیڈی" لکھی تو اس کو کہنا پڑا کہ میں اپنے خیالات کے لیے Vulgar زبان استعمال کر رہا ہوں۔ لاطینی عوام سے دور ہو چکی تھی۔ میر صاحب نے "ذکرِ میر" تو فارسی میں لکھی، مگر درد و غم جمع کیے تو دیوان اردو ہی میں لکھا۔ شاعری میں معاشرتی ضرورت بنیادی بات ہے۔ اردو غزل میرؔ و سوداؔ، آتشؔ و ناسخؔ، غالبؔ و ذوقؔ، مومنؔ، دردؔ، انشاءؔ، مصحفیؔ، داغؔ و میرؔ، جلالؔ و اسیرؔ سے ہوتی ہوئی حسرت موہانی تک پہنچی۔ یہ سفر تھکا دینے والا تھا۔ تھک جانے کو ہمارے نقاد، زبان و بیان پر طنز اور اعتراض سمجھیں گے مگر Inertia سست پیاں فسردگی ذہن کے بے سکت ہونے پر محمول ہوتی ہے۔ بڑے انقلابات تھے۔ ان کو سمیٹنے کی طاقت کی آزمائش الگ تھی۔ غزل کے اس رچاؤ میں نئے شعور کی تازگی لے کر یگانہؔ اور فراقؔ آئے۔

۱۸۵۷ء سے اب تک مشرقی مفکرین کے ساتھ جان اسٹیورٹ مل، لاک، ہیوم ہیگل، کانٹ تا عہد حاضر، ہر نام کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ ادھر ادب میں براؤننگ سے ایلیٹ تک، بودلیر سے لوئی آراگون تک انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی ادب کے پارکھی اور قاری موجود ہیں۔ بہر کیف ہر فکری موڑ پر ایک نیا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ فراقؔ کا ذہن نیا تھا، فیض کا ذہن نیا تھا، راشدؔ کا ذہن نیا تھا۔ بنیادی بات ایک نئے عہد کی آمد اور اس کی قدروں کی پیکار میں مبتلا معاشرے کی ہوتی ہے اور جس کے کام میں یہ ساری جھلکیاں ہوں، اس کا ذہن نیا ہوتا ہے۔ سلیم احمد کا ذہن نیا ہے۔ اس میں جو اضطراب و جستجو ہے، وہ خواہ تنقید ہو یا تمثیل ہو، گفتگو ہو یا شعر ہو، اس میں کسی چیز کے پانے کا شدید کرب موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ منظر ان کی آنکھ کو پتھر کر دیتا ہو، مگر یہ لہر کہ یہ سب کیا ہے او رکیوں ہے؟ ان کے کلام میں آپ کو برابر ملے گی۔

سلیم احمد کی غزل کا اعتبار اس میں ہے کہ وہ خود چپ چاپ کڑی جھیل کے جذبات کو ایسے سانچے میں ڈھال دیں جو پورے سماج کی سمجھ کے برابر ہو، اس کام کی نیو ذرا گہری ہوتی ہے۔ اس کی شرط یہ ہے کہ غزل کے فن کی تہوں میں جہاں پورے سماج کی سمجھ نتھر کر جمع ہو رہی ہو، اس سوتے کی خبر غزل گو رکھتا ہو اور سلیم احمد اس سے آشنا تھے۔ آزمائش یہ ہوتی ہے کہ کیا وہ ساری اُلجھنیں جو معاشی، سیاسی اور تہذیبی بکھراؤ کی اڑتی ہوئی دھول لے کر فکر کے گھیرے میں داخل ہو رہی ہیں،

اس کے بس کی ہیں۔ منہ زور ہوا کے لگاتار وار میں ڈھال تو الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ اگر شاعر ان کی پرکھ نہ رکھتا ہو اور یہ بھی چاہے کہ اپنے زمانے کی نبض پر اس کا ہاتھ ہو تو اس کے جذبے اس کی فکر اور اس کے الفاظ کا سرچشمہ ایک ہی ہونا چاہیے۔ اس کسوٹی پر سلیم احمد کی غزل زمین سے ابلتے ہوئے سوتے کی طرح اپنی لہر میں مسلسل تازگی رکھتی ہے۔ اس کی حرارت "اکائی" میں متوازن ہے۔ میں ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں پر بات کر سکتا ہوں، مگر موضوعِ سخن ان کا ذہن اور ان کی غزل ہے۔

سلیم احمد کی غزل جذباتی غزل گوئی سے انحراف ہے۔ غم و غصہ میں معاشرے پر طنز ضرور ہے مگر اس کی بنیاد بھی ایک معیارِ زندگی کی طلب ہے۔ ان کی غزل کچھ سوالات، کچھ زیرِ لب جوابات اور اندیشوں کی غزل ہے۔ یہ سارے سوالات اور اندیشے وہی ہیں جو نظم و نثر میں آج کی دنیا میں اٹھائے جا رہے ہیں۔ انہوں نے بھی تیس بتیس سال اردو کی ادبی زندگی کی منجدھار میں رہ کر گزارے ہیں اور ایسی تائیدی اور تنقیدی ہواؤں میں ان کی غزل اپنا رخ بدلتی رہی:

مجھے سمیٹو تو میرے اندر نئے معانی ہیں نقش بستہ
کتابِ خود آگہی ہوں لیکن ورق ورق بکھر گیا ہوں میں

مجھ کو بے تابیوں میں سکوں کب ملا، جلتی آنکھیں ہیں بیداریوں کا صلہ
عمر اس کی تلاش و طلب میں کٹی، ایک دنیا نظر آئی تھی خواب میں

خود اپنی ذات میں پیکارِ کفر و دیں ہوں میں
گماں ہوں وہم ہوں تشکیک ہوں یقیں ہوں میں

زہر ہے میرے جام میں ہونٹوں پہ آ گئی ہے جاں
ذائقہ حیات سے اینٹھ گئی مری زباں

جانکاہیوں میں عمر کو اپنی بسر کیا
جینا کہ عیبِ عشق تھا ہم نے ہنر کیا

صرف اس ردیف کو دیکھیے جو سماجی شعور کی پوری اشاریت رکھتی ہے۔ ان کی بے تاب روح

حالات مقابلے کے لیے ہمیشہ تڑپتی رہتی۔ غالبًا یہ اِس صدی کا مقدر ہے اور ایسی معرکہ آرائیوں کا مرکزاب نیم بیدار مشرق، مغرب سے زیادہ ہے۔ عہد حاضر کے انسان کی دیومالا کا اہم ترین باب اس کے ذہن کی آزادانہ جستجو کی صلاحیت ہے۔ یہی نئے انسان یا نئے ذہن کی متھ Myth ہے اور اس جگہ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے۔ کہ غنودگی اور خواب کے علاقوں کے ادھر جو ہوا سر پٹکتی رہی، اس کی مدت تین چار سو سال ہے۔ اس مدت میں تہذیب حاضر تک پہنچا ہوا یہ اضطراب ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ہوا یہ کہ جب گیلیلیو نے یہ کہا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ نکلا گیا کہ انسان ایک نئی آگہی کے لیے اپنی روح تک گرور کھنے کو تیار ہے۔ یہ دور بھی ایک ایسی عہد آفریں مساوات E=mc2 کا ہے۔ وہی فاؤسٹ والا قصہ نکل آیا۔ چونکہ سلیم احمد خود بہت اچھے ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کی غزلیں دیکھتے ہوئے عہد حاضر کے اضطراب کی معرفت سے میرے ذہن میں سولہویں صدی کا ایک ڈرامہ سامنے آگیا ہے۔ ڈرامہ ہے:

"The Tragical History of Life and Death of Dr. Faustus."

ڈرامہ نگار ہے، کرسٹفر مارلو۔ منظر ہے:

انسان ساری کائنات کو اپنے نئے اوزاروں سے پرکھ رہا ہے۔

فاؤسٹ کہتا ہے:

"ایک دنیائے سود مند شادماں
طاقت آبروئے نام اور بے کراں اختیارات کی
جانفشاں ہنرمندوں کا انعام ہے!
وہ ساری چیزیں جو قطبین کے درمیان گرم رفتار ہیں
اب میری دسترس میں ہے، بادشاہوں اور شہنشاہوں کی حکمرانی
ان کے علاقوں تک ہوتی ہے، مگر اس کا دائرہ اختیار ان علاقوں سے کہیں زیادہ
اس کی سرحد وہاں تک جاتی ہیں، جہاں انسانی ذہن مصروفِ کار ہے۔"

ہماری صدی اور اس کا اضطراب بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ گوئٹے اور اقبال نے اپنے اپنے رنگ میں

حالات مقابلے کے لیے ہمیشہ تڑپتی رہتی۔ غالباً یہ اِس صدی کا مقدر ہے اور ایسی معرکہ آرائیوں کا مرکز اب نیم بیدار مشرق، مغرب سے زیادہ ہے۔ عہد حاضر کے انسان کی دیو مالا کا اہم ترین باب اس کے ذہن کی آزادنہ جستجو کی صلاحیت ہے۔ یہی نئے انسان یا نئے ذہن کی متھ Myth ہے اور اس جگہ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے۔ کہ غنودگی اور خواب کے علاقوں کے ادھر جو ہوا سر پٹکتی رہی، اس کی مدت تین چار سو سال ہے۔ اس مدت میں تہذیب حاضر تک پہنچا ہوا یہ اضطراب ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ہوا یہ کہ جب گیلیلیو نے یہ کہا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ نکالا گیا کہ انسان ایک نئی آگہی کے لیے اپنی روح تک گرو رکھنے کو تیار ہے۔ یہ دور بھی ایک ایسی عہد آفریں مساوات E=mc2 کا ہے۔ وہی فاؤسٹ والا قصہ نکل آیا۔ چونکہ سلیم احمد خود بہت اچھے ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کی غزلیں دیکھتے ہوئے عہد حاضر کے اضطراب کی معرفت سے میرے ذہن میں سولھویں صدی کا ایک ڈرامہ سامنے آگیا ہے۔ ڈرامہ ہے:

"The Tragical History of Life and Death of Dr. Faustus."

ڈرامہ نگار ہے، کرسٹفر مارلو۔ منظر ہے:

انسان ساری کائنات کو اپنے نئے اوزاروں سے پرکھ رہا ہے۔

فاؤسٹ کہتا ہے:

"ایک دنیائے سود مند شادماں
طاقت آبروئے نام اور بے کراں اختیارات کی
جانفشاں ہنر مندوں کا انعام ہے!
وہ ساری چیزیں جو قطبین کے درمیان گرم رفتار ہیں
اب میری دسترس میں ہے، بادشاہوں اور شہنشاہوں کی حکمرانی
ان کے علاقوں تک ہوتی ہے، مگر اس کا دائرہ اختیار ان علاقوں سے کہیں زیادہ
اس کی سرحد وہاں تک جاتی ہیں، جہاں انسانی ذہن مصروفِ کار ہے۔"

ہماری صدی اور اس کا اضطراب بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ گوئٹے اور اقبال نے اپنے اپنے رنگ میں

اس اضطراب اور تلاشِ سکون کو ایک لباس دیا، اس اضطراب کا لازمی طور پر مترشح ہونا اور ہمارے ادب میں جگہ پانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ اس کی بڑی اور چھوٹی مثالیں موجود ہیں اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "اکائی" کی وحدت میں یہ اضطراب جھلک اٹھتا ہے:

نیا مضمون کتاب زیست کا ہوں
وہ رن مجھ میں پڑا ہے خیر شر کا
کہ اپنی ذات میں اک کربلا ہوں
خود اپنی دید سے اندھی ہیں آنکھیں
خود اپنی گونج سے بہرا ہوا ہوں

خود اپنی آگ سے تو جی اٹھے شرر کی طرح
یہ معجزہ ابھی اے کائنات باقی ہے

"اکائی" میں تثلیث نما قطعات بھی ہیں، باقاعدہ قطعات بھی ہیں، نثری نظمیں بھی ہیں۔ ان سب میں یہی ایک کیفیت ہے۔ میں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس ۳۰۔ ۳۲ سال میں جو کچھ پڑھا ہے، خصوصاً اردو غزل میں، اس میں نئے ذہن کی نمائندگی کے لیے سلیم احمد کا نام میرے سامنے آتا ہے۔ وہ اشعار جن کی ساکھ پر میں یہ بات کہہ رہا ہوں، کچھ آپ نے سن لیے، کچھ اور سن لیجئے۔

حیات نو یونہی صورت پذیر ہو شاید
ہزار طرح کا امکاں انتشار میں ہے

یہ کونپلیں مری حیرت کی تہہ سے پھوٹی ہیں
نمو یقیں کی ہوئی ہے گماں کے موسم سے

مری شکست سے تو بھی بکھر نہ جائے کہیں
مجھے سنبھال کے رکھ تیرا آئینہ ہوں میں

سلیم احمد کی "اکائی" "بیاض" "نئی نظم اور پورا آدمی" جب آپ پڑھ چکیں یا ان کی دوسری

کتابیں، توان کی شخصیت کے تین پہلو اجاگر ہوں گے۔ اولاً تو یہی کہ ان کا ذہن نیا اور اپنے اضطراب میں سوالوں سے پُر ہے، دوسرے یہ کہ وہ مشرقی تہذیب کی روایات میں عشق و تعلقات، معاشرے اور تمدن کی ساخت کو پنپتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، تیسرے کسی گوشے میں ایک ایسا سایہ ہے جو حریفانہ ان کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ اشعار جس زاویے سے آتے ہیں وہ ان کی نرم مزاجی کے ساتھ چوکنا رہنے کی خبر دیتے ہیں۔

ہر ایک سے مرا انداز دوستی ہے الگ
مرا حریف بھی شامل مری قطار میں ہے

کیا دور ہے سلیم کہ چلتا نہیں ہے کام
توہینِ اعتبارِ شرافت کیے بغیر

تم تو دشمن بھی نہیں ہو کہ ضروری ہے سلیم
میرے دشمن کے لیے میرے برابر ہونا

ان کی شخصیت کے تین پہلوؤں کی یک بستگی ان کے کلام میں ایک اور تلاش کی طرف لے جاتی ہے جو اس کا روحانی پہلو ہے۔ مشرق تصوف کی سرزمین ہے۔ اس کے ہر مکتبۂ خیال کی الگ شرح کی جاسکتی ہے۔ بہر کیف وحدت الوجود اور وہ آگہی جو انسان کو اپنی تشنگی میں بھی سیراب رکھتی ہے کوئی قابل بحث مسئلہ نہیں ہے۔ اس آگہی کی شرط کوئی نہیں ہوتی، منطق کوئی نہیں ہوتی۔ یہ یا تو انسان میں ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ سلیم کے یہاں یہ آگہی اور یقین انہیں اجازت دیتا ہے کہ وہ دنیا کے علائق اور اس کے رشتوں سے وابستہ رہیں۔ ان کا تصوف اور ان کی حقیقت پسندی یک دگر ہو کر سامنے آتی ہے۔ ان کے یہاں فطرت بر تر میں گزراں واقعات کی معنویت جذب ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ چند تاثرات تھے جو ان کی کتاب ''اکائی'' سے میرے ذہن پر مرتب ہوئے۔ تنقید و تقریظ کے صاحبان کرام کو ان کی کتابوں پر تفصیل سے لکھنا چاہیے۔ موجودہ دور کے شعراء میں ایسا ذہن، ایسی ہمہ گیر شخصیت کا فقدان ہے اور یہ شعر صرف ذاتی تعلق کا نہیں بلکہ تاریخی شعور کا سراغ ہے:

تجھے میں تیری محبت سے ہٹ کے دیکھ سکوں
یہاں تک آنے میں مجھ کو کئی زمانے لگے

یہ عہد نئے مسئلے اٹھانے لگا۔ غزل کو اس طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس کی اشاریت، علامتیں فارسی اور اردو کے بہترین ذہنوں کا دیا ہوا ذخیرہ ہمارے سامنے ہے، لیکن زمانہ بہت تیز ہواؤں کا ہے مگر محض غزل سرائی یا نغمہ میں غوغائے عالم کو ڈبو دینا ہر چند کہ اہم کام ہے، مگر زمانے کے تقاضے کو کسی طرح بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔ غزل کی اس صلاحیت کو کہ وہ اپنے اندر سب کچھ سمیٹ لیتی ہے، سلیم اچھی طرح جانتے ہیں اور ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جہاں ان کی غزل کی نغمگی کبھی کبھی خواب آفریں ہوگی، اس میں بیداری کی وہ رو ضرور ہوگی جو ان کے یہاں ہے۔ ان کے خواب آفریں اشعار اس بات کی دلیل ہیں کہ نغمہ جو ان کے لب پر ہے، دل سے نکلا ہوا ہے۔

اس آنکھ میں خوابِ ناز ہو جا
اے ہجر کی شب دراز ہو جا

اسرار تمام کھل رہے ہیں
تو اپنے لیے بھی راز ہو جا

اے نغمہ نوازِ آخرِ شب
آہنگِ شکستِ ساز ہو جا

شاعری آج بڑا مشکل فن ہوگئی ہے۔ اس پر کئی ذمہ داریاں اپنا پر تو ڈال رہی ہیں۔ آدمی کی ذات میں کئی پیچ پڑ گئے ہیں۔ معاشرہ جس کی بنیاد اقتصادی امتیازات پر ہے، اپنے تصرف میں رہنے والے اداروں کو زندگی پر مسلط کیے ہوئے ہے۔ ایک طرف الفاظ کی قیمت بازار میں صحافت کے علاوہ ادب میں نہیں ہے۔ پبلی کیشن کی دقتیں بھی ابھی تک حل نہیں ہوئیں۔ بیسیوں شعبے ایسے ہیں جن سے نمٹتے ہوئے سلیم احمد نے اردو غزل کو ایک توانائی دی جو آپ اپنی مثال ہے۔

عہدِ فرنگ کے آخری دور میں بلکہ پہلی جنگِ عظیم سے آزادی تک جس پیمانے تک ناول نگار،

نقاد، شعراء گزرے ہیں انہوں نے کیا بحیثیت فرد اور کیا بحیثیت گروہ ادب کے معیار کو، اس کی فکر کو، اس کی لغت و محاورے کو ایسی نیرنگیاں، ایسی جستجو کی روح دی ہے جو ادب کے تاریخ نویسوں کے لیے عہد آفریں مواد فراہم کرے گی۔ اس دور کی پرچھائیاں آج بھی ہمارے ادب پر پڑ رہی ہیں۔

موجودہ دور جو آزادی کے بعد آیا ہے، اپنے تہذیبی اور ثقافتی مسائل میں پیچیدہ تر ہے۔ ایشیا کی قدیم و جدید روایات کی آمیزش سے کیا کچھ پیدا ہوگا، اس کی پیش گوئی مشکل ہے۔ ہمارے مفکرین، ہمارے دانشور، ہمارے سائنس دان کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ واضح طور پر ذہنوں میں ہونا چاہیے اور اس فکر کی روشنی نئے شاعروں میں صاف نظر آنی چاہیے۔ یہ تصور شاعر کی آگہی و ادراک کے کام آتا ہے اور اس سلسلے میں یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ سلیم ایک معتبر شاعر ہیں جنہیں اس کا احساس ہے۔

اب "بسیار خوباں دیدہ ام" کے بعد ان کی دلآویز شخصیت اور ان کے مزاج کی نرمی سے محرمانہ واقفیت رکھنے کے بعد مجھے ان سے معتبر تر ہونے کی امیدیں وابستہ ہیں۔ ان کے گھر کے سینکڑوں شامیں جو رات گئے تک آتشیں بحثوں میں گزر چکی ہیں، یاد آرہی ہیں۔ ان شاموں میں مرحوم پروفیسر محمد حسن عسکری صاحب، پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب، سلیم اور میں ہوتے تھے اور اندر سے آپا جان اور ان کی والدہ محترمہ کی آواز آتی تھی کہ چائے تو پی لو۔ ان ہاتھوں کا جو چائے کی پیالیاں بڑھا کر مصروفِ دعا ہو جاتے تھے، دل پر ایک ایسا قرض ہے جو کبھی نہیں اتر سکتا۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

یہ نشستیں نجی، ذاتی ایک ایسے دور میں، ایک ایسے موڑ پر ہوئی تھیں جب فکر کے نئے جادے بن رہے تھے۔

آدمی کی ذات، کسی آدمی کی ذات، اس کے رومال یا اس کے لباس کی طرح ذاتی سرمایہ نہیں ہوتی۔ وہ بیشتر ان اجزاء سے مرکب ہوتی ہے جو غیر شعوری طور پر پورے معاشرے کی اجتماعیت سے پیدا ہوتے ہیں اور آدمی اپنی ذات کو اس اجتماعیت کے سپرد کر دیتا ہے۔ ایک اپنی نفی کے بعد معاشرے کا مثبت پہلو پیدا ہوتا ہے۔ شاعری کی یہی خصوصیت ہے جس کی طرف کیٹس (Keats) نے اپنے خطوط میں اشارہ کیا ہے۔ اسے وہ Negative Capability کہتا ہے۔ ویسے شاعر کا ایک

وجدانی ادراک اس کا امتیازی پہلو ہے۔ اس لحاظ سے سلیم احمد کے یہاں آپ کو ہر غزل میں کچھ کیفیت کے اشعار مل جائیں گے۔ انہی دنوں ان کا تالیف و تخلیق کردہ ایک ڈرامہ "شاہین" ناظرین کے سامنے ہے۔ مجھے پھر Dr. Faustus کا آخری سین یاد آرہا ہے۔

میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ یہ صدی آتشیں اضطراب کی صدی ہے۔ اس کے سپید و سیاہ میں ہم مجبوروں کو جو دخل ہے، سو چند سوالات اٹھا لینے کا ہے۔ بہر کیف فاؤسٹ کرسٹو فر مارلو کی تمثیل کا یہ آخری منظر ہے۔ روح تو گرو ہو چکی ہے، تلاش جاری ہے مگر بے سود۔ فاؤسٹ عالم نزع میں ہے تو کہتا ہے۔

میں اپنی کتابیں جلادوں گا، وہ سانپ جس نے
حوا کو بہکایا تھا، اسے نجات دی جائے مگر فاؤسٹ کو نجات نہ ملے۔

سلیم کا وژن کس رخ سے کام کر رہا تھا، ان کے سامنے اس تلاش کا انجام یا جدید انسان کا مقدر کس طرح آیا تھا۔ انہوں نے بھی کہا

اسے سنبھال کے رکھو خزاں میں لو دے گی
یہ خاکِ لالہ و گل ہے کہیں ٹھکانے لگے

عزیز حامد مدنی

۶ جون ۱۹۸۳ء

حمد

ابھرتے سورج کی نرم کرنیں
فصیل شب کے حصار میں رقص کر رہی ہیں
یہ رقص آغازِ زندگی ہے
ابھرتا سورج نئے زمانے کی آگہی ہے
نیا زمانہ کہ عہدِ انکار سے گزر کر حیاتِ اثبات بن رہا ہے
خدائے گم کردہ پھر سے آفاق کی حدوں پر ابھر رہا ہے
خدائے زندہ معاف کر دے
گناہ میرے جو سب کریں گے
وہ لفظ میرے جو سب کہیں گے
وہ درد میرے جو سب سہیں گے

نیا اِمکان

نئے امکاں کو صورت دے رہا ہوں
گرا کر خود در و دیوار اپنے
میں اپنے گھر کو وسعت دے رہا ہوں

رات

میں جہاں ہوں فقط وہاں تک ہے
یا مکاں سے یہ لامکاں تک ہے
ہر دیا سوچتا ہے ساری عمر
رات کا سلسلہ کہاں تک ہے

اِکائی

روشنی ہے چراغ میں زندہ
نشۂ مے ایاغ میں زندہ
جسم و جاں کی اکائی ٹوٹ گئی
میں فقط ہوں دماغ میں زندہ

خوئے مصلحت

یہ کشتی رفتہ رفتہ بھر رہی ہے
مجھے روکا تھا طوفانوں سے جس نے
وہ خوئے مصلحت اب مر رہی ہے

کونپل

کوئی شے مضطرب ہے میرے دل میں
نئے سانچے میں ڈھلنا چاہتی ہے
کہ جیسے توڑ کر مٹی کی تہہ کو
کوئی کونپل نکلنا چاہتی ہے

چراغِ نیم شب

وہی گریہ وہی موجِ طرب ہے
یہ آدھی عمر اور اُس کی محبت
وہی میرا چراغِ نیم شب ہے

دیا

مرے چاروں طرف ہیں میرے سائے
خود اپنی تیرگی میں گھر گیا ہوں
دیئے کی طرح آدھی رات کو میں
کسی خالی مکاں میں جل رہا ہوں

کیوں

کیا ملا ہے بنا کے صید مجھے
چھین کر لامکاں کی وسعت کو
جسم میں کیوں کیا ہے قید مجھے

بیج

میں اُس کے جسم کا ہوں ایک ذرّہ
مری کُل عمر اس کی اِک گھڑی ہے
شجر جیسے ذرا سے بیج میں ہو!
کوئی شے مجھ میں مجھ سے بھی بڑی ہے

ایک ہی صُورت

سِل گیا ہوں میں، کفن میں جی اٹھوں
زندگی کی ایک ہی صورت ہے اب
ذہن میں مر کر بدن میں جی اٹھوں

دریا

عدم کی سمت بڑھتا جا رہا ہوں
جو لمحہ آ رہا ہے کٹ رہا ہے
بڑھاتا جا رہا ہے پاٹ دریا
یہ ساحل رفتہ رفتہ گھٹ رہا ہے

اکھوا

بدن میں روح کا در پھوٹتا ہے
نہیں ہوتی محبت بالا بالا
یہ اکھوا تہہ کے اندر پھوٹتا ہے

آفاق

بدن سُن ہو گیا ہے بیٹھے بیٹھے
میرے قد سے بھی چھوٹا یہ مکاں ہے
میں اپنے پاؤں کچھ پھیلا تو لیتا
مگر آفاق میں وسعت کہاں ہے

میری ذات

اتنی بے مصرف نہیں ہے میری ذات
ایک ذرہ بھی اگر کم ہو گیا
تاابد ماتم کرے گی کائنات

گُذرگاہ

سلسلے ہیں کبھی جوابوں کے
ہیں قطاریں کبھی سوالوں کی
قافلے آتے جاتے رہتے ہیں
میں گذرگاہ ہوں خیالوں کی

شریکِ غم نہیں

ابھی چُپ ہوں ابھی محوِ فغاں ہوں
کوئی میرا شریکِ غم نہیں ہے
میں اپنی لاش پر نوحہ کناں ہوں

دروازہ

گھٹا جاتا ہوں اپنی ذات میں میں
یہاں آب و ہوا تازہ نہیں ہے
نکلنا چاہتا ہوں خود سے باہر
مگر اِس گھر کا دروازہ نہیں ہے

چھلنی

مسرت جو ابھی تازہ کلی تھی
ابھی اک پل میں باسی ہوگئی ہے
کیا ہے روح کو آسودہ جتنا
یہ چھلنی اور پیاسی ہوگئی ہے

رُوح کا پھل

عجب نسبت ہے باہم جان و تن کی
بجا ہے روح کا پھل ہے محبت
یہ پھل پکتا ہے گرمی سے بدن کی

دریا کا شور

دور سے آواز دیتا ہے کوئی
جب کبھی سنتا ہوں میں دریا کا شور
میرے اندر موج لیتا ہے کوئی

نقطہ

ہر طرف سے انفرادی جبر کی یلغار ہے
کن محاذوں پر لڑے تنہا دفاعی آدمی
میں سمٹتا جا رہا ہوں ایک نقطہ کی طرح
میرے اندر مر رہا ہے اجتماعی آدمی

گھر کا سناٹا

سارا دن انتظار میں کاٹا
دوست آکر چلے گئے سر شام
بڑھ گیا اور گھر کا سناٹا

لوٹ آیا

لوٹ آیا پھر جوانی کا مزا
جس طرح تیرے لب شیریں کا لمس
یوں لگا کچھ آج پانی کا مزا

آدھی عُمر

کونسی شب نیند آئی چین کی
کون سے دن غم کی شدت گھٹ گئی
لمحہ تیرے ہجر کا کٹتا نہیں
عمر آدھی سے زیادہ کٹ گئی

گفتگو

خود اپنے خار میں الجھا ہوا ہے
خود اپنے پھول چُننا چاہتا ہے
یہ مقصد گفتگو کا ہے کہ ہر اک
خود اپنی بات سننا چاہتا ہے

شاید

لاکھ ہنگامے ہیں میری بات میں
پھر بھی میں چپ ہوں کہ شاید سُن سکوں
گفتگو جو ہو رہی ہے ذات میں

اندازہ

داغ ہوں سینۂ عدم کا میں
غم نہ ہونے کا مجھ سے ہے تازہ
جیسے تنہا دیے سے ہوتا ہے
رات کی وسعتوں کا اندازہ

گہرائیاں

یہ بزم آرائیاں تنہائیاں ہیں
سمٹ آئی ہیں تیری گفتگو میں
سکوتِ شب میں جو گہرائیاں ہیں

وہ لفظ

وقت کی گود میں پائندہ ہیں
تو جنہیں بھول گیا ہے کہہ کے
تیرے وہ لفظ ابھی زندہ ہیں

کب تک

کہاں تک ہوگی غم کی پاسداری
لہو اپنا بھلا کب تک پئیں گے
کیے تھے جب کسی سے عہد و پیماں
یہ اندازہ نہ تھا اتنا جئیں گے

روشنی

پیرہن کی تیرے یہ گلکاریاں
جلد کی تہہ میں وہ ہلکی روشنی
پھول کی پتی پہ جیسے دھاریاں

فاصلہ

تخیل نے اُسے پھیلا دیا ہے
جو غم ہے وہ ترا غم ہوگیا ہے
ہمارے درمیاں جو فاصلہ تھا
نہ ملنے سے ترے کم ہوگیا ہے

ہم

ہنگاموں پر مرتے ہیں
تنہائی سے گھبراتے ہیں
خاموشی سے ڈرتے ہیں

میری محبت

زمانہ نوکری گھر فکرِ دنیا
یہ رنگینی کا افسانہ نہیں ہے
تجھے چاہا ہے پورے جسم و جاں سے
محبت کا الگ خانہ نہیں ہے

دل کی وسعتیں

مزا چائے میں سگریٹ کے کشوں میں
مزا دفتر میں گھر میں فائلوں میں
تجھے چاہا تو دنیا کی ہر اک شے
سمٹ آئی ہے دل کی وسعتوں میں

میں اور وہ

اسیر اپنا کیا کتنے جتن سے
اسے آتا تھا کیسا دم دلاسا
میں اپنی ذات میں سیراب شبنم
وہ خواہش کا سمندر اور پیاسا

بدن

بدن ہی گو جدائی کا سبب ہے
بدن ملنے سے جانیں مل رہی ہیں
یہی خط دائرے کے درمیاں ہے
اِسی خط پر کمانیں مل رہی ہیں

رنجِ تنہائی

وہ جو بکھری ہوئی تھی محرومی
ایک احساس میں سمٹ آئی
آج اک دوست کی تواضع سے
بڑھ گیا اور رنجِ تنہائی

وُہ دِن

کتنے بھرپور وہ دن تھے اپنے
کتنی سرشار تھیں راتیں اپنی
چڑھتے نشے کی طرح موج بہ موج
ختم ہوتی نہ تھیں باتیں اپنی

لے چلو

کوئی منظر نہیں ایسا کہ جو روکے مجھ کو
کوئی لمحہ نہیں ایسا کہ جو ٹوکے مجھ کو
بے تعلق رہا ایسا تو میں مر جاؤں گا
لے چلو اپنی محبت میں سمو کے مجھ کو

سچائی

نہ بچوں سی خوشی مجھ کو میسر
نہ رو سکتا ہوں میں اُن کی طرح سے
نہ سچائی ہے میرے جاگنے میں
نہ سو سکتا ہوں میں اُن کی طرح سے

بات وہ ہے

درد وہ ہے جسے چبھن سوچے
ہے وہ منزل جسے تھکن سوچے
فکر وہ ہے جو خون میں حل ہو
بات وہ ہے جسے بدن سوچے

بس کا اِنتظار

تھا جو احساسِ دوریٔ منزل
عمر کو وقفِ رہگذار کیا
یوں سمجھئے کہ چل دیئے پیدل
دیر تک بس کا انتظار کیا

سننے والا

کوئی الجھا ہوا ہے خار و خس میں
تو کوئی پھول چننا چاہتا ہے
کوئی کچھ بھی کہے پر سننے والا
وہ سنتا ہے جو سننا چاہتا ہے

ذائقہ

تم کو کیا یاد کبھی آتا ہے
شام کو چائے پیا کرتے تھے
تھا کبھی ذائقہ زندہ اپنا
ایک اک گھونٹ جیا کرتے تھے

آواز

مرے سینے کی دھڑکن بن گئی ہے
یہ تنہائی میں ہے دمساز میری
خلا میں ایک ہنگامہ مچا کر
پلٹ آئی ہے پھر آواز میری

نئی دنیا

پرانے لفظ بوسیدہ ہوئے ہیں
جو سنتے تھے وہ باتیں مر رہی ہیں
نئی دنیا کی پیدائش کا دن ہے
پرانی کائناتیں مر رہی ہیں

ہمراہی

دو ہمراہی

سورج اور میں

شام کو منزل پر پہنچے

دونوں بہت تھکے ہوئے تھے

مٹی کے بستر میں سوئے

اگلی صبح کو سورج جاگا

مجھ کو سوتا چھوڑ کے

تنہا چلا گیا

دُکھ کی بات

وہ دن بھی کیسے دن تھے

جب تری پلکوں کے سائے

شام کی گہری اداسی بن کے

میری روح میں جادو جگاتے تھے

مری آنکھوں میں نیندیں

تیرے بالوں کی طرح، ایسے سبک سے جال بُنتی تھیں

کہ جو حلقہ بہ حلقہ، خواب اندر خواب

ان جانے زمانوں کی گریزاں ساعتوں پر

ابر کی صورت برستے تھے

بدلتے موسموں کی طرح تیرے جسم پر عالم گزرتے تھے

مری جاں تو بہارِ جاوداں کا ایک موسم تھی

جو میری روح میں آیا

مجھے کیوں یاد آتے ہیں

وہ دن

جو اَب نہ آئیں گے

نہ آئیں گے تو پھر کیوں یاد آتے ہیں

وہ دن بھی کیسے دن تھے

جب مری بیداریوں کی سرحدیں خوابوں سے ملتی تھیں

وہ باتیں جو کہ ناممکن ہیں، ممکن تھیں

جہاں بس سوچ لینا اور ہو جانا برابر تھا

تجھے کیا یاد ہے وہ دن

کہ جب حرفِ شکایت کی گرہ سی پڑ گئی تھی

میرے سینے میں

میری آزردگی سے شام کے چہرے پہ زردی تھی

میں تیرے پاس بیٹھا سوچتا تھا

جانے کیا کیا سوچتا تھا

تجھے کیا یاد ہے

تُو نے کہا تھا

میں دل کی بات اگر اُس سے بھی

کہہ سکتی تو کہہ دیتی

کہ میرے جسم میں دو دل دھڑکتے ہیں

تمہارے واسطے بھی

اور اُس کے واسطے بھی

جو تمہارا دشمنِ جاں ہے

جِن

بچپن میں بوڑھوں سے سُنا تھا
کچھ لوگوں پر جِن آتے ہیں
جو اُن کو بھگائے پھرتے ہیں
وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں
اپنے آپ نہیں کہتے ہیں
جن اُن سے کہلاتے ہیں
اب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
کچھ لوگوں پر لفظ آتے ہیں
جو اُن کو بھگائے پھرتے ہیں
وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں
اپنے آپ نہیں کہتے ہیں
لفظ اُن سے کہلاتے ہیں

راکھ

مرے دونوں ہاتھوں میں کچھ بھی نہیں راکھ ہے
امیدوں کی جو آخری ساعتوں تک دھواں دے رہی تھیں
اور آنسو۔۔۔۔
لہو۔۔۔۔
اور بچپن کے دن
یہ سب راکھ ہیں
میں اِس راکھ کو اپنے چہرے پہ مل کے کھڑا ہوں

آنسو

یہ آنسو کہ جن میں شفق پھولتی ہے
کئی آنے والی بہاروں کی سوغات ہیں

ایک خط

سمندر نے یہ خالی سیپیاں
کیسے اُگل دیں
آ کے ساحل پر
میں پہلے بھی کہا کرتا تھا
(تجھ کو یاد ہو شاید)
کہ تیری روح کے گہرے سمندر میں
میرا دل ایک سیپی ہے
مگر میں نے کبھی تیری محبت کو نمائش میں نہیں رکھا
میں ان لوگوں سے چڑتا تھا
جو افسانے کہا کرتے ہیں یاروں سے محبت کے
مگر ویسے بھی دنیا میں کسی کی کون سنتا ہے
(سناتا ہے کوئی جب اپنی باتیں
سننے والے اپنی باتیں یاد کرتے ہیں)
مگر یہ کیسی راتیں ہیں
کہ اکثر سوتے سوتے چونک اٹھتا ہوں
(مجھے تو نیند بھی اک قرضِ چشم غیر ہے)
میں سوتا جاگتا رہتا ہوں
اک ایسے مسافر کی طرح
جس کو کسی چھوٹے سے اسٹیشن پہ

گاڑی سے اُترنا ہو

ترے ہلتے ہوئے ہاتھوں سے

یہ کیسی ہوا آئی

مری جاں تجھ سے رخصت ہو کے

میں کتنا اکیلا تھا

یہ دنیا سو رہی تھی جب

کسی دل کی طرح

جس نے ابھی رونا نہ سیکھا ہو

کوئی کونپل

کبھی زورِ نمو میں

سنگ بستہ خاک سے لڑتی ہوئی

باہر نکلتی ہے

کہ جیسے شوخ بچے

ہاتھ اور دامن چھڑا کر

گھر سے باہر بھاگ جائیں

اور گزر گاہوں پہ سو جائیں

گزر گاہوں سے بچوں کو اٹھا کر لاؤ

اور گہوارۂ جاں میں سُلا دو

وہ جاگیں گے تو ان کے خواب پورے ہو چکے ہوں گے

سو آخر یوں ہوا

امید کی شاخوں پہ ایسے برگ و بار آئے

مری جاں

تیرا ملنا تشنگی کے دشت میں

وہ آبِ تازہ تھا

جو شبنم بھی ہے دریا بھی ہے

اور روح میں نم ہو تو آنسو بھی

مجھے آنسو نہیں ملتے، نہیں ملتے، نہیں ملتے،

وہ شب بھی کیسی شب تھی

جس کا نقدِ صبح اب تک قرض ہے مجھ پر

جو مجھ سے پوچھتا ہے

اب محبت کو کہاں لے جاؤ گے

کس دل میں رکھو گے

میں چُپ تھا

تُو بھی چُپ تھی

اور خاموشی کے لمحوں کے

گزرتے قافلے

سانسوں کی آوازِ جرس پر جا رہے تھے

ایک منزل کی طرف

جو نصف جنت نصف دوزخ تھی

میں کتنا سنگ دل ہوں

جو تیری جنت پہ خوش ہوتا نہیں

دوزخ پہ ہنستا ہوں

سفر

کئی سرزمینیں صدا دے رہی ہیں کہ آؤ
کئی شہر میرے تعاقب میں ہیں، چیختے ہیں نہ جاؤ
کئی گھر لبِ حال سے کہہ رہے ہیں
کہ جب سے گئے ہو
ہمیں ایک ویران تنہائی نے ڈس لیا ہے
پلٹ آؤ پھر ہم کو آباد کر دو
وہ سب گھر
وہ سب شہر۔۔۔ سب سرزمینیں
محبت کی چھوڑی ہوئی رہگزر بن گئی ہیں
کبھی منزلیں تھیں مگر آج گردِ سفر بن گئی ہیں
محبت سفر ہے
مسلسل سفر ہے
سو میں تجھ سے تیری ہی جانب سفر کر رہا ہوں

ایک رات

ابھی میں سوتے سوتے چونک اٹھا ہوں
آئینہ میں جھلملاتی روشنی
پلکیں جھپک کر بول اٹھی ہے
کوئی آیا ہے
وہی تنہائی
جو سمٹی ہوئی سوتی ہے
گہری سانس لیتی ہے
مجھے وہ شب نہ بھولے گی
کہ میں نے جب دعا مانگی
(خدا میری بھی تجھ کو عمر دے دے)
دعا مانگی تھی میں نے تیرے مرنے کی

محبت

ایسی قوت جو صرف نہیں ہوتی ہے
۔۔۔۔اذیت بن جاتی ہے
میرے دل میں کتنی محبت تھی
جس کو زمانے کی بے مہری اور سرد طبیعت نے
اظہار میں بھی آنے نہ دیا
آخر میں نے سارا درد سمیٹا
اور تیری آنکھوں پر وار دیا
دنیا میرے لیے تیری صورت میں
پیمانہ حسن و خیر بنی
یوں تو محبت فرد سے فرد کو ہوتی ہے
لیکن تجھ سے میری محبت
وہ نقطہ ہے جس کے چاروں طرف
آفاق کی گردش ہوتی ہے

الجھی سانسیں

اس نے لکھا تھا کسی کو

مرے بچے

خاک زرگر میں چھپے ذرے ہیں

جن کو میں جاں کے عوض سونپ رہی ہوں تم کو

مجھ کو کچھ زندہ کھلونوں سے محبت تھی

جیسے عینی کسی ہمسایہ سہیلی

کے کھلونوں کو اٹھا لاتی ہے

اور سو جاتی ہے

سینہ سے لگا کر ان کو

داغ جو روح میں ہیں

جسم پہ ہوتے تو مجھے

لوگ اک جلتا ہوا شہر سمجھتے

میں راکھ میں کیا ڈھونڈتا ہوں

تُو نے جلتے ہوئے دیکھا تھا اُسے

داغ تھے جسم پہ اُس کے جیسے
تیز جلتا ہوا موم
شمع کے جسم پر جم جاتا ہے
جل بجھی
جل بجھی اور مجھے پھونک گئی
رشتے اُلجھی ہوئی سانسیں ہیں مگر
اُس کی سانسیں تو کسی اور کا سرمایہ تھیں
اُس کے جلنے سے مری راکھ کا رشتہ کیا تھا
مجھ کو خوابوں نے کبھی چین سے سونے نہ دیا
اس کے ہونٹوں نے جگایا تھا مری آنکھوں کو
داغ بوسوں کے
لبوں پر نہیں رہتے
لیکن۔۔۔۔
روح پر زخم سا بن جاتے ہیں
تو جدا ہو گئی ملتے ہوئے ہونٹوں کی طرح
(یہ مرا خط تجھے اک بوسۂ نادیدہ ہے)

ہاتھ

ہاتھ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے ہیں
اور ہاتھوں کی زباں کوئی سمجھتا بھی نہیں
لیکن آغازِ محبت کا وہ پہلا پیغام
(ایک تپتے ہوئے صحرا کی وہ پیاس جس پہ ہے لفظ حرام)
اُس کے ہاتھوں نے دیا تھا مجھ کو

حق

روٹی پر کتے لڑتے ہیں
میں روٹی کے حق پر لڑتا ہوں

اب

وہ ایک لمحہ جو "اب" نہیں ہے
گزر چکا ہے
وہ ایک لمحہ جو "اب" نہیں ہے
ہے آنے والا
گزر چکا ہے جو ایک لمحہ وہ میں نہیں ہوں
ہے آنے والا جو ایک لمحہ وہ تُو نہیں ہے
کہ ایک لمحہ ہیں
دونوں ہم تم
وہ ایک لمحہ جو صرف "اب" ہے
یہی ازل ہے
یہی ابد ہے

ایک دروازے پر

میرے گھر کے دروازے پر۔۔۔۔

دستک دینے والے نے پوچھا!!

اندر کون ہے

میں ہوں

میں ہوں

میں ہوں

چند صدائیں آئیں

یہ سب جھوٹے ہیں

میں تو شہر سے باہر گیا ہوا ہوں

میرے پیچھے!

گھر کے نوکر "میں" بن بیٹھے ہیں

میں ایسا کیوں ہوں

کیوں تھا؟ ایسا کیوں تھا؟ میں ایسا کیوں تھا؟
میرے باہر باخبری کی کیسی کیسی آوازیں تھیں
میرے اندر بے خبری کی خاموشی تھی
(گونگی، بہری، اندھی تاریکی تھی)
میرے لہو میں ایک تناور تنہائی کی
پہلی کونپل پھوٹ رہی تھی
جسم کے روئیں روئیں میں اِک سرگوشی سی جاری تھی
میری آنکھیں جھوٹے، سچے، ان دیکھے خوابوں سے الجھ گئی تھیں
لیکن یہ سب کچھ کیوں ہے؟ کیا ہے؟
یہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا
میں ایسا کیوں تھا؟
جو چاہوں تو۔۔۔
اور پاگل پن کی حد تک چاہوں
لیکن یہ بھی نہ جانوں۔۔۔
تُو کیا ہے؟
اور خواہش کیا ہے؟

سورج کی بیماری

تو آؤ اب گھر چلتے ہیں

دن کی تھکن اب شام ہوئی ہے

سورج کو اپنے گہوارے میں سو جانے دو

وہ بہت تھکا ہوا ہے

سورج کی بیماری نے ہم سب کو تھکا دیا ہے

کیا جانے کل کیا ہو گا

کل تو اک اندیشے کو کہتے ہیں

دیکھو ہم کتنے اندیشوں سے گزرے اور زندہ ہیں

اس نے کہا تھا۔۔۔۔زندہ رہو

اٹھارہ برس

اٹھارہ برس جو نیند کی سانسیں بن کر گزر گئے

اور اب جلتی آنکھوں کی بیداری

وہ حاصل ہے

جو لاحاصل ہے

میں اپنی ساری نیندیں بھول گیا ہوں
ہم سب اپنے خوابوں کا سودا کر کے جینا بھول گئے ہیں
وہ بھی میرے خوابوں کا اک حصہ تھی

اور اس نے کہا تھا۔۔۔۔زندہ رہو
جیسے زندہ رہنا میرے بس میں ہے
وہ سچی تھی
ٹھہرو مجھ کو دروازہ کھولنے دو
گھر کی دیواروں پر ویرانی ہوتی ہے
میں آج تمہارے ساتھ سحر تک جاگوں گا
دونوں کھانا کھا کر گپیں ہانکیں گے
میری میز پہ فاقہ کش امیدیں
وہ روکھی سوکھی کھاتی ہیں
جو مایوسی سے بچ جاتی ہے
میرے بستر پر بے خوابی کروٹیں لیتی ہے
اس نے کہا تھا زندہ رہو
کیا زندہ رہنا میرے بس میں ہے
میں تو سانسیں گن گن کر
اپنی گم گشتہ نیندوں کی نوٹ بکوں میں لکھتا ہوں

آنکھیں

جینے کے معنی آنکھیں ہیں

تیری آنکھیں جینا بھی ہیں جینے کا اسلوب بھی ہیں

آنکھوں سے آنکھوں کے ملنے میں جو لذت ہے

وہ جینے کی لذت ہے

میں نے تیری آنکھوں سے دکھ سہہ کر بھی جینا سیکھا

جب سے ان آنکھوں سے دور ہوا ہوں

میں جینا بھول گیا ہوں

اپنا رستہ بھول گیا ہوں

خواب

سچ بولوں تو کوئی نہ مانے

دیکھنے والا اور دیکھا جانے والا

دونوں مجھ میں ایک ہوئے ہیں

میں وہ سب کچھ ہوں، جو میں دیکھتا ہوں

کرنوں کا یہ روپہلا دریا میرا بدن ہے

یہ ننھی کلی جو کھلنے سے پہلے کملائی ہے

مری خواہش ہے

دور افق پر ہنسنے والے تارے میری امیدیں ہیں

یہ جو غار ہے

جس سے میں ابھی نکلا ہوں

کچھ بھی نہیں ہے

میری لاعلمی ہے

یہ سب چیزیں خواب میں مجھ سے جدا ہوئی ہیں

اور دیکھنے اور دیکھے جانے کی حد بن بیٹھی ہیں

جب میں جاگوں گا تو دیکھوں گا

کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔

میں ہی میں ہوں۔۔۔

دس برس

رات جاگی ہوئی
قہقہے جیسے کرنوں کی رنگیں پھواریں
اور ہلکی ہنسی چاندنی کی طرح
اور باتوں کا دریا سبک رو ہواؤں کے ہلکے جھکولوں پہ بہتا ہوا
لہر چڑھتی ہوئی اور اُترتی ہوئی
قربتیں فاصلوں میں سموتی ہوئی
کوئی آیا تو سب کی نگاہیں اٹھیں
خیر مقدم ہوا
اور پھر رات کا بے اماں سحر ہر چیز پر چھا گیا
میں نے سوچا کہ جب
تیری اس محفلِ شب میں، میں ہی نہیں ہوں تو پھر۔۔
تیرے دل کے دھڑکنے کے انداز، آنکھوں کے جھکنے کی اِس کیفیت
اور میٹھی ہنسی کی حلاوت کو یوں یاد کرنے سے کیا فائدہ
وقت میرا نہیں
اور زخمِ تغیر کا کوئی مداوا نہیں

بھُولا بسرا نغمہ

صبح کو "بھولے بسرے نغمے" میں
پنکج کی چڑھتی دھوپ کی مانند
روشن اور گرم آواز
مرے دل کے آنگن میں اُتری
اور جانے کتنی یادوں کی چمکیلی کرنیں لے آئی
تم صوفے پر اکیلی بیٹھیں نٹنگ کر رہی تھیں
اور نہ جانے کیوں
تمہارے ہونٹوں پر ہلکی سی ہنسی تھی
جیسے کوئی کلی اپنے آپ ہی کھلتی جائے
پیا ملن کو جانا، جانا پیا ملن کو جانا
بجھے دیے اندھیری رات
آنکھوں پر دونوں ہاتھ
دھیرے دھیرے دبے دبے
یونہی پاؤں بڑھانا۔۔۔

پنکج گا رہا تھا

میں نے تم کو دیکھا اور اُن لمحوں کے بارے میں سوچا

جو تم نے مجھ سے ملنے سے پہلے بسر کیے تھے

مجھ کو اُن لمحوں پر رشک آیا

تم سے پہلے میرا جینا جینا نہیں تھا لیکن

تم مجھ سے پہلے جینا سیکھ چکی تھیں

میں نے تم سے کہا

تمہیں پیا ملن کو جانے کا سندیسہ کیسا لگتا ہے

تمہاری ہنسی کچھ اور چمک اٹھی

تم نے اپنی گہری چھاؤں والی پلکیں اٹھا کر مجھ کو دیکھا اور کہا

اس گانے میں پیا ملن کو آنا، ہوتا تو یہ کچھ اور بھی اچھا ہوتا

یہ کہہ کر تم میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں

میں نے سوچا تم کو اک لمحے میں خوش کرنے کا کیسا اچھا فن آتا ہے

جھوٹی باتیں بھی تمہارے منہ سے کتنی سچی لگتی ہیں

کانٹے بکھرا کے چلوں۔۔پانی ڈھلکا کے چلوں

سکھ کے لیے سیکھ رکھوں پہلے دکھ اٹھانا

پنکج کی زخمی لے میں کتنی سنبھلی ہوئی کیفیت کا مرہم ہے

میں نے دکھ تو بہت اٹھائے لیکن۔۔۔۔

سکھ کے لیے

کوئی زخم نہیں کھایا ہے

میرا دشمن

اس نے جو ضرب لگائی مجھے بھرپور لگی
میں نے جب وار کیا اس کی جگہ خالی تھی
تھک گیا، چُور ہُوا، ہار گیا
وہ مرا دشمنِ عیار مجھے مار گیا
آخری وقت میں دیکھا تو وہ دشمن میرا
اور تو کچھ بھی نہ تھا میری ہی پرچھائیں تھا

وجُود

عدم کی سیہ رات میں
ایک جگنو کی مانند اُڑتا ہوا
جلتا بجھتا ہوا
میں کہاں جا رہا ہوں

تنزیہہ

خدائے زندہ تُو میرے وہم و خیال کی حد سے ماوراء ہے
خدائے معلوم کی پرستش میں آدمی خود کو پوجتا ہے
تجھے اگر "ہے" کہوں تو حق ہے
اگر "نہیں ہے" کہوں تو "ہے" کا ہونا ہے اِس میں شامل
یہ "ہے" -- "نہیں ہے" کی بحث باطل
تو "ہے" کی تہمت سے ماوراء ہے
"نہیں" کے الزام سے بری ہے

گونگا تجربہ

مرے فن کی یہ کاوش ہے
کہ گونگے تجربے
جن کی خموشی اک اذیت ہے
نیا اظہار پا جائیں
میں اُن چیزوں کا جویا ہوں
جو اندھی اور ننگی ہیں
بہت جھوٹی ہیں اور اندر سے خالی ہیں
وہ آئینہ تراشوں میں
یہ سب چیزیں
نیا معیار پا جائیں

میرا ہمسفر

ہم دونوں ہمراہی ہیں
ہم دونوں میں منزل اور زنجیر کا رشتہ ہے
میں زندہ ہوں
وہ مردہ ہے

کہاں

دھوئیں کی فصیلوں میں
لپٹے ہوئے شہر کی
شاہراہیں
کہاں جارہی ہیں

کھیل

شام کو دفتر کے بعد

واپسی پر گھر کی سمت

میں نے دیکھا میرے بچے

کھیل میں مصروف ہیں

اتنے سنجیدہ کہ جیسے کھیل ہی ہو زندگی

کھیل ہی میں سارے غم ہوں کھیل ہی ساری خوشی

اے خدا!

میرے فن میں دے مجھے

تو میرے بچوں کی طرح

کھیل کی سنجیدگی

زندگی

اذیت

جو مری رگ رگ میں نشتر سی کھٹکتی ہے

مجھے مژدہ سناتی ہے

کہ میں جو بے حسی سے مر چکا تھا

آج زندہ ہوں

شُکر

شُکر کرو

اے ہم نفسو!

ہم مردہ ہیں

پر آنکھیں اب بھی زندہ ہیں

گراموفون

میرے گھر میں ایک پرانا گراموفون ہے
بچے اُس سے کھیلا کرتے ہیں
میں کبھی بیکاری کے لمحوں میں اس کو بجایا کرتا ہوں
اکثر اس کی سوئی اٹک جاتی ہے
اور وہ ایک لفظ پر رک کر
''میں'' ہی ''میں'' دہرایا کرتا ہے

لکیریں

میری بیٹی عینی نے

کاغذ پر کچھ ٹیڑھی میڑھی

لکیریں بنائی ہیں

اور پوچھتی ہے

ابو یہ کیا ہے

مرے گاؤں سے ریل کی پٹڑیاں دور تھیں

میں نے

پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے

کچھ ہرے بُوٹ توڑے

مجھے اپنے بچپن کے مرنے کی پہلی خبر مل چکی تھی

میں اگر رووُں گا

تو پھر تعزیت کرنے والوں کے جھوٹے

ریاکار چہرے

کہاں جائیں گے

قبر پر گھاس دو دن میں اُگ آئی تھی

میں نے مٹی سے کانٹوں پہ چلنے کی رخصت طلب کی

اور رویا نہیں

میں نے چلتے ہوئے تم سے مڑ کر کہا

دائرے سے نکل کر کہاں جاؤ گی

تمہیں یاد ہے

تم مجھے اپنے بچپن کا ایسا کھلونا سمجھتیں

جو بند الماریوں میں سجا ہو

تمہارے کھلونے کہاں ہیں

اُلجھنیں

اُلجھنوں سے

مری زندگی

ہونی ان ہونی باتوں کا ایسا معمہ بنی

جس کا حل

تم بھی نہیں تھیں

تمہارے لیے

کبھی میں خدا تھا

مگر پاؤں کی ٹھوکریں

سر کی ٹھوکر سے کچھ مختلف تھیں

جسے دیوتا جانتے ہیں

مری بیٹی عینی نے

کاغذ پر کچھ ٹیڑھی میڑھی

لکیریں بنائی ہیں

میرا چہرہ

ایک قیافے کے ماہر نے مجھ سے کہا
گہری چالیں چلنا
اور دنیا کو دھوکے میں رکھنا
آسان نہیں ہے
لیکن تو چاہے تو یہ کر سکتا ہے
تیرا چہرہ
اک ہنس مکھ
احمق
کا چہرہ ہے

پاگل

صبح کو بستر سے اٹھا
ہوٹل میں جانے کے لیے
بازار میں آیا
دیکھا
سب اُلٹے ہیں
سب مجھ کو دیکھ کے ہنستے تھے
آوازے کستے تھے
تُم الٹے ہو
تُم الٹے ہو

مسز ایکس کی ڈائری

عصمت ایسا لفظ ہے

جو پڑھنے میں

اچھا لگتا ہے

رہی وفا

تو

موڈ اور حالات بدلنے تک

میں بھی کرتی ہوں

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں

اے کاش کبھی میں

ایسی محبت کر سکتی

جو افسانوں میں ہوتی ہے

لیکن میری اک مجبوری ہے

میں، تنہائی

اور خالی بستر سے

گھبراتی ہوں

گھر میں "ایکس" نہیں ہوتا ہے

تو

اور کسی کو لے آتی ہوں

سُورج

میرے اندر نور و ظلمت جدا جدا آہنگ نہیں ہیں
ایک ہی نغمے کے دو سُر ہیں
طاق میں رکھا دیا
جب تک جلتا ہے
نُور ہے
بجھا دیا تو ظلمت ہے
میں بھی جلتے بجھتے دیے کی مانند
نور اور ظلمت
دونوں سے گزر تا رہتا ہوں
لیکن آدھا نور اور آدھی ظلمت
سورج کی وحدت میں نہیں ہے
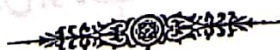
چاند پر نہ جاؤ

۳+۴۸+۲۴+۱۲+۶+۳

دیکھو اِس کو یوں سمجھو

"مطلق" تو اک وحدت ہے

انا، ارادہ اور آگاہی

ایک میں تین اور تین میں ایک

یہ ایک شجر ہے

جس سے کچھ شاخیں پھوٹی ہیں

(ہر شاخ پہ بندھن بڑھتے جاتے ہیں)

اور آخری شاخ قمر ہے

بیچ میں جو کچھ ہے یوں ہے

کل دنیائیں۔۔۔۔ تین

سارے سورج۔۔۔۔ چھ

اپنا سورج۔۔۔۔ بارہ

اپنی زمین۔۔۔۔ اڑتالیس

اس کے بعد وہی ویرانہ ہے

جس میں ہونا اور نہ ہونا دونوں یکساں ہیں

اس ویرانے میں جانے سے بہتر اپنی زمیں پہ مر جانا ہے

آئینہ

یہ چہرہ کتنا کالا اور بھدا ہے
یہ صورت اچھی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں عیاری ہے
یہ ہونٹ بہت ہنستے ہیں لیکن ان پر جھوٹ اور بد چلنی کی مہریں لگی ہوئی ہیں
افسوس کہ مجھ کو چیزیں ویسی نظر آتی ہیں جیسی وہ ہیں

آخری تسلی

بالآخر تسلی کے ہر لفظ کو بے اثر دیکھ کر
اُس نے مجھ سے کہا
مری زندگی میں تمہارے لیے
مجھے بھول جانا تو ممکن نہیں ہے
پھر بھی شاید تمہیں
صبر آجائے گا
مجھے یاد کرنا
مگر یہ سمجھنا
کہ میں مرچکی ہوں

ندامت

تم سچائی کی دیوانی تھیں
جو مجھ میں نہیں تھی
میں جھوٹا اُس سچ سے ڈرتا تھا
جو روحوں کو پتھر کر دیتا ہے
اب دونوں جھوٹے سچے
اپنے اپنے جھوٹ اور سچ پر نادم ہیں

اِنٹیوشن

اس نے کہا میں انٹیوشن سے کہتا ہوں
اِن ہنگاموں سے کچھ نہ ہو گا
جمہور تو اندھے ہوتے ہیں
اور ان کے لیڈر اندھوں میں کانے ہیں
آئین کا بننا مشکل ہے
بن جائے تو معطل ہو گا
اور اِس ملک میں پھر اک آمر آئے گا
نوکر شاہی کھل کھیلے گی
اور ہم جیسے باتیں کرنے والے
چائے خانوں میں
یونہی گپ شپ کرتے جائیں گے
میں اُس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا
اُن میں سچائی تو تھی پر منفی سچائی تھی
میں نے اپنی کاپی پر لکھا
کچھ لوگوں کو "انٹیوشن" کا دعویٰ ہوتا ہے
اور "ٹیوشن" کی ضرورت ہوتی ہے

دُعا

خداوندا

مجھے نانِ شبینہ دے

شکم کے دوزخی آزار سے مجھ کو بچالے

روح کو تابندہ تر کر دے

کہ میں زندہ رہوں اس حرفِ شیریں سے

جو تو خود ہے

کسی دشت کا لبِ خشک ہوں جو نہ پائے مژدہ آب تک
کبھی آئے بھی مری سمت کو تو برس نہ پائے سحاب تک

میں طلب کے دشت میں پھر چکا تو یہ راز مجھ پہ عیاں ہُوا
مری تشنگی کے یہ پھیر ہیں کہ جو آب سے ہیں سراب تک

تجھے جان کر یہ پتا چلا تو مقامِ دید میں اور تھا
کئی مرحلے ہیں فریب کے مری آنکھ سے مرے خواب تک

میں وہ معنیِ غمِ عشق ہوں جسے حرف حرف لکھا گیا
کبھی آنسوؤں کی بیاض میں کبھی دل سے لے کے کتاب تک

نیا مضمون کتابِ زیست کا ہوں
نہایت غور سے سوچا گیا ہوں

میری سیرابیوں میں تشنگی ہے
کہ میں دریا ہوں لیکن ریت کا ہوں

وہ رن مجھ میں پڑا ہے خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اک کربلا ہوں

خود اپنی دید سے اندھی ہیں آنکھیں
خود اپنی گونج سے بہرا ہوا ہوں

غم ہے پہ فسردگی کہاں ہے
غم میرے چراغ کا دھواں ہے

وہ آنکھ ہے اور لمحہ لمحہ
غمخواریٔ عمرِ رائیگاں ہے

سایہ سا ہے تیرے چشم و لب پر
یہ کون ہمارے درمیاں ہے

دریائے طلب کے دونوں جانب
اک ریت کا ساحلِ رواں ہے

اب میرے لیے مرے سفر میں
خود میرا وجود کارواں ہے

بزم آخر ہوئی شمعوں کا دھواں باقی ہے
چشمِ نم میں شبِ رفتہ کا سماں باقی ہے

کٹ گئی عمر کوئی یاد نہ منظر نہ خیال
ایک بے نام سا احساسِ زیاں باقی ہے

کس کی جانب نگراں ہیں مری بے خواب آنکھیں
کیا کوئی مرحلہ عمرِ رواں باقی ہے

آج بھی تو وہی اندازِ نظر ہے اُس کا
اب بھی اک سلسلۂ وہم و گماں باقی ہے

سلسلے اس کی نگاہوں کے بہت دور گئے
کارِ دل ختم ہوا کارِ جہاں باقی ہے

آج اک عمر میں اُس آنکھ نے پوچھا ہے سلیم
اب بھی کیا پہلی سی بیتابی جاں باقی ہے

وہ لوگ بھی ہیں جو موجوں سے ڈر گئے ہوں گے
مگر جو ڈوب گئے پار اتر گئے ہوں گے

لگی یہ فکر نئی دل کو آکے منزل پر
کہاں بھٹک کے مرے ہم سفر گئے ہوں گے

چلے تو ایک ہی رستے پہ ہم مگر نہ ملے
کہیں قریب سے ہو کر گزر گئے ہوں گے

پلٹ کے آنکھ میں وہ موجِ خوں نہیں آئی
چڑھے ہوئے تھے جو دریا اتر گئے ہوں گے

جو مل گیا ہے تو اب مجھ سے حالِ ہجر نہ پوچھ
کسی طرح سے وہ دن بھی گزر گئے ہوں گے

بہت غم سے مکدر ہو گیا ہوں
میں آئینہ تھا پتھر ہو گیا ہوں

غرورِ تشنگی سے رفتہ رفتہ
بجائے خود سمندر ہو گیا ہوں

بہت کم تھا میں اپنی آگہی سے
سو اب اپنے برابر ہو گیا ہوں

گریں اندھی امیدوں کی فصیلیں
میں ہر زنداں سے باہر ہو گیا ہوں

کسی نے جس کو دیکھا ہی نہیں ہے
میں وہ نادیدہ منظر ہو گیا ہوں

اس آنکھ میں خوابِ ناز ہو جا
اے ہجر کی شب دراز ہو جا

اسرار تمام کھل رہے ہیں
تو اپنے لیے بھی راز ہو جا

اے نغمہ نوازِ آخرِ شب
آہنگِ شکستِ ساز ہو جا

دیوار کی طرح بند کیوں ہے
دستک کوئی دے تو باز ہو جا

اب دن تو غروب ہو رہا ہے
سائے کی طرح دراز ہو جا

یاں فتح سبب ہے سرکشی کا
تو ہار کے سرفراز ہو جا

تو شیشہ بنے کہ سنگ، کچھ بن
اندر سے مگر گداز ہو جا

اس آنکھ سے سیکھ رازِ عصمت
کھل کھیل کے پاکباز ہو جا

کیسا لمحہ تھا وہ کیا وقتِ سفر آیا تھا
میں تری بزم سے بادیدۂ تر آیا تھا

تری شاخوں پہ کسی طائرِ وحشی کی طرح
میں گھنی چھاؤں میں دم لینے اتر آیا تھا

وہ تری یاد تھی دل میں کہ مسافر کوئی
ایک شب کے لیے پردیس سے گھر آیا تھا

اس کو منزل نہ کہوں وہ میری واماندگی تھی
راہ میں مرحلۂ ترکِ سفر آیا تھا

ایک تتلی کی طرح لمس کی لذت سے سلیم
رنگ اُس کا مرے ہاتھوں پہ اتر آیا تھا

یہ خواب اور بھی دیکھیں گے رات باقی ہے
ابھی تو اے دلِ زندہ حیات باقی ہے

مرے لہو میں ابھی ترکِ عشق کے باوصف
وہ گرمیٔ نگہِ التفات باقی ہے

ابھی تو ذوقِ طلب میں کمی نہیں آئی
ابھی مرا سفرِ بے جہات باقی ہے

جو ہوسکے تو شہادت گہہِ نظر میں آ
یہ دیکھ عشق میں کتنا ثبات باقی ہے

یہ کائنات ابھی ایک انتظار میں ہے
کہ ہونے والی کوئی واردات باقی ہے

خود اپنی آگ سے تُو جی اُٹھے شرر کی طرح
یہ معجزہ ابھی اے کائنات باقی ہے

شبِ وصال میں دن بھی ملا نہ لیں اے دوست
کہ رات ختم ہوئی اور بات باقی ہے

ہوئی ہے شاخِ ہنر میں نئی نمو اب کے
سلیم برگِ خزاں سے نجات باقی ہے

جدائی کب تھی کہاں ہوئی تھی میں اِس سے بھی بے خبر گیا ہوں
تو سایہ آسا تھا ساتھ میرے میں تجھ سے چھٹ کر جدھر گیا ہوں

مجھے سمیٹو تو میرے اندر نئے معانی ہیں نقش بستہ
کتابِ خود آگہی ہوں لیکن ورق ورق میں بکھر گیا ہوں

مری طبیعت کے ساحلوں پر ہے مرگ آسا سکوت طاری
یہ پیش خیمہ ہے آتے طوفاں کا جس کی شدت سے ڈر گیا ہوں

وہی شب و روز زندگی کے ہنسی بھی اشکوں کے سلسلے بھی
مگر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے اندر سے مر گیا ہوں

مرے سوا کون ہے کہ جس نے معاشِ غم اختیار کی ہے
میں ایک الزامِ زندگی تھا سو آج اپنے ہی سر گیا ہوں

اسی کو ترک وفا کا گماں ستانے لگے
جسے بھلاؤں تو کچھ اور یاد آنے لگے

اسے سنبھال کے رکھو خزاں میں لو دے گی
یہ خاکِ لالہ و گل ہے کہیں ٹھکانے لگے

تجھے میں اپنی محبت سے ہٹ کے دیکھ سکوں
یہاں تک آنے میں مجھ کو کئی زمانے لگے

بہار آئی وہ موجِ طرب لہو میں اُٹھی
کہ روح رقص میں آجائے جسم گانے لگے

یہ اُس کا جسم ہے یا ہے طلسمِ خواب کوئی
ادھر نگاہ اٹھاؤں تو نیند آنے لگے

وہ حرف تازہ کہ گل سا کھلے کہاں سے ملے
کہ زخم بھر گئے اور درد سب پرانے لگے

وہ لمحے بھول کے جن کو کوئی کمی بھی نہ تھی
جو یاد آئے تو کچھ اور دل دُکھانے لگے

کسی بہار سے تسکین آرزو نہ ہوئی
جو پھول صبح کھلے شام کو پرانے لگے

نویدِ دوریٔ منزل ثبات دے مجھ کو
کہ قرب سے تو قدم اور ڈگمگانے لگے

وفا بھی حل ہو تو ایسا نہ ہو سلیمؔ کہ پھر
دلِ خراب نئے مسئلے اٹھانے لگے

کسی نے بھی مجھے سمجھا نہیں ہے
یہ شکوہ ہے کوئی دعویٰ نہیں ہے

تجھے چاہا ہے جس ساعت میں، مَیں نے
وہ ساری عمر ہے لمحہ نہیں ہے

ابھی ہوں ایک مبہم سا تصور
ابھی اُس نے مجھے سوچا نہیں ہے

سکوں اِس راہ میں کیا ڈھونڈتے ہو
یہ صحرا ہے یہاں سایہ نہیں ہے

لکیروں میں چھپی ہیں صورتیں کچھ
مصور نے جنہیں دیکھا نہیں ہے

چلی ہے موج میں کاغذ کی کشتی
اسے دریا کا اندازہ نہیں ہے

میں سر چھپاؤں کہاں سایۂ نظر کے بغیر
کہ تیرے شہر میں رہتا ہوں اور گھر کے بغیر

مجھے وہ شدتِ احساس دے کہ دیکھ سکوں
تجھے قریب سے اور منتِ نظر کے بغیر

یہ شہر ذہن سے خالی نمو سے عاری ہے
بلائیں پھرتی ہیں یاں دست و پا و سر کے بغیر

نکل گئے ہیں جو بادل برسنے والے تھے
یہ شہر آب کو ترے گا چشمِ تر کے بغیر

کوئی نہیں جو پتادے دلوں کی حالت کا
کہ سارے شہر کے اخبار ہیں خبر کے بغیر

میں پاؤں توڑ کے بیٹھا رہا کہیں نہ گیا
سلیم منزلیں طے ہو گئیں سفر کے بغیر

کس کو فرصت کہ ٹھٹک جائے ٹھہرنے کے لیے
منزلیں راہ میں آتی ہیں گزرنے کے لیے

موجِ دریا وہ محبت کے سفینے ہوں گے
جو کہیں ڈوب گئے پار اترنے کے لیے

رات کو خالی مکانوں میں دیئے جلتے ہیں
جانے کون آتا ہے شب بھر کو ٹھہرنے کے لیے

جن کو گہرائی سے نسبت ہے وہ موجوں کی طرح
تہہ نشیں ہو گئے کچھ اور اُبھرنے کے لیے

ہم تو دیوانے ہیں اقرارِ محبت کے سلیم
جو کیا جاتا ہے پل بھر میں مُکرنے کے لیے

یہ خاک مرے رزق کی ضامن ہے امیں ہے
جس خاک کا میں رزق ہوں وہ اور کہیں ہے

جس نے تجھے دُکھ سہنے کی توفیق نہیں دی
وہ اور کوئی شے ہے محبت تو نہیں ہے

ٹُوٹے ہوئے تاروں کی لکیریں مری یادیں
تُو بھی کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں ہے

یہ لمحۂ موجود ہی وہ روزِ جزا ہے
جس پر تجھے کس درجہ یقیں تھا کہ نہیں ہے

تو منکرِ قانونِ مکافاتِ عمل تھا
لے دیکھ ترا عرصۂ محشر بھی یہیں ہے

سلیم کس کو بتاؤں ابھی سے کیا ہوں میں
ابھی تو کارِ تمنا کی ابتدا ہوں میں

تری کشش سے ترے گرد رقصِ شوق میں ہوں
جو قُرب سے نہیں گھٹتا وہ فاصلہ ہوں ہو

مری شکست سے تو بھی بکھر نہ جائے کہیں
مجھے سنبھال کے رکھ تیرا آئینہ ہوں میں

نشاط و درد کے ہر حال میں ہُوا محسوس
کہ جیسے دُور کھڑا خود کو دیکھتا ہوں میں

تو یاد ہے تیرا کوئی حوالہ یاد نہیں
وفا جفا کے وہ قصے بھلا چکا ہوں میں

سلیم کس کو بتاؤں ابھی سے کیا ہوں میں
ابھی تو کارِ تمنا کی ابتدا ہوں میں
تری کشش سے ترے گرد رقصِ شوق میں ہوں
جو قُرب سے نہیں گھٹتا وہ فاصلہ ہوں میں
مری شکست سے تو بھی بکھر نہ جائے کہیں
مجھے سنبھال کے رکھ تیرا آئینہ ہوں میں
نشاط و درد کے ہر حال میں ہُوا محسوس
کہ جیسے دُور کھڑا خود کو دیکھتا ہوں میں
تو یاد ہے تیرا کوئی حوالہ یاد نہیں
وفا جفا کے وہ قصے بھلا چکا ہوں میں

ہے تیری طرح مشکل مجھ کو بھی بدل جانا
تقدیرِ محبت نے دونوں کو اٹل جانا
یاں ترکِ سفر ہی سے منزل نئی ملتی ہے
رستے میں ٹھہر جانا اور دور نکل جانا
پروانوں کے جینے کا اسلوب پسند آیا
شب رقصِ جنوں کرنا اور صبح کو جل جانا
میں گل تو نہیں لیکن نازک ہوں سوا گُل سے
اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا

میں اُس کو بھول گیا تھا وہ یاد سا آیا
زمیں ہلی تو میں سمجھا کہ زلزلہ آیا

پھر اس کے بعد کئی راستے کئی گھر تھے
وہ موڑ تک مجھے رُک رُک کے دیکھتا آیا

میں اس کو ڈھونڈنے نکلا تو میرے جانے کے بعد
گلی گلی مجھے گھر تک وہ پوچھتا آیا

جدا ہوئے تو زماں و مکاں کے بُعد کے ساتھ
جو راہ میں تھا دلوں میں وہ فاصلہ آیا

میں آئینہ تو نہیں ہوں پہ ایک سوچ میں ہوں
تُو خود نمائی کے جوہر کہاں چھپا آیا

سلیم ترکِ رہ و رسم ترکِ عشق نہیں
جدھر سے گزرے ادھر اُس کا راستا آیا

عشق جبرِ حال کا پابند ہے
گھر میں رہیے راہِ صحرا بند ہے

دامنِ مژگاں بھی نم ہوتا نہیں
آنکھ میں آشوبِ دریا بند ہے

اس پہ کیا پگھلیں کہ دل پتھر ہوا
اس پہ کیا روئیں کہ رونا بند ہے

ایک اک پتی میں گلشن ہے اسیر
ایک اک ذرے میں صحرا بند ہے

شہرِ ناپُرساں ہے شہرِ ادراک کا
کوئے آگاہی کا رستا بند ہے

ایک قطرہ خشک آنکھوں کی سبیل
اور اِس قطرے میں دریا بند ہے

بند رہنے دو تصور میں انہیں
اِن اُجاڑ آنکھوں میں دنیا بند ہے

تُو دن کی طرح نکل رہا تھا
سورج تھا کہ آنکھ مل رہا تھا

جنگل میں لگی ہو آگ جیسے
یوں میرا وجود جل رہا تھا

تو برف کی طرح رفتہ رفتہ
حدت سے مری پگھل رہا تھا

موسم کی طرح ہوا کی صورت
ہر آن میں تو بدل رہا تھا

پرچھائیں کی طرح گھٹتا بڑھتا
میں بھی ترے ساتھ چل رہا تھا

دنیا پہ نگاہ پڑ رہی تھی
میں غم سے ترے سنبھل رہا تھا

ہرچند ہوائیں تیز تر تھیں
پر میرا چراغ جل رہا تھا

اب جس کا اُتار ہیں دو عالم
وہ نشہ تو ایک پل رہا تھا

بے نگاہی کا ترے دل پہ اثر ہو شاید
دل کی تسکین یہی ترکِ نظر ہو شاید

تیری آنکھوں نے مناظر کو کیا ہے زندہ
میری جانب بھی کبھی تیری نظر ہو شاید

کوئی رستہ نظر آئے تو ٹھٹک جاتا ہوں
سوچتا ہوں کہ تری راہگزر ہو شاید

میری منزل جسے سمجھی ہے شکستہ پائی
پھر یہیں سے کوئی آغازِ سفر ہو شاید

آگے بڑھتا ہوں ٹھٹکتا ہوں پلٹ آتا ہوں
جس کو چھوڑ آیا ہوں پیچھے مرا گھر ہو شاید

قضا لیتی ہے ہر شے کا حساب آہستہ آہستہ
اُترتے ہیں زمینوں پر عذاب آہستہ آہستہ

سبب یا مصلحت کھلتی نہیں لیکن یہ حیرت ہے
جرائم تیز تر اور احتساب آہستہ آہستہ

کسی کو کیا دلوں کو بھی خبر ہونے نہیں پاتی
بدل جاتی ہے چشمِ انتخاب آہستہ آہستہ

تو اے محوِ نظر یہ رازِ خدوخال کیا جانے
کہ بن جاتا ہے ہر چہرہ نقاب آہستہ آہستہ

یہ تیرے اہلِ دنیا صرف بیداری کے قائل ہیں
بنادے ان کو بھی مانوسِ خواب آہستہ آہستہ

پتا چلتا نہیں اب کون سا ٹکڑا کہاں کا ہے
کہ گڈمڈ ہوگئے تعبیر و خواب آہستہ آہستہ

کشش گھر کی بُلائے گی تو کوئے نامرادی سے
پلٹ کر آئیں گے خانہ خراب آہستہ آہستہ

طلب نے خود ہی پیدا کی ہے یہ دنیا سوالوں کی
طلب ہی ڈھونڈلے گی خود جواب آہستہ آہستہ

زمیں سے دور تر ہو کر کہیں تارا نہ بن جائے
بلندی کی ہوس میں آفتاب آہستہ آہستہ

جو بات دل میں تھی وہ کب زباں پر آئی
سُنا رہا ہے فسانے فریبِ گویائی

نئے چراغ سرِ رہگزر جلا آئی
ہوائے نکہتِ گل تھی کہ میری بینائی

تو گرم رات میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھا
ذرا قریب سے گزرا تو نیند سی آئی

وہ یاد آئے تو دل اور ہوگیا ویراں
وہ مل گئے تو بڑھا اور رنجِ تنہائی

بہت دنوں سے مرا دل اُداس بھی تو نہیں
بہت دنوں سے تری یاد بھی نہیں آئی

جو بات تجھ میں ہے وہ دوسروں میں کیا ملتی
جو بات مجھ میں ہے تو نے بھی وہ کہاں پائی

سلیم قُرب سے بھی تشنگی نہیں جاتی
یہ بات ساحل و دریا نے مجھ کو سمجھائی

نایاب ہیں اتنے کہ جہاں میں نہیں ملتے
ہم کارِ گہہِ سود و زیاں میں نہیں ملتے

دیکھا ہے ہر اک حرف کے سینے میں اُتر کر
وہ معنی ناگفتہ زباں میں نہیں ملتے

سینہ میں وہ کچھ اور تھا لفظوں میں ہے کچھ اور
غم کے کئی انداز بیاں میں نہیں ملتے

صورت سے جو ظاہر ہے وہ دل میں نہیں تیرے
جو رنگ بدن میں ہیں وہ جاں میں نہیں ملتے

مجھ تک نہیں آئے تو ہدف کون تھا ان کا
جو تیر تھے ترکش میں کماں میں نہیں ملتے

خود میں نے بنائے کہ بہل جائے مرا دل
کچھ ایسے کھلونے جو دکاں میں نہیں ملتے

لے آیا ہوں میں توڑ کے شاخوں سے وفا کی
یہ پھول ترے صحنِ مکاں میں نہیں ملتے

پرسش التفات سے اور قلق سوا ہُوا
حرفِ تپاکِ حُسن میں زہر سا تھا ملا ہُوا

یوں بھی ہزار کاہشیں باعثِ اضطراب تھیں
اور تری جدائی کا زخم بھی تھا لگا ہوا

موت کی طرح دفعتاً ساعتِ ہجر آئی تھی
جیسے چراغ جل بُجھے مجھ سے وہ یوں جدا ہُوا

میرا ملالِ بے سبب تجھ پہ کہیں گراں نہ ہو
آج نہ مل کہ آج تو دل ہے بہت دُکھا ہُوا

آئینہ خانۂ جہاں میرے لیے وبال ہے
نکلا تری تلاش میں اپنا ہی سامنا ہُوا

زرد تمام برگ تھے سارے نشانِ مرگ تھے
ایسی گھٹا برس پڑی باغ مرا ہرا ہوا

بادِ بہارِ شوق نے پھول نئے کھلا دیے
روح کی تازگی نہ پوچھ سارا بدن نیا ہُوا

خون میں کچھ تو شرافت کا اثر بھی چاہیے
تیرے سرمائے میں میراثِ پدر بھی چاہیے

بے نیازی ڈھونگ ہے تجھ کو طلب ہی کچھ نہیں
زخم مجھ میں ہے تو مجھ کو چارہ گر بھی چاہیے

دیکھنا ہے کچھ تو اپنی آنکھ کا منکر نہ ہو
دیدِ منظر کے لیے تیری نظر بھی چاہیے

رنج سے افلاس کے تُو زر کا منکر ہو گیا
ورنہ جینے کے لیے تھوڑا سا زر بھی چاہیے

صرف منزل کے تعین سے نہیں چلتا ہے کام
ہر سفر کے واسطے رختِ سفر بھی چاہیے

تو نے گھر چھوڑا مگر گھر سے تعلق کو نہ توڑ
گاہے گاہے وحشتیں کم ہوں تو گھر بھی چاہیے

صرف باتوں سے جیو گے تم بھلا کب تک سلیم
زندہ رہنا ہے تو پیارے کچھ ہنر بھی چاہیے

وصل و فصل کی ہر منزل میں شامل اک مجبوری تھی
تجھ سے ملتے تو کیا ملتے خود سے بھی مہجوری تھی

وصل کے سارے لمحے جھوٹے ملنا قرضِ جُدائی تھا
ساتھ ہمارے پہلو بہ پہلو قرب کے بھیس میں دوری تھی

آہوں کی تعمیریں کی تھیں صبر کے باغ لگائے تھے
شہرِ وفا میں محنتِ جاں کی روز نئی مزدوری تھی

باتیں لاکھوں کچھ بھی کہیے لیکن اس کے بعد یہ فکر
جانے کیا کہنا بھولے ہیں کوئی بات ضروری تھی

قصہ چھیڑا مہر و وفا کا اول شب اُن آنکھوں نے
رات کٹی اور عمر گزاری پھر بھی بات ادھوری تھی

بعد میں کیا انجام ہوا یہ آگے پڑھنے والے بتائیں
اُس کی کتابِ دلداری کی پہلی جلد تو پوری تھی

کون ہوتا ہے ہمارے دلِ تنہا کی طرف
شہر کا شہر ہے اُس انجمن آرا کی طرف

تُو وہ بادل کہ برس جائے تو جل تھل کردے
میں وہ پیاسا کہ نہ دیکھوں کبھی دریا کی طرف

ایک آواز تعاقب میں رہا کرتی ہے
کوئی آسیب صدا دیتا ہے دنیا کی طرف

قافلے روز چلے جاتے ہیں گرد اُڑتی ہے
شہر آباد ہوا ہے کوئی صحرا کی طرف

لوگ مرتے ہیں فائدے پہ جہاں
میں نے کھولی وہاں دکانِ زیاں

شبِ آفاق کا چراغ ہے یہ
یہ مرا دل یہ شعلۂ رقصاں

دوستی، دشمنی، وصال، فراق
ایک لمحہ میں ہیں کئی امکاں

شہر میں تیرے روشنی ہے بہت
گھر سے نکلے تو رات جائے کہاں

ساحلوں پر سکوت ہے کتنا
آج کی رات آئے گا طوفاں

لوگ کچھ دیر آکے ٹھہرے تھے
یہ جگہ اور ہوگئی ویراں

اے حرفِ اعتبار میں سچ بولتا رہوں
بچوں کی طرح نازِ صداقت کیے بغیر

میں آئینہ نہیں ہوں پہ آئینہ کی طرح
دنیا کے رُوبرو ہوں رعایت کیے بغیر

آسودۂ بہار ہوں مانندِ بوئے گل
لالچ کیے بغیر قناعت کیے بغیر

یہ زندگی بھی کیا ہے کہ زندہ ہے آدمی
نفرت کیے بغیر محبت کیے بغیر

میں چاہتا ہوں صبر کی قوت کو جاننا
دنیا تو کیا خدا سے شکایت کیے بغیر

کیا دور ہے سلیم کہ چلتا نہیں ہے کام
توہینِ اعتبارِ شرافت کیے بغیر

آسودہ مزاجی طلب ہوں
دریا ہوں اگرچہ تشنہ لب ہوں

میں غیر کی فتح چاہتا تھا
خود اپنی شکست کا سبب ہوں

سب مجھ کو جلا کے سوگئے ہیں
میں ایک چراغِ نیم شب ہوں

ٹھہر جاتے ہیں کہ آدابِ سفر جانتے ہیں
ورنہ منزل کو بھی ہم راہگذر جانتے ہیں

نامرادانِ محبت کو حقارت سے نہ دیکھ
یہ بڑے لوگ ہیں جینے کا ہنر جانتے ہیں

شرطِ ویرانی سے واقف ہی نہیں شہر کے لوگ
در و دیوار بنا کر اُسے گھر جانتے ہیں

دیکھ اے دستِ عطا تیری غلط بخشی کو
یہ الگ بات کہ ہم چُپ ہیں مگر جانتے ہیں

ان کو تسکینِ حضر دے کہ ترے خانہ بدوش
گھر کو منجملۂ اسبابِ سفر جانتے ہیں

ہر طرف معرکۂ سود و زیاں جاری ہے
دستِ خالی کو سلیم اپنی سپر جانتے ہیں

خود اپنی ذات میں پیکارِ کفر و دیں ہُوں میں
گماں ہوں وہم ہوں تشکیک ہوں یقیں ہُوں میں

میں بے نیاز ہوں محرومِ مدعا نہ سمجھ
کہ ایک دستِ طلب زیرِ آستیں ہُوں میں

سفر تمہاری ہی جانب ہے کوئی منزل ہو
تمہارے نام سے منسوب ہوں کہیں ہُوں میں

جسے اُجاڑ گئے اُس کی بستیوں والے
خود اپنے لوگوں سے محروم سرزمیں ہُوں میں

ہر ایک سمت سے پڑتی ہے کشت و شہ مجھ کو
سلیم خانۂ شطرنج میں مکیں ہُوں میں

منزل کا پتا ہے نہ کسی راہگذر کا
بس ایک تھکن ہے کہ جو حاصل ہے سفر کا

مدّت سے خدا بھی نہیں آیا مرے دل میں
بچوں کی طرح بھول گیا راستہ گھر کا

اِس راز کو اے تشنہ لباس فاش نہ کرنا
یہ سامنے دریا ہے کہ دھوکا ہے نظر کا

اِس راہِ سکوں میں تو سلیم آئے نہیں تھے
معلوم نہیں آج ارادہ ہے کدھر کا

کمی تو گرمیٔ گفتار میں نہیں آئی
مگر وہ بات جو اظہار میں نہیں آئی

جو موجِ رقصِ جنوں بے قرار ہے مجھ میں
وہ تیری شوخیِ رفتار میں نہیں آئی

بنا دے توڑ کے مجھ کو، ابھی وہ سفاکی
مزاجِ یارِ کم آزار میں نہیں آئی

ہمیں نہ ٹھہرے یہ کچھ اور بات ہے ورنہ
کمی اس آنکھ کے اصرار میں نہیں آئی

ترا سخن ہے کہ جلتے چراغ ہیں سرِ شام
یہ روشنی مرے اشعار میں نہیں آئی

تھی کبھی وسعتِ اندیشہ بیاباں کی طرح
آج ہر لمحۂ موجود ہے زنداں کی طرح

جانے کس رات کوئی نیند کی مانند آجائے
چشمِ بے خواب ہے دروازہ امکاں کی طرح

ربطِ شیرازۂ تخلیق بہم ہے ہم سے
پھر بھی ہم لوگ ہیں اوراقِ پریشاں کی طرح

دشتِ بے آب کے مانند مری تشنہ لبی
اور تُو میرے لیے ابرِ گریزاں کی طرح

کوئی خواہش بھی نہیں ہے تو یہ کیا شے ہے سلیم
تیرے سینے میں کسی شعلۂ لرزاں کی طرح

یوں نہ سیکھا تھا گریز اہلِ سفر نے پہلے
قافلے آتے تھے منزل پہ ٹھہرنے پہلے

میرے اندر جو خموشی تھی وہ باہر گونجی
دلِ ویراں کی خبر دی مجھے گھر نے پہلے

کھیل طفلی میں کئی اور تھے لیکن مجھ کو
اپنا دیوانہ کیا رقصِ شرر نے پہلے

بڑھ گئی بات تو دل کو مرے الزام نہ دے
سخن آغاز کیا تیری نظر نے پہلے

خبر دُوری منزل تو کسے تھی لیکن
حوصلہ ہار دیا اہلِ سفر نے پہلے

اب خزاں میں کسی طائر کی تمنا بھی نہیں
سائے پھیلائے بہت شاخِ شجر نے پہلے

سرفروشانِ محبت کی ادا تو دیکھو
طلبِ زیست میں نکلے ہیں یہ مرنے پہلے

نقشِ دنیا طلبی یوں نہ اُترتا تجھ میں
کردیا موم تجھے آتشِ زر نے پہلے

ہوش منزل کا بہت بعد میں آیا ہے سلیم
مجھ کو دیوانہ کیا راہگذر نے پہلے

بجھ گئی آگ محبت کی مگر باقی ہے
ایک بیتابیِ جاں رقصِ شرر کی صورت
شاخ در شاخ ہے بڑھتی ہوئی تاریکیِ جاں
رات اُگ آئی ہے سینے میں شجر کی صورت
اب یہ سوچا ہے کہ منزل سے کریں ترکِ نظر
اور دیکھیں نہ کبھی راہگذر کی صورت

تجھ سے ملنے سے بھاگتا ہوں میں
اپنی خواہش سے ڈر گیا ہوں میں
شام کا بوجھ اٹھ نہیں سکتا!
کیا کہوں کتنا تھک چکاں ہوں میں
پہلے تنہائیوں سے وحشت تھی
اب تو مانوس ہوگیا ہوں میں
تجھ کو صورت سے جانتا ہوں مگر
نام کیا ہے یہ بھولتا ہوں میں
جن سے آئینہ بھی گریزاں ہو
ایسے چہروں کو دیکھتا ہوں میں
دور کے قافیے کی طرح سلیم
کبھی خود کو بھی سوچتا ہوں میں

تو ہے خاشاک تجھے آتشِ گل سے کیا کام
بو الہوس دائرہ شعلۂ رقصاں میں نہ جا

نقشِ جاوید اسی ساعتِ امروز میں ہے
دوش و فردا کے لیے وقتِ گریزاں میں نہ جا

جانے کس نے سرِ دیوار جلایا ہے چراغ
رات کا وقت ہے اس خانۂ ویراں میں نہ جا

شامِ اقرارِ محبت یہ ترا قصدِ وداع
دیکھ کیا جشنِ چراغاں ہے دل و جاں میں نہ جا

میں رہا ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ساتھ
ہر تعلق نے مجھے زخمی کیا

رات بھر پرچھائیوں سے جنگ کی
میرا دشمن ایک مٹی کا دیا

ٹکڑوں ٹکڑوں میں بسر کرتا ہوں عمر
لمحہ بھر کو جی اُٹھا پھر مر گیا

جیسے ہمسائے ہوں میرے شہر کے
خواہشیں باہم نہیں ہیں آشنا

میں کسی سے کیا وفا کرتا سلیم
میں نے اپنے ساتھ بھی دھوکا کیا

آمدِ شامِ وصل ہے ہجر کی دوپہر گئی
تپتی چھتوں پہ دُور تک دھوپ جو تھی اُتر گئی

صورتِ یارِ دل نواز ویسے بھی جاں فریب تھی
آئینہ خیال میں اور بھی کچھ سنور گئی

دورِ حیاتِ عشق میں اتنے تو مہرباں نہ تھے
دیکھ تو اے تپاکِ حسن آج کہاں نظر گئی

مرگِ وفا کا سانحہ مجھ پہ عجب گزر گیا
اس پہ یہ فکرِ جاں گداز اُس کو اگر خبر گئی

صورتِ یارِ ماہرُو خال بہ خال مُو بہ مُو
یاد تھی مجھ کو ہُوبہُو دھیان سے اب اُتر گئی

شکوۂ جبرِ ہجر کیا حسرتِ وصل بھی نہیں
جس کے تھے سارے سلسلے خواہشِ زیست مر گئی

نازِ تشنہ لبی سے مجھے
ایک ہوئے ہیں آب و سراب

وصل میں کیا تسکین ملے
موج ہے دریا میں بیتاب

سب کی اپنی اپنی رات
سب کے اپنے اپنے خواب

اک لمحہ میں کھنچ آیا!
ساری عمر کا پیچ و تاب

کشاکشِ دل و دنیا کو تیز کرتا رہا
طلب اُسی کی اُسی سے گریز کرتا رہا

سکوں کہ جانِ عمل ہے اُسے نصیب کہاں
ہوس پرست بہت جست و خیز کرتا رہا

امیدِ زخم تھی جس سے وہ دستِ قاتل بھی
اجل فریب تھا خنجر کو تیز کرتا رہا

اپنی حدودِ ذات سے اپنی ہی سمت ہوں رواں
آپ ہی میرِ کارواں آپ ہی گردِ کارواں

زہر ہے میرے جام میں ہونٹوں پہ آ گئی ہے جاں
ذائقۂ حیات سے اینٹھ گئی مری زباں

دہر پہ میں کھلا نہیں مجھ کو خدا مِلا نہیں
آپ ہی اپنا راز ہوں آپ ہی اپنا رازداں

حُسن کو چھو کے دیکھنا آگ تھا موم کے لیے
روح پگھل کے رہ گئی جسم ہوا دھواں دھواں

گوشِ گلِ بہار میں کس نے کہا ہے حرفِ شوق
کون ہے میرا ترجماں کس کو ملی مری زباں

رفتہ رفتہ تری یادوں سے بسر جاؤں گا
ایک یکجائی کا لمحہ ہوں گزر جاؤں گا!

در و دیوار کی یہ قید مرا گھر تو نہیں
در و دیوار سے نکلوں گا تو گھر جاؤں گا

ایک ٹوٹا ہوا شیشہ ہوں مجھے مت چھونا
میں ذرا ٹھیس لگے گی تو بکھر جاؤں گا

ایک پتھر کی طرح دستِ ہنر مند میں ہوں
ضرب تیشے کی پڑے گی تو سنور جاؤں گا

ایک دو پل کے لیے ہوں تری دیوار کی دھوپ
شام ہوگی تو اندھیروں میں اُتر جاؤں گا

میں نے سوچا تھا جلاؤں گا صداقت کے چراغ
کیا خبر تھی کہ ہوا دیکھ کے ڈر جاؤں گا

زیست کیا چیز ہے اک کارِ تعلق ہے سلیم
بے تعلق رہا ایسا تو میں مرجاؤں گا

مجبوریوں کا پاس بھی کچھ تھا وفا کے ساتھ
وہ راستے سے پھر گیا کچھ دور آ کے ساتھ

قربِ بدن سے کم نہ ہوئے دل کے فاصلے
اِک عمر کٹ گئی کسی نا آشنا کے ساتھ

ساتھ اس کے رہ سکے نہ بغیر اس کے رہ سکے
یہ ربط ہے چراغ کا کیسا ہوا کے ساتھ

میں جھیلتا رہاں ہوں عذاب اس کا عمر بھر
بچپن میں ایک عہد کیا تھا خدا کے ساتھ

پہلے تو ایک خانہ ویراں کا شور تھا
اب دل بھی گونجتا ہے خروشِ ہوا کے ساتھ

یہ رنگِ دستِ ناز یونہی تو نہیں سلیم
دل کا لہو بھی صرف ہوا ہے حنا کے ساتھ

سرِ بامِ ہَوا کب تک جلے گا
یہ مٹی کا دیا کب تک جلے گا

پرائی آگ میں جلنا ہے مشکل
جلے گا دوسرا کب تک جلے گا

چراغوں کی طرح ہاتھوں میں تیرے
ترا رنگِ حنا کب تک جلے گا

کہاں تک راستے تپتے رہیں گے
ہمارا نقشِ پا کب تک جلے گا

ہوا دشمن فضا تاریک تر ہے
چراغِ خود نما کب تک جلے گا

کہا میں نے کہ میں جلتا ہوں غم سے
ان آنکھوں نے کہا کب تک جلے گا

سلیم اپنی نوائے آتشیں سے
دلِ نغمہ سرا کب تک جلے گا

سرِ بامِ ہَوا کب تک جلے گا
یہ مٹی کا دیا کب تک جلے گا

پرائی آگ میں جلنا ہے مشکل
جلے گا دوسرا کب تک جلے گا

چراغوں کی طرح ہاتھوں میں تیرے
ترا رنگِ حنا کب تک جلے گا

کہاں تک راستے تپتے رہیں گے
ہمارا نقشِ پا کب تک جلے گا

ہوا دشمن فضا تاریک تر ہے
چراغِ خود نما کب تک جلے گا

کہا میں نے کہ میں جلتا ہوں غم سے
ان آنکھوں نے کہا کب تک جلے گا

سلیم اپنی نوائے آتشیں سے
دلِ نغمہ سرا کب تک جلے گا

زندگی عشق کے سب سود و زیاں بھول گئی
کارِ دل بھول گئی کارِ جہاں بھول گئی

دربدر ٹھوکریں کھاکر مری آشفتہ سری
لوٹ کر آئی تو خود اپنا مکاں بھول گئی

اب کبھی آئے تو بیگانہ گزر جاتی ہے
شامِ فرقت تری یادوں کا سماں بھول گئی

کیا خبر سوچتے ہوں ماؤں کے بھیگے آنچل
ذائقہ دودھ کا بچوں کی زباں بھول گئی

جنسِ راحت کا خریدار بناکر مجھے عمر
لے کے بازار میں آئی تو دکاں بھول گئی

یادِ یاراں شبِ تنہائی ہجراں میں سلیم
اک دیا تھا کہ جلا کر سرِ جاں بھول گئی

ہمیں بھی یاد ہے عالم جو بزم یار میں تھا
دلِ خراب وہاں تو کسی شمار میں تھا

سبب یہ ہے مری بڑھتی ہوئی اُداسی کا
میں شام ہی سے نئے دن کے انتظار میں تھا

مجھے خبر نہ ہوئی یہ ہوا کی سازش تھی
وہ اک غنیم کا لشکر تھا جو غبار میں تھا

وہ چاہتے تھے مگر میرے دوست کیا کرتے
مرا نصیب تو دشمن کے اختیار میں تھا

مرے جنوں کا کسی فصل سے نہیں پیوند
خزاں میں بھی وہی عالم ہے جو بہار میں تھا

قرب کیسا یہ جسم و جاں میں ہے
پھر بھی اک فصل درمیان میں ہے

صرف میں ہی نہیں اُداس اتنا
اک ستارہ بھی آسمان میں ہے

سنگ باری سی شب کو ہوتی ہے
کوئی آسیب اس مکان میں ہے

ڈھونڈتا ہوں ہدف نہیں ملتا
ایک ناوک مری کمان میں ہے

دیکھیے صبح کیا دکھاتی ہے
رات سے کچھ مرے گمان میں ہے

حرف سے دل جھلنے لگتے ہیں
ایک شعلہ مری زبان میں ہے

اک خریدار پوچھتا ہے سلیم
مال کتنا تری دوکان میں ہے

غنیمِ وقت سے مصروفِ کار زار میں ہے
یہ حوصلہ مرے عشقِ ستیزہ کار میں ہے

نویدِ وصل مجھے دی ستارہ بینوں نے
کہ جیسے یہ بھی ستاروں کے اختیار میں ہے

ہر ایک سے مرا اندازِ دوستی ہے الگ
مرا حریف بھی شامل مری قطار میں ہے

ہر اک زمانے میں اسلوبِ تازہ تر کی تلاش
عجب سلیقہ ہوس کو نشاطِ کار میں ہے

مری نگاہ تو امکاں تلاش کرتی ہے
جو گُل کھلا نہیں وہ بھی مری بہار میں ہے

وہ اپنے زیرِ قدم آفتاب رکھتے ہیں
وہاں چراغِ سرِ راہ کس شمار میں ہے

حیاتِ نو یونہی صورت پذیر ہو شاید
ہزار طرح کا امکان انتشار میں ہے

پہلے سنتے تھے اب تجربہ ہوگیا اک خلل آگیا ہے خور و خواب میں
یاد آیا کہ یونہی نظر آئی تھی میرؔ کو بھی تو اک شکل مہتاب میں

مجھ کو بیتابیوں میں سکوں کب ملا جلتی آنکھیں ہیں بیداریوں کا صلہ
عمر اس کی تلاش و طلب میں کٹی اک دنیا نظر آئی تھی خواب میں

مضطرب کر رہا ہوں میں ماحول کو کچھ سوالات سے جیسے بچہ کوئی
گہرے پانی میں ایک کنکری پھینک دے اور ہلچل سی مچ جائے تالاب میں

اب تو اک بے تہی ہے مری روح میں اور ویران سا ہے سوادِ نظر
سوچتا ہوں نئے موسموں میں کہ تھیں کتنی گہرائیاں چشم پُر آب میں

عصر نو میں ترے کرب کو جھیلتا صبحِ فردا کے غم میں سلگتا رہا
جیسے کوئی دیا جل رہا ہو کہیں ایک ویران مسجد کی محراب میں

چاند سے پوچھتی ہے ہوائے سحر اے نگہدارِ شبِ ناظر خشک و تر
ساحلِ بحر سے سر پٹکتا رہا کون تھا رات بھر موجِ بیتاب میں

صد کار بے محل میں گنوایا گیا جسے
میں وہ دیا ہوں دن میں جلایا گیا جسے

یہ بارشیں کہیں مری دیوار ڈھا نہ دیں
عمروں کے صرف میں ہے بنایا گیا جسے

صدیوں کی یادگار عمارت یہی تو تھی
تعمیرِ نو کے شوق میں ڈھایا گیا جسے

آخر اُسی نے خشک کیا رودِ نیل کو
بچپن میں پانیوں میں بہایا گیا جسے

سونے سے بھی سوا ہے وہ آہن مزاج شخص
محنت کی بھٹیوں میں تپایا گیا جسے

سماعتوں کو امینِ نوائے راز کیا
میں بے سخن تھا مجھے اس نے نئے نواز کیا

وہ اپنے آپ ہی نادم ہے ورنہ ہم نے تو
تلاش اس کی ہر اک بات کا جواز کیا

یہ اس نگاہ کی ایمائیت پسندی ہے
جو سامنے کی تھیں باتیں انہیں بھی راز کیا

بدن کی آگ کو کہتے ہیں لوگ جھوٹی آگ
مگر اِس آگ نے دل کو مرے گداز کیا

یہاں ہوا سے بچا کر چراغ رکھے ہیں
مکاں کے بند دریچوں کو کس نے باز کیا

میں تھا چراغ تو نے صلہ کیا دیا مجھے
میں جل بجھا تو بزم سے اٹھوادیا مجھے

اس راستے میں جو بھی ملا مہرباں ملا
ہر نخلِ سایہ دار نے سایہ دیا مجھے

مجھ پر بہت گراں تھی یہ شامِ مغائرت
بچوں نے اپنی باتوں میں بہلادیا مجھے

اس خوف سے سڑک پہ برہنہ نکل نہ آؤں
اپنا لباس دنیا نے پہنادیا مجھے

پیغام اس بدن کے بہت صاف صاف تھے
لیکن مرے شکوک نے دھوکادیا مجھے

کچھ بھی مری زباں پہ نہ تھا راست کے سوا
میں کیا کروں کہ وقت نے جھٹلادیا مجھے

میں آئینہ تھا عکسِ صداقت کے واسطے
لیکن غبارِ وقت نے دُھندلادیا مجھے

جو لے گئی بہا کے اُسی موج نے سلیم
میں ڈوبنے لگا تو سہارا دیا مجھے

سلیم نغمہ بجاں ہوں فغاں کے موسم میں
عجیب پھول کھلے ہیں خزاں کے موسم میں
یہ کونپلیں مری حیرت کی تہہ سے پھوٹی ہیں
نمو یقیں کی ہُوئی ہے گماں کے موسم میں
وہ حرفِ تازہ جو گُل سا کھلے کہاں سے ملے
مجھے یہ پھول ملا ہے زیاں کے موسم میں
سلیم شاخِ ہنر میں کھلا گُلِ نایافت
بہار آئی غمِ رائیگاں کے موسم میں

وہ اشاراتِ ترک و طلب جل گئے
جو ملاقات کے تھے سبب جل گئے
آگ چہرے سے آنکھیں سلگنے لگیں
بوسۂ گرم سے میرے لب جل گئے
اب تو سورج بھی تارے بھی تاریک ہیں
وقت کی آگ میں روز و شب جل گئے
اب دھویں کی فصیلوں میں تنہا ہوں میں
میرے سارے رفیقانِ شب جل گئے
وہ زمستاں کی شب اور بدن کی وہ آگ
جس میں سب میرے رنج و تعب جل گئے

موجِ ہوا کو لکھنے والا پیروں کی زنجیر لکھے
بات وہی ہے ایک غزل کی میں لکھوں یا میؔر لکھے
رات بڑھے تو بجھتے جائیں یہ تقدیر دلوں کی ہے
ایک دیا ہوں ایسا بھی جو راتوں کی تقدیر لکھے
عصمت و عصیاں راز ہیں دونوں کوئی تو ان کے بھید بتائے
میری کتابِ عشق و ہوس کی کوئی تو تفسیر لکھے
میں نے خواب جو دیکھے ہیں میں اُن کو لکھ لکھ ہار گیا
اب مرے بعد کا لکھنے والا خوابوں کی تعبیر لکھے

***

میں وہ خس ہوں کہ مری اصل تہِ خاک میں ہے
پر مری شاخ سرا پردۂ افلاک میں ہے
بادِ گلزار کبھی میری طرف سے بھی گزر
مرا مسکن بھی یہیں کے خس و خاشاک میں ہے
میں نہ سوچوں تو پریشان خیالی نہ رہے
میری وحشت کا سبب خواہشِ ادراک میں ہے
اِک بگولے کی طرح مجھ کو لیے پھرتی ہے
جانے کیا شے ہے جو بیتاب مری خاک میں ہے
شاخِ سرسبز سے دھوکے میں نہ آنا لوگو
دیکھنا آتشِ سیال رگِ تاک میں ہے

***

جو منحرف تھے انہیں کو گواہ میں نے کیا
سلیمؔ سب سے بڑا یہ گناہ میں نے کیا

جو میرے رنگ تھے سب موقلم کی نذر کیے
نہ کچھ بھی فرقِ سپید و سیاہ میں نہ کیا

یہیں سے خوابِ زلیخا کی راہ جاتی ہے
سو اپنی راہ میں تعمیر چاہ میں نے کیا

کھُلا نہ عصمت و عصیاں کا رازِ سربستہ
اسے نہ چاہ کے کیسا گناہ میں نے کیا

بس اس کے بعد مرے تیرے راستے ہیں الگ
کہ اپنی حد سے زیادہ نباہ میں نے کیا

بس ایک لمحۂ احساس میں سمٹ آیا
جو عمر بھر میں غم گاہ گاہ میں نے کیا

صبح سے جاگنا شام تک جاگنا، شام سے جاگنا تا سحر جاگنا
چشمِ بے خواب یہ تیری تقدیر ہے تیری تقدیر ہے عمر بھر جاگنا

میرے ادراک کی انتہا بے نشاں میرے احساس کی سرحدیں بیکراں
منزلِ خواب کا اک مسافر ہوں میں اور ہے میرا رختِ سفر جاگنا

جب ذرا دو پہر دھوپ ڈھلنے لگے جب ذرا شام کے سائے بڑھنے لگیں
درد کی موج جب دل میں اُٹھنے لگے تم بھی اے میرے دیوار و در جاگنا

یہ عدم ہے کہ ہے اک شبِ بیکراں سلسلہ ہے عدم کا کہاں سے کہاں
اور میسر ہوا ہم کو اس رات میں اک دیئے کی طرح مختصر جاگنا

راحتِ یک شبی خواہشِ نفس کی بال کھولے شرارے اڑاتی رہی
دیکھ دشتِ بلائے ہوس ہے یہی رہ کے ہشیار اے ہم سفر جاگنا

یہ سانحہ جو ہوا کب مرے قیاس میں تھا
مگر یہ حوصلہ میرا کہ میں حواس میں تھا

میں جانتا ہوں کہ میری شکست سے پہلے
مری سپاہ کا ہر لشکری ہراس میں تھا

وہ سانحہ مجھے بچپن کا یاد ہے اب تک
کہ میرے گھر میں جو آیا سیہ لباس میں تھا

مجھے گلہ نہیں ناقدریٔ زمانہ کا
میں ابتدا سے نگاہِ گہر شناس میں تھا

وہ حادثہ جو ہُوا اس کا رنج کیا کرتا
جو ہونے والا تھا وہ بھی مرے قیاس میں تھا

اتر گیا ترا چہرہ جواب کیا دیتا
یہ کیسا زہر مرے حرفِ التماس میں تھا

نگہ ملی تو دلوں کے چراغ بجھنے لگے
سلیم کیسا اثر تیری چشمِ یاس میں تھا

کیسی تیرہ شبی ہے آنکھوں میں
روشنی بجھ گئی ہے آنکھوں میں

تیرا چہرہ مرا ستارہ ہے
اس سے کچھ روشنی ہے آنکھوں میں

آنکھوں آنکھوں میں کیسی بات کہی
خامشی بولتی ہے آنکھوں میں

شہر میں قحطِ آب ہے لیکن
شکر ہے کچھ نمی ہے آنکھوں میں

سو رہی ہیں سکوں نما پلکیں
زندگی جاگتی ہے آنکھوں میں

تیرے دل میں یہ یاد ہے کس کی
ایک پرچھائیں سی ہے آنکھوں میں

اس کے خوابوں میں جاگتا ہوں سلیم
ایک دنیا نئی ہے آنکھوں میں

شب نوردانِ محبت پہ نظر رکھتا تھا
میں چراغ اپنے سدا جانب در رکھتا تھا

مری آشفتہ مزاجی کی تو کچھ بات ہے اور
وہ تو باہوش تھا دنیا کی خبر رکھتا تھا

اب سفینے کو مرے سمتِ سفر کون بتائے
ڈوبنے والا ستاروں پہ نظر رکھتا تھا

گھر بنا ہے کوئی اندیشۂ سیلاب مجھے
میں کہ دیوار ہی رکھتا تھا نہ در رکھتا تھا

کیا خبر تھی کہ اندھیروں میں بھٹک جائے گا
وہ ستاروں کو سرِ راہگذر رکھتا تھا

کم عیارانِ زمانہ نے مری قدر نہ کی
میں تہی دست سہی نقدِ ہنر رکھتا تھا

ترے خیال سے پیکر نئے بناؤں گا
میں اس دیئے سے ہزاروں دیئے جلاؤں گا

کہ جیسے روشنیاں روشنی میں گم ہو جائیں
اسی طرح تجھے اک دن میں بھول جاؤں گا

مرے رفیق ملیں گے مجھے الاؤ کے گرد
وہاں میں اپنے فسانے انہیں سناؤں گا

مرے چراغ سے جو چاہے روشنی لے جائے
میں دوسروں کے لیے کیوں اسے بجھاؤں گا

میں روشنی ترے چہرے سے اخذ کرتا ہوں
میں آئینہ ہوں تو سورج تجھے بناؤں گا

میں جانتا ہوں یہ دنیا تو ایک دھوکہ ہے
مگر یہ بات کہوں میں تو کون سنتا ہے
ہجوم کوچہ و بازار میں خبر کس کو
کہ اس ہجوم میں ہر آدمی اکیلا ہے

میں بھول جاؤں تجھے یہ نہ ہوسکا مجھ سے
اگرچہ تُو نے کہا اور میں نے چاہا ہے
ٹٹولتا ہوں میں بستر پہ تیرے ہاتھوں کو
کہ خواب دیکھ کے جاگا ہوں اور اندھیرا ہے

میں پوچھتا ہوں مگر تو مجھے جواب نہ دے
یہ کون ہے جو مرے راستے میں آیا ہے
گلی کے موڑ پہ اک شخص نے کہا مجھ سے
ادھر نہ جاؤ کہ یہ راستہ اکیلا ہے

ہوا میں غول پرندوں کے دے رہے ہیں خبر
کہ دشتِ خشک میں پانی کا ایک چشمہ ہے
اگرچہ کھوئی ہے اک شے مری اندھیرے میں
وہاں میں ڈھونڈ رہا ہوں جہاں اجالا ہے

ہوائے صبح کے مانند ایک عمر کے بعد
سلگتی آنکھوں پہ یہ کس نے ہاتھ رکھا ہے
پتنگ لُوٹ کے بچے کہیں سے لائے ہیں
یہ میرے ہاتھ میں کن فاصلوں کا ڈورا ہے

سلیم ویسے تو یہ گھر ہے خانۂ ویراں
وہ کون ہے جو یہاں یہ دیا جلاتا ہے

تیری آنکھوں کے دیئے جلنے کو ہیں
یہ طلسمی آئینے جلنے کو ہیں
ٹھہر جا کچھ دیر شامِ انتظار
غم کے سارے سلسلے جلنے کو ہیں
رتجگوں سے میری آنکھیں جل گئیں
اب یہ میرے رتجگے جلنے کو ہیں
ان گھنے پیڑوں کے سائے کیا ہوئے
دھوپ سے اب راستے جلنے کو ہیں
آگ صحرا کی گھروں تک آگئی
بام و در اس شہر کے جلنے کو ہیں
راستے ہیں اور بے چینی کی آگ
قافلوں کے قافلے جلنے کو ہیں
دن کا سورج شام کو جل بجھ گیا
اور ستارے رات کے جلنے کو ہیں
دھیان آیا ہے گمانوں کا مجھے
جب یقین کے مرحلے جلنے کو ہیں
تیز تر ہے آتشِ شوقِ وصال
میرے تیرے فاصلے جلنے کو ہیں

ہے ٹھہرنا یہی کہ مسلسل سفر کیا
وہ ایک رہگزر تھی جسے ہم نے گھر کیا

کس راہ سے گئے ہیں ترے رہروانِ شوق
پہنچے تو دور اور سفر مختصر کیا

دل میں جو خاک اُڑتی ہے اس کی خبر کسے
ہم نے تو اعتبار ترا چشمِ تر کیا

اک کشمکش مقیم و مسافر کی مجھ میں تھی
میں نے مکاں بنا کے اسے رہگزر کیا

باغِ جہاں میں نشو و نمائے امید ہے
وہ ایک برگ تھا جسے ہم نے شجر کیا

غارتگرِ سکوں ہے یہ دورِ تغیرات
اس میں تو منزلوں نے بھی قصدِ سفر کیا

نازک بہت تھا کام مگر وقت نے سلیم
پتھر کے دل تھے جن کے انہیں شیشہ گر کیا

جانکاہیوں میں عمر کو اپنی بسر کیا
جینا کہ عیبِ عشق تھا ہم نے ہنر کیا

اہلِ ہوس بھی ساتھ تھے منزل تلک مگر
جب وہ قیام کرچکے ہم نے سفر کیا

ایک تیز رَو ستارۂ شب آفریدہ تھا
گم کردگانِ رہ نے جسے راہبر کیا

کم فرصتیٔ شوق کا حاصل یہی تو ہے
غم کارِ رایگاں ہے مگر عمر بھر کیا

آسودگیٔ خانہ نشیناں کو کیا خبر
کس دشتِ ہولناک میں ہم نے سفر کیا

دنیا کی سیر بھی انہیں راہوں میں ہوگئی
حالانکہ ہم نے تجھ سے تجھی تک سفر کیا

یاں کاوشِ سخن میں مری عمر کٹ گئی
واں اس نے کچھ کہا نہ سنا دل میں گھر کیا

اس جسم نے تغیرِ آب و ہوا کے ساتھ
کیا کیا نہ رنگ بدلے ہیں رنگِ قبا کے ساتھ

وہ بادباں یہ بادنما دونوں اور ہیں
حالانکہ رخ بدلتے ہیں دونوں ہوا کے ساتھ

ہونا ہے اس کو خونِ شہیداں سے تربتر
رشتہ مری زمیں کا بھی ہے کربلا کے ساتھ

اک وادیٔ سکوت میں خود کو پکارتا
میں دور جارہا ہوں خود اپنی صدا کے ساتھ

وہ رات کیسی رات تھی پر یوں لگا مجھے
جیسے کہ صبح ہوگئی حرفِ دعا کے ساتھ

چونکا تھا کیسے خواب سے کل رات میں سلیم
لیکن بحال ہوگیا دل تجھ کو پا کے ساتھ

میں جسم کی طلب پہ پشیماں تھا اب کھلا
وہ میری جان تھی جو تمہارے بدن میں تھی

سب چل رہے ہیں کوئی پہنچتا نہیں کہیں
اک رہگزر کا پھیر ہے ورنہ سفر کہاں

اس کاروبارِ شوق کا انجام کچھ نہیں
مصروفیت بہت ہے مگر کام کچھ نہیں

تھاہ ملتی نہیں دل کی کوئی
اس میں آفاق کی گہرائی ہے

وہ یوں مجھ سے جدا ہوتا ہے جیسے
کوئی کروٹ بدل لے سوتے سوتے

مرے وجود میں دیروز بھی ہے فردا بھی
مگر میں اپنے تعلق سے ہوں فقط امروز

اندھیرے کے گھنیرے حاشیوں میں
یکایک روشنی آئی کہاں سے

سکوتِ نیم شبی کی اداس گہرائی
سمٹ کے بن گئی ہے تیری گفتگو اب کے

جوشِ گریہ سے تلاطم ہے دل و جاں میں نہ جا
جتنے عرصے میں اتر جائے یہ سیلاب ٹھہر!

روح میں نم ہو تو اگنے کے لیے
ایک ہی لمحے کی ہے فرصت بہت

رنجِ تنہائی نہیں جاتا سلیم
آئینہ خانے میں ہم صورت بہت

جس کی کوئی تعبیر نہیں وہ خوابِ تمنا ڈھونڈ رہی ہے
دل کے اندر اندھی خواہش اپنا رستا ڈھونڈ رہی ہے

کس انجمنِ گل کی لگن ہے کہ چمن میں
نکلتا ہی نہیں پاؤں نسیمِ سحری کا

مجھ میں تجھ میں فرق ہے اے بوالہوس
جو تری منزل وہ میرا راستا

نہ فراق ایسا فراق تھا نہ وصال ایسا وصال تھا
جسے ہم نے عشق سمجھ لیا فقط ایک طرزِ خیال تھا

شر کا احساس ہو کہ خیر ملے
خود کو دیکھوں جو چشمِ غیر ملے

میں وہ سفاک آنکھیں چاہتا ہوں
جو خود کو دیکھنے کی تاب لائیں

کبھی اقرار کی لذت نے جگائے رکھا
کبھی اندیشہ انکار نے سونے نہ دیا

چراغِ نیم شب

اِنتساب

اطہر نفیس کے نام

جو میرے لئے ہمیشہ زندہ رہے گا

بہ پائے جستجو چوں آبلہ خوں گشت منزل ہا

سراج منیر

روایانِ روایت کا کہنا ہے کہ واقعہ میرٹھ میں پیش آیا جہاں کے قینچی، کباب اور کرار حسین مشہور ہیں۔ فسادات کا زمانہ تھا۔ عسکری، انتظار حسین اور سلیم احمد چلے جا رہے تھے۔ شہر میں سکھ شرنارتھیوں کے گروہ وارد ہونا شروع ہو چکے تھے اور قتل و غارت کا آغاز ہو گیا تھا۔ یکایک ایک جٹا دھاری سکھ ہاتھ میں کرپان لئے آتا دکھائی دیا۔ عسکری صاحب نے کہا "کیوں بھئی کوئی اس سے بات کرنے کی ہمت کر سکتا ہے؟" انتظار حسین کی تو خوف سے گھگھی بندھ گئی، البتہ سلیم احمد نے کہا میں اس سے خطرناک بات کہہ کر واپس آ سکتا ہوں۔ یہ کہا اور سکھ کے پاس پہنچ گئے۔ اس کی کرپان کا بغور معائنہ فرمایا اور کہنے لگے "کیوں بھئی یہ کرپان بیچتے ہو، کتنے کی ہے؟" ایک تو سکھ اوپر سے شرنارتھی! آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ سلیم احمد نے کہا "معاف کرنا یار ذرا غلط فہمی ہو گئی تھی۔" یہ کہا اور یہ جا وہ جا۔ اس وقت سے آج تک سلیم احمد کا طور بدلا نہیں۔ ادبی تنقید میں آئے۔ جہاں کوئی سکھ کرپان لئے دکھائی دیا، اسکے پاس پہنچ گئے۔ "کیوں بھئی تنقید بیچتے ہو۔" اُدھر اُس کے منہ سے کف جاری ہوا اور آپ واپس عسکری صاحب کے پاس۔ "دیکھئے میں اسے چڑا آیا۔" ہر بار انتظار حسین کی خوف سے گھگھی بندھ جاتی ہے۔

مجھے پہلے فقرے میں میرٹھ کے مشاہیر ثلاثہ گنوانے کی ضرورت نہ پڑتی، اگر یہ چیزیں سلیم احمد کی شخصیت میں یکجان نہ ہو جاتیں۔ فولادی قینچی کی کاٹ، کباب کی تیز مرچیں اور کرار صاحب کی نکتہ آفرینی اور تجزیاتی مہارت۔ یہ ہیں سلیم احمد کی شخصیت کے ابعاد ثلاثہ۔ میں نے یہ بات اتنی سہولت سے کہہ دی جیسے اس کے ذریعے سلیم احمد کی پوری شخصیت گرفت میں آ جائے گی، حالانکہ اس شخص نے اپنے آپ کو اس قدر بکھیر رکھا ہے کہ چند صفحوں میں کیا، کتابوں میں سمیٹنا محال ہے۔

بکھیرنے کی اصطلاح بھی میں نے ان کے درد مند دوستوں سے مستعار لی ہے، جو ان کی غیر موجودگی میں ایک اندوہ کے ساتھ سر ہلا ہلا کر اس لفظ کا وِرد کرتے ہیں۔ ورنہ سلیم احمد سے زیادہ منظم آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ اخبار کے کالم سے شعر تک، ڈرامے سے تنقیدی مضمون تک، سیاسی مضامین سے مابعد الطبیعیاتی مباحث تک، ہر چیز یا تو ایک اصول کے تحت مربوط ہے یا ہو رہی ہے۔ اس شخصیت کے اندر ایک زبردست مرکز گریز اور اتنی ہی قوی مرکز جو قوت بیک وقت عمل پیرا ہے اور ہر لمحے ان کے درمیان ایک نئے نقطۂ توازن کی دریافت کا نام سلیم احمد ہے۔ سوچنے والے کے لئے پرانے پٹاخے کی طرح سیل جانا یا بم کی طرح پھٹ کر تباہی پھیلا دینا دونوں چیزیں آسان ہوتی ہیں۔ وہ جو ادب میں بہت طمطراق سے داخل ہوئے تھے اور اب عرصے سے یوں ہیں کہ ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔ وہ پہلی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جو یوں آئے جیسے برق خاطف گرتی ہے مگر لمحے بھر بعد کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ وہ دوسری قسم سے ہیں۔ اصل میں مشکل کام ایٹمی ری ایکٹر بنے رہنا ہے۔ تابکار رہنا اور تابکاری پھیلاتے رہنا، اس میں شخصیت ٹوٹتی رہتی ہے اور جڑتی رہتی ہے۔ ذرہ ذرہ ٹوٹتا ہے اور پھر جڑتا ہے۔ اتنی حدت پیدا ہوتی ہے کہ لوہے کو گیس بنا دے لیکن اس کا براہِ راست ظاہر ہونا ممنوع ہے۔ یہ اپنی آگ میں خود کو بار بار پگھلانے اور بار بار ڈھالنے کا عمل ہے۔ ایسا عمل کہ زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک۔ فی زمانہ یہ کام خود گری اور خود شکنی کا نا مختتم عمل سلیم احمد کے حصے میں ہی آیا ہے، ورنہ اکثر کا عالم تو یہ ہے کہ شخصیت کا جو بت ۱۸ سال کی عمر میں بن گیا، تاعمر اسی کے سامنے سر بسجود رہے اور اسی کے معبد کے دائرے کو وسیع کرتے رہے۔ مجھے احساس ہے کہ ری ایکٹر والی مثال سے اس تحریر میں ذرا رومانوی خطابت سی پیدا ہو گئی ہے، لیکن یہ اس لئے ضروری ہے کہ تحریر "کلاسیکیت کے سرطان" سے محفوظ رہے۔

ایلیٹ نے اپنی نظم میں آدھی سطر بہت مزے کی لکھ دی ہے To fix in a formulated phrase لکھنے والوں کی رائج الوقت تفریح یہی ہے۔ ترقی پسند، رجعت پسند، کلاسیکی، رومانی، جدید پرست، روایت پسند۔ کیا کیا مُہریں ہیں جو الگ الگ لفافوں پر لگی ہوئی ہیں اور یہ سب لفافے اپنے اپنے پوسٹ بکسوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو اس بات کی پروا نہیں ہے کہ لفافے کے اندر کاغذ

کے ٹکڑے پر لکھا گیا ہے۔ نگاہ صرف پوسٹ بکس نمبر دیکھتی ہے اور ہاتھ مہر لگاتے ہیں۔ اس صورت حال میں اگر کسی کو Formulated Phrase میں متعین نہ کیا جاسکے تو ایک لمحے کو سارا عمل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کا پتھریلا پن اور ہاتھوں کی میکانیکی حرکت، دونوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ مہر بیکار ہو جاتی ہے اور ذہن سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ کون ہے۔ اس کی شناخت کیا ہے، اسے کس خانے میں رکھوں۔ اگر ایک قدم اور آگے بڑھ جائے تو اگلا سوال ہوگا۔ میں کون ہوں؟ یہی شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنے والا معاملہ ہے۔ آدمی یہاں تک پہنچنے کے خوف سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مُہر لفافے پر رسید کر دیتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ غلط کر رہا ہے، مگر دوسرا راستہ شناخت کی طرف جاتا ہے۔ عذاب کی طرف جاتا ہے۔ ایک لفافے نے مشینی آہنگ سے جاری یکسانیت کو توڑ دیا۔ مُہریں لگانے والا زیر لب گالیاں دیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ۔ ٹھک ٹھک، ٹھک ٹھک۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو Crystallise نہیں ہونے دیتے، زندگی کی طرح متحرک رہتے ہیں، متغیر، ہمہ وقت نئے امکانات کے جویا۔ وہ معاشرے کے لئے شناخت کا مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ جلاد اگر ایک لمحے کو پوچھ لے کہ تختہ پر کون ہے تو دوسرا سوال اس کے اپنے بارے میں ہوگا۔ میں کون ہوں؟ پھر وہ نوکری سے جائے گا۔ ادب میں یہ سوال پوچھ کر آدمی شاعری سے جاتا ہے، تنقید سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ محض یہ جاننے کے لئے کہ میں کون ہوں۔ برسوں کی محنت اکارت نہیں کی جاسکتی۔ آپ دیکھتے نہیں لوگ عسکری صاحب سے کس قدر ناراض رہتے ہیں کہ وہ اپنی رائے بدل لیا کرتے تھے۔ ان کا ذہنی طور پر زندہ اور متحرک رہنا لوگوں کے لئے شناخت کا مسئلہ پیدا کرتا تھا اور ان کی عیاشی۔ Fix in formulated phrase. میں مخل ہوتا تھا۔ سلیم احمد، عسکری صاحب کی طرح رائے نہیں بدلتے لیکن ان سے کہیں زیادہ Elusive ہیں۔ ان کے ہاں متضاد عناصر یکجان ہونے کی کوشش میں ہیں۔ ایک ماوراء اور منزہ اصول کے تحت، لفافے والی تشبیہ آگے بڑھایئے، اس لفافے پر سارے پوسٹ بکس نمبر لکھے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان ایک سری فیثا غوری کلید ہے۔ لیکن مُہریں لگانے والے کو کیا پتا۔ بیچارہ بھونچکا ہو گیا ہے اور اب زور زور سے گالیاں دے رہا ہے، لفافے کو، پوسٹ بکس نمبروں کو اور گاہے گاہے خود کو بھی۔ رائخ نے لکھا ہے کہ جب میں

تحلیلِ نفسی کے ذریعے کسی شخص کو اسکی شخصیت کے مرکز سے قریب کرنے لگتا ہوں تو اس کا پہلا ردعمل شدید غصے کا ہوتا ہے اور اکثر وہ مجھ پر ہی بگڑ بیٹھتا ہے۔ سلیم احمد بھی ہمارے معاشرے کے ماہر نفسیات ہیں۔ پاؤنڈ نے جو کہا ہے نا کہ معاشرہ سب سے زیادہ فنکار کے چلبلے پن سے ڈرتا ہے۔ وہ اسی لئے کہ چلبلا فنکار اسے اس کی مرکزی شخصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ لگام سے کھینچ کر نہیں، ہشکار ہشکار کے۔ بعضے بزرگ اس میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔

معاشرے کے ماہر نفسیات ہونے کا دعویٰ بہت لوگوں کو ہوتا ہے۔ یہ ایک ذہنی بیماری ہے Paranoid formation کی قبیل سے۔ خبطِ عظمت۔ سلیم احمد کو یہ دعویٰ نہیں ہے، وہ تو بس اپنی شخصیت کے تانے بانے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ذات کے گرد ایک حجاب سا بنتے ہیں، پھر ادھیڑ کر اس کا معائنہ کرتے ہیں۔ انہیں دھاگوں سے پھر ایک نیا پیٹرن بناتے ہیں، پھر اس میں کچھ اور نقش ونگار رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا دوبارہ ادھیڑ کر اسے پھر ایک نئے انداز میں بُننا شروع کرتے ہیں۔ یہ Penelope والا طریقۂ کار ہے۔ یونانی دانش کی ازلی تلاش Know Thyself ذات کے اصل اصول تک پہنچنے سے پہلے پہلے تک یہ چیز جاری رہنی چاہیے۔ جس دن اصل اصول کی بازیافت ہو جائے گی، اس دن چادر بھی مکمل ہو جائے گی۔ چونکہ یہ تانا بانا معاشرے سے، تاریخ و تہذیب سے، ادب سے، شاعری سے فراہم ہوا ہے لہٰذا اس کے مطالعہ کے ضمن میں ہر سرچشمہ آجاتا ہے۔ یہاں ہر تنکے کا معاملہ یہ ہے کہ ہوا ریشہ نیستاں کا۔ انسانی تاریخ و تہذیب کی گہرائی میں سفر کرنے کے معنی میں ہیں اپنی ذات کی تہوں میں اترنا اور ایک تہہ سے دوسری تہہ تک پہنچنے کا مطلب ہے سنگین دیوار میں در بنانا۔ اپنے آپ کو توڑ کر، کاٹ کر اسے سمجھنا اور اُسے ایک شکل دینا۔ یہی سلیم احمد کی بنیادی تلاش ہے۔ اسی مرکزی نقطے سے سارے دائرے پھوٹتے ہیں اور ایک ہی نقطے کے گرد وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ متضاد سمتوں کو سمیٹتے ہوئے، عناصر مختلفہ کو ایک مرکزی حوالہ دے کر مربوط اکائی بناتے ہوئے۔ کسری آدمی سے مکمل آدمی تک سفر ہی اس زمانے کا سلوکِ علمی ہے۔ دائرہ، مرکز اور محیط کی علامتوں کے ذریعے Operate کرتا ہے۔ کسری آدمی کی شخصیت کا اصول مستطیل اور مربع ہے۔ مربع کے ساتھ مربع جوڑ دیجئے، ایک اقلیدی شکل وجود میں آجائے گی لیکن اس کا کوئی

مرکزی اصول حیات نہیں ہوگا۔ حیاتیاتی سانچے ہمیشہ دائرے کی شکل میں حرکت کرتے ہیں۔
"کسری آدمی کا سفر" سلیم احمد کا معرکہ آراء نظریہ تو ہے ہی، ہمارے زمانے کی اہم ترین کلید بھی یہی
ہے۔ کچھ لوگ اس دعوے سے جزبز ہوں گے۔ لیکن ان کی ناراضگی قابلِ فہم ہے۔ کسریت سے
اضافیت پیدا ہوتی ہے اور معاشرے میں اضافیت ذاتی انا کے ذریعے روبہ عمل آتی ہے۔ اضافیت زدہ
ذہنی فضا میں Superlative کا استعمال بہت ناگوار ہوا کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں مطلق کی
مشابہت پائی جاتی ہے جو اضافیت کے لیے مہلک ہے۔ اس خطرے کے باوجود میں اصرار کرتا ہوں
"کسری آدمی کا سفر" اردو تنقید میں مابعد الطبیعاتی پیمانے کا نظریہ ہے۔ منظم، مربوط، اہم ترین!

بیسویں صدی میں انسانی اکائی کی شکست ایک ایسی نمایاں صورتِ حال ہے جس کی طرف کم و بیش ہر بڑے لکھنے والے نے اشارہ کیا ہے۔ بعض اس اصل عمل کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں اور بعض اس کے نتائج کی طرف۔ اس میں بیسویں صدی کی قید بھی غیر ضروری ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت نمایاں اشارے دکھائی دے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں قطبین بہت حد تک واضح ہو گئے ہیں اور اس شکست کی خشتِ اول نشاۃ علوم کے دور میں رکھی جا چکی ہے۔ ہملٹ میں اس کے ابتدائی نقوش مل جائیں گے۔ Time is out of joint انیسویں صدی میں نطشے کے ہاں شخصیت کے اندر ایک بہت Explosiveq قوت کی موجودگی کا احساس واضح ہے۔ مگر ادب کی سطح پر اس کے ابتدائی نقوش ہارڈی کے ہاں ہیں یا پھر لارنس نے تو اس کا بیان بہت شرح وبسط سے کیا ہے۔ لارنس کے ہاں سارے تصورات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ شرح وبسط سے کیا ہے۔ لارنس کے ہاں سارے تصورات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کا مقصد ہی لارنس نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ پورے آدمی کا قصہ بیان کرے۔ صرف روح، محض جسم یا ذہن نہیں۔ یہ سب کچھ ایک ساتھ، ایک تناظر میں۔ لارنس کا یہ احساس بہت سچا ہے لیکن اس کی نظریہ سازی غلط ہے۔ لارنس کے پہلو بہ پہلو نفسیات کے سارے دبستان انسان کا مطالعہ جس انداز میں کرتے نظر آتے ہیں وہ بھی اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے۔ نفسیات نے انسان کی تقسیم جس طرح مختلف خانوں میں کی اس میں وہ اہم ترین نکتے کا جواب دینے سے قاصر رہی۔ حقیقتِ انسانیہ کیا ہے، وہ کیا مرکز ہے جس کے گرد انسانی ذات کے یہ دائرے

ترتیب پاتے ہیں۔ نفسیات کا انسان آخرالامر ایک حیوانی وجود ہے۔ یہ علم انسانی کو حیاتیاتی اصطلاح
سے آگے نہیں پہچان پاتا۔ انسان کے ضمن میں "He himself" کی اصطلاح استعمال کرکے اس کی
تشریح میں رائج نے وہ غوطے کھائے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔ کاش یہ لوگ دنیا کی کسی روایت میں
حقیقتِ انسانیہ سے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کرلیتے۔ اسلام نہ سہی، ہندومت تو رائج کے
تقریباً گھر کی چیز تھی، عیسائیت کے حوالے بھی کم موجود نہیں تھے۔ لیکن یہ سارے نفسیات داں بار
بار اصرار کرتے ہیں کہ یہ سب تجربی صداقتیں ہیں۔ درست۔ ہم ان کی محنت کو سلام کرتے ہیں۔
لیکن تجربی صداقت کبھی مکمل سچائی تک یا حقیقت تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس کا دائرہ کار Fact ہے۔
خیر اس گریز کے بعد ہم اصل مسئلے یعنی کسری انسان کے اس تصور کی طرف لوٹتے ہیں جو سلیم احمد
نے پیش کیا ہے۔

"نئی نظم اور پورا آدمی" لکھتے وقت سلیم احمد کو مسئلے کی اصل نوعیت کا فہم تھا۔ اردو ادب میں وہ
اس کے اطلاقات سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن اس معاملے کی جڑیں کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں
اس کا واضح اندازہ اس مضمون میں نظر نہیں آتا۔ تاہم یہ نظریہ ان کے اندر اپنی تفصیلات واضح کرتا
رہا اور ان تحریروں کے علاوہ بھی، جو براہ راست اس مسئلے پر لکھی گئی ہیں، سلیم احمد کے پورے کام
کے پس منظر میں اس نظریے کی کارفرمائی بہت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے آدمی کی شکست کا
جو نقشہ مرتب کیا ہے، اسے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری تاریخ کو سمیٹ دیا ہے لیکن اس نظریے
میں تاریخ کے علاوہ بہت کچھ ہے۔ عین ممکن ہے اس تصور کی ابتدائی شکل انسان اور آدمی کے اس
فرق میں ہو جس پر عسکری صاحب بہت زور دیا کرتے تھے۔ لیکن سلیم احمد کے ہاں پہنچ کر کسری
انسان کے تصور میں اس کی شکل اور ہی بن گئی ہے۔ عسکری صاحب پر ہم ذرا ٹھہر کر گفتگو کریں
گے۔ سلیم احمد کا سارا فکری منظر نامہ حقیقت انسانیہ کے گرد تشکیل پاتا ہے اور درجہ بندی کے تصور
کے ذریعے ایک مظہریاتی حقیقت بنتا ہے۔ آدمی کی شخصیت میں شکست کا یہ عمل ان کے نزدیک
ایک کائناتی اصول کی شکست ہے۔ جس سے ایک طرف عدم توازن پیدا ہوا دوسری طرف انسان
اجزاء میں منحصر ہو کر رہ گئے۔ اجزاء میں منحصر ہو جانا، فوق و تحت سے عاری ہو کر، افقی یا عمودی طور

پر کسی ایک کیفیت وجود میں مقید ہو جانے کا نام ہے۔ یہ چیز بنیادی انسانی فطرت کے خلاف ایک طرح کی Solidification پیدا کرتی ہے۔ چونکہ کائنات میں انسان فعلیاتی حقیقت ہے اس لیے وہ تمام انسانی مظاہر جن کا اجرائے فعل اس کیفیت کے بعد کا ہے، وہ سب کے سب انسانی ریزگی کا آئینہ بن گئے۔ حقیقت انسانی کے گم ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ حقیقتِ کائنات بھی گم ہو جائے۔ نفسیات کی دنیا میں بھی اجزاء میں منحصر ہو جانے والی بات زیر بحث آئی ہے۔ مثلاً Jung کے ہاں Personae کے تصور سے بحث دیکھ لیجیے۔ شعری تنقید میں ایلیٹ نے جو بحث انعدامِ شخصیت کے ضمن میں کی ہے اس کے ڈانڈے بھی کم و بیش اسی تصور سے جا ملتے ہیں اور بحث میں لارنس کا حوالہ تو خود سلیم احمد نے دیا ہے۔ یہاں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ جس چیز کو ہم حقیقت انسانیہ کا مرعوب کن نام دے رہے ہیں، اس کے گم ہونے سے فرق کیا پڑتا ہے۔ کیا اس اکائی سے ہمیں ایک جذباتی محبت ہے۔ اس کے دو جواب ہیں، ایک تو مابعد الطبیعاتی جو میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہاں سے اپنے الفاظ میں نقل کر رہا ہوں اور دوسرا نفسیاتی۔ حضرت نے فرمایا ہے کہ انسان مجموعہ ہے تمام مخلوقات کا، تمام اجزائے خلق اس میں مرتب ہوئے ہیں۔ لیکن مجموعہ ہونا بجائے خود کوئی شرف نہیں ہے۔ انسان میں اس کے علاوہ ایک اور شے ہے۔ یعنی اس کی ہیئتِ وحدانی۔ یہی ہیئتِ وحدانی اس کے شرف کا سبب ہے۔ اس سے معلوم یہ ہوا کہ انسان جب اجزاء میں منحصر ہوتا ہے تو اپنے شرف سے ہاتھ دھولیتا ہے اور اپنی ہیئت وحدانی سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ ہیئت تمام اجزاء کو شامل بھی ہے اور سب سے منزہ بھی۔ اور اب یہ بات اپنی طرف سے تشریحاً کہتا ہوں کہ غالباً یہ ہیئتِ وحدانی ہی وہ عنصر ہے جس کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا، یا یہ کہ اس میں اپنی روح پھونکی۔ کسی ایک جز میں انحصار اس بے کیف و بے مثل عنصر سے محرومی کا باعث ہے جس پر حقیقتِ انسانیہ کا مدار ہے اور جو عالمِ خلق کی طرف سے امر کو جانے والا راستہ ہے۔ اس شے کی گمشدگی ایک انسانی نہیں بلکہ کائناتی المیہ ہے، اس لیے کہ کائنات کے تمام اجزا و عناصر کی معرفت کی تکمیل اسی ہیئت وحدانی کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس چیز کا اطلاق ادب اور دیگر مظاہرِ خیال پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں اس تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے۔ اب آیئے نفسیاتی تعبیر کی

انسان کو بحیثیتِ وجود ایک اصول کا تابع ہونا چاہئے اور ذات کے کسی حصے کو اس اصول سے باہر نہیں رہنا چاہیے۔ اگر کوئی حصہ اس اصول سے آزاد ہو جائے تو اس سے Neurosis کی کیفیات پیدا ہوں گی۔ لیکن یہ کب ممکن ہے۔ اسی صورت میں جب مرکزی اصول منزہ ہو اور ذات کی ساری تہوں کو سمیٹ سکتا ہو۔ اگر کوئی اصول انسانی فطرت میں موجود کسی امکانیئے کو مسترد کرتا ہے تو وہ منزہ نہیں ہے بلکہ وہ فطرت میں ترمیم و تنسیخ کر کے اسے ایک خارجی دباؤ کے تحت لانا چاہتا ہے۔ یہیں سے "ضابطۂ حیات" کی اصطلاح پیدا ہوتی ہے۔ انسانی فطرت میں ترمیم و تنسیخ کرنے کی کوشش سخت خطرناک ہے، اس لیے کہ فطرت انسانی کے عناصر کائناتی فطرت سے متعلق ہیں لہٰذا کسی عنصر کو منہا کر دینا انسان اور حقیقت خالقیت کے درمیان ایک بُعد پیدا کر دینے کے مترادف ہے۔ یہاں اس ساری گفتگو سے مراد اس نظریے کی شرح و تفصیل نہیں۔ وہ سلیم احمد خود کر چکے ہیں اور میں اس پر مزید کیا اضافہ کر سکتا ہوں۔ یہ باتیں ضروری اس لیے تھیں کہ اس تصور کی محیط حیثیت کا پس منظر ذہن میں رہے اور یہ واضح ہو جائے کہ سلیم احمد جب اپنے اس نظریے کا اطلاق کسی تہذیب، شاعر یا شخصیت پر کرتے ہیں۔ تو ان کی گفتگو کو نفسیاتی تنقید کی ایک فرع سمجھنا پرلے سرے کی غلطی ہوگی۔ اس تصور کا صرف ایک پہلو نفسیاتی اصطلاحوں میں کلام کرتا ہے ورنہ اس کی سطحیں درجہ وار، تہذیب، تاریخ اور علوم و فنون سے گزرتی ہوئی اس مابعد الطبیعاتی سطح تک جا پہنچتی ہیں جسے ہم نے انسان کی ہیئتِ وحدانی کے نام سے پہچانا ہے۔ سلیم احمد کا خیال یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی مرکزی اکائی کی شکست نے انسان کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی ذات کے کچھ پہلو چُن کر ان کے ذریعے اپنی شناخت متعین کرے اور باقی پہلوؤں کو مسترد کر دے۔ اس طرح انسان جز در جز تقسیم ہوتا ہوا آج کی فلزاتی صورت حال میں پہنچ گیا ہے۔ یہی حال شعری اور ادبی تاریخ کا بلکہ تسلسلِ تہذیب کا ہے۔ انسان کی وسیع اکائی رفتہ رفتہ گم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا جو اثر پڑتا ہے اس کی طرف تو اشارہ ہو چکا، انسانی شخصیت میں اس اکائی کی موجودگی کے تہذیبی اثرات کیا ہوتے ہیں اس پر ایرانی ماہر نفسیات، ایرخ فرام کے چہیتے شاگرد، رضا آراستہ کی بات سنئے۔ رضا آراستہ کا کہنا ہے کہ ادنیٰ سطح سے اعلیٰ ترین سطح تک ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ شخصیت میں اکائی کی نوعیت سے وابستہ ہے۔

اعلیٰ ترین اکائی کے حصول کے بعد ان کے نزدیک انسان ایک بین التہذیبی شخصیت بن جاتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے Trans-cultural personality کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ان کے نزدیک اس کی مثال رومی اور گوئٹے ہیں۔ رضا آراستہ نے بھی اپنے نظریے کی بنیاد اُنہیں عناصر پر رکھی ہے۔ جن سے سلیم احمد نے اپنے اساسی مقدمات ترتیب دیئے ہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ میں اس معاملے میں بولنے والا کون۔ لیکن ذرا دونوں کو پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ آراستہ نے ایک تو اتنی بھیانک غلطیاں کی ہیں کہ آدمی پڑھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ دوسرے منطقی ربط اور اصولی وسعت کے نقطہ نظر سے بھی ان کا نظریہ سلیم احمد کے قائم کردہ اصول اور تجزیے کے سامنے بچوں کا کھیل ہے۔ مگر آراستہ صاحب انگریزی میں ارشاد فرماتے ہیں، سلیم احمد "اردو کے ایک نیم خواندہ ادیب ہیں۔"

میں نے اس گفتگو میں بار بار نظریہ اور تصور کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ بڑی گمراہ کُن حرکت ہے اور اس کا ازالہ چاہیے بلکہ بقول سلیم احمد ازالہ چونکہ ممکن نہیں ہوتا لہٰذا امالہ کیا جاتا ہے۔ انسان کی کسریت سلیم احمد کا نظریہ نہیں ہے، ان کا تجربہ ہے۔ یہ اُن کے لیے ایک وجودی حقیقت ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی کسریت سے لڑنے اور اکائی کی مختلف منزلوں کو طے کرنے کی کوشش میں گزرا ہے۔ اگر آپ اس جوکھم کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو میں آپ سے پوچھوں گا کیا آپ نے زنجیری ردِ عمل والا ایٹمی ری ایکٹر اندر سے دیکھا ہے؟

سلیم احمد کی شخصیت کے اتنے پہلو اور اتنی جہتیں ہیں کہ ان کے درمیان ایک مرکزی اصول دریافت کرنا پہلی نظر میں مشکل ہوتا ہے۔ اور اگر آپ ایک مرتبہ وہ اصول دریافت کرلیں تو پھیلے ہوئے دھبوں اور غیر مربوط لکیروں کا یہ معمورہ ایک وسیع تصویر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ نقاد، شاعر، کالم نگار، ڈراما نگار، فلم رائٹر، مناظرہ باز، سیاسی تجزیہ نگار اور سب سے بڑھ کر اپنے کمرے میں احباب سے ہر شام گفتگو کرنے والا شخص اور احباب کے رخصت ہو جانے کے بعد صبح تک کمرے میں ٹہل ٹہل کر سگریٹ پھونکتا ہوا سوچ کو زندگی بنانے کے عمل سے گزرنے والا بد قسمت آدمی۔ اس ایک ذات میں سینکڑوں پہلو باہم دست و گریبان ہیں۔ سلیم احمد ان سب کو سمیٹ لینا چاہتے ہیں، کسی کو مسترد نہیں کرنا چاہتے اور ایسا کسی دیرینہ رقیق القلبی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ

یہ اُن کے نزدیک زندگی کی شرط ہے۔ اس میں معاش کی صورت برہم ہوتی ہے تو ہو، کہ پورا انسان معاشی انسان نہیں ہوتا، اعصاب جواب دیتے ہیں تو دے جائیں کہ آدمی اعصاب کے جال کا نام نہیں ہے، دوستوں اور ادیبوں سے تعلقات خراب ہوتے ہوں تو گوارا کہ ایک سطحی تعلق سے اس کا نہ ہونا بہتر۔ زندہ رہنا۔ کف پا سے سرِ شوریدہ تک، مکمل، منظّم اور مربوط سلیم احمد کا مقصود ہے۔ یہ شخص پورے معاشرے کا فرض کفایہ ادا کرتا ہے اور مکمل زندگی اس کی مزدوری ہے۔ سلیم احمد کے بارے میں کچھ لکھنا مشکل یوں بھی ہوتا ہے کہ حقیقت نگاری بھی مبالغہ آمیزی معلوم ہوتی ہے۔ یہ طے کر لینے کے بعد کہ کسری آدمی کی صورت حال سلیم احمد کا نظریہ نہیں بلکہ ان کا حال ہے، ہم ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور جوڑ کر دیکھنے کے لیے ایک بہتر پوزیشن میں آگئے ہیں۔ شکستہ باطن آدمی کا تجزیہ آسان ہوتا ہے۔ ایک ایک چیز اٹھاتے جائیے، تجزیہ کر کے اس کی جگہ پر سجاتے جائیے، مربوط اور منظّم شخصیت کے سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا۔ تو اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ آغاز کہاں سے کریں۔ شاعری۔ کوئی شے مجھ میں مجھ سے بھی بڑی ہے!

میؔر کے بارے میں ایک قول بہت مشہور ہے، ضرب المثل کی حد تک۔ لپش بغایت پست، بلندش بغایت بلند۔ افسوس کہ اس قدر معرکہ آراء فقرہ لکھ سکنے والے شخص سے لوگ ایسی بدذوقی کی بات منسوب کرتے ہیں اور اس قول کے معنی یہ نکالتے ہیں کہ میؔر کے گھٹیا شعر بہت گھٹیا ہیں اور اچھے بہت اچھے۔ حالانکہ اس فقرے کا مقصود یہ ہے کہ میؔر کے ہاں زندگی کی پست ترین سطح بھی ملتی ہے اور بلند ترین بھی۔ اسے کہتے ہیں نگاہ کی وسعت۔ یہاں اس حوالے سے مطلوب یہ نہیں کہ یہ فقرہ اٹھا کر سلیم احمد پر چپکا دوں۔ بس ایک اصول بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آدمی پست سطح پر ہی مقیم ہو جائے تو آدھا رہ جائے گا اور اگر بلند سطح کو اختیار کر کے پستی کو مسترد کر دے جب بھی آدھا رہ جائے گا۔ یہ کسریت کی دو ابعاد ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ان دونوں کو زندہ رکھے، باہم متحرک تعلق میں وابستہ رکھے۔ اور ان کے ارتباط سے:

گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم

کی کیفیت میں رہے۔ اس اصول کے خلاف جانے کو روایتِ علم شعر میں ہوسنا کی کہتے تھے:

بر کفے جامِ شریعت، بر کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے نہ داند، جام و سنداں باختن

یہ "باختن" ذرا مشکل کام ہے۔ سلیم احمد نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ صفدر میر کو تو خیر وہ پہلے ہی کب بھاتے تھے، نعیم صدیقی صاحب بھی اس امر سے پریشان ہیں کہ اس اللہ رسول ﷺ کا ذکر کرنے والے کا قلم بار بار فسق و فجور کی طرف کیوں بہک جاتا ہے۔ یہ شخص ہے کیا، نہ صافِ حقیقت نہ دردِ مجاز۔ زبانِ حال سے وہ بھی یہی کہتے ہیں۔

Fix in a formulated phrase

یہ تو ہوا معاملہ تقسیم بربنائے مواد و موقف۔ اب آیئے ہیئت اور اسالیب والوں کی طرف۔ سلیم احمد کی عام شہرت تو ایک کلاسیکی نقطۂ نظر رکھنے والے، غزل کے شیدائی کی ہے۔ لیکن ایک طرف تو ان کی طنزیہ غزلیں کلاسیکی ذوق رکھنے والوں کو نہیں پچتیں۔ وہ اسے غزل کے مزاج سے کوئی بہت بڑی Deviation سمجھتے ہیں۔ سلیم احمد کی ان غزلوں میں کن کن اساتذہ کی آواز بولتی ہے، اس کی تفصیل بعد میں، یہاں صرف مقصود یہ بتانا ہے کہ سلیم احمد کی شاعری میں ساقی فاروقی کو کلاسیکیت کا سرطان دکھائی دیتا ہے اور وہ غلط نہیں کہتے۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ کوسوں بڑھا ہوا ہے پیادہ سوار سے۔ اگر رومانویت کے نمونوں کو سامنے رکھیں تو جائز طور پر وہ بہت کم ہوں گے۔ روزمرہ کی زندگی کے مقابلے میں خواب تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ اور یہ سرطانِ اعظم ہومر سے ڈانٹے سے ہوتا ہوا مغرب میں ایلیٹ اور پاؤنڈ تک اور مشرق میں کیا کیا گناؤں۔ ایک سلیم احمد کو شہید کرنے کے لیے دنیا کی تین چوتھائی شاعری پر خطِ تنسیخ پھیر دینا ذرا غیر ذمہ دارانہ سی بات لگتی ہے۔ خیر۔ دوسری طرف لوگوں کو اسی شاعری میں جدیدیت کا عفریت بھی دکھائی دیتا ہے۔ غزل اپنی جگہ، مگر قطعات پر آیئے تو وہاں آپ کو ایک الگ مزاج ملے گا۔ اور نظموں میں کوئی اور ہی چیز دکھائی دے گی۔ ان سب سے گزر آیئے تو مشرق جو باہمدر آویزاں اسالیب اور ہیئتوں کا ایک حیران کن معمورہ ہے۔ اس تنوع کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں، وسعت یا تخلیقی غیر ذمہ داری۔ اب یہاں میں دعویٰ کرتا

چلوں کہ اس پوری شاعری کا ایک لفظ بھی ایک مربوط تناظر سے خارج نہیں ہے۔ سلیم احمد نے اپنے
مجموعے کا نام "اکائی" رکھا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ان کی پوری شاعری مختلف سطحوں پر اسی اکائی کی
تلاش ہے۔ ایک بکھرتے ہوئے جہان میں یکجا رہنے کی کوشش جو کائناتی سطح کا عمل بن گئی ہے۔ اس
پورے عمل میں المیہ ڈراموں جیسی کش مکش پائی جاتی ہے، ایک کونیاتی انتشار میں اپنی ہیئتِ وحدانی
کو برقرار رکھنے کی کوشش، جب جسم، ذہن اور روح مختلف سمتوں کی طرف ایک مرکز گریز قوت
کے زیرِ اثر ٹوٹ کر بکھر رہے ہوں، اس میں اس سے لڑنا اور انہیں یکجا رکھنے کی کوشش کرنا تو ایک
بہت بڑے ڈرامے کا ہی موضوع ہے۔

غزلوں میں اگر ہم سلیم احمد کا مزاج متعین کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کی دو سطحیں
ہوں گی۔ مواد اور موضوع کے اعتبار سے، اسلوب اور طرز کی جہت سے۔ مواد اور موضوع کے
اعتبار سے سلیم احمد کی غزلیں زیادہ تر ایک ہی حرکی رشتے میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔ فرد اور
معاشرے کا تعلق۔ فطرت کی دنیا ان کے ہاں کم سے کم دکھائی دیتی ہے۔ نہ ان کے ہاں، کم کم بادو
باراں ہے، کی کیفیت ملتی ہے اور نہ ہی صحراؤں کی وسعت اور پہاڑوں کی صلابت۔ یہ سلیم احمد کے
شعری منظرنامے کی ایک خالی جہت ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ

Proper study of mankind is man.

کے اصول کے اتنے راسخ العقیدہ مخالف کے ہاں ایک لمحہ بھی ایسا نہ ہو جب وہ انسانی مظہریات سے
باہر نکل کر سوچ سکے۔ خیر تو ہم نے بنیادی بات یہ طے کی کہ سلیم احمد کے ہاں فرد اور معاشرے کا
تعلق ایک اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اصول بھی درست نہیں ہے۔ اصل میں سلیم احمد کا شعری
مسئلہ ہے۔ تعلق، فرد کا اپنے آپ سے، اپنے غیر سے، معاشرے سے، معاشرے کے ذریعے، محبت
میں، نفرت میں، بے نیازی میں۔ سلیم احمد کی غزلیہ شاعری انسانی تعلق اور اس کی نوعیت متعین
کرنے والی قوتوں کے رزمیے کا مطالعہ ہے۔ انسانی وجود کی عمودی جہت میں یہ تعلق جسم، ذہن، روح
کی ترتیب میں الگ الگ بھی ظاہر ہوتا ہے اور ایک کلی وجودی تجربہ بھی بنتا دکھائی دیتا ہے۔ میں
یہاں مثالیں پیش نہیں کروں گا۔ آپ کے کتب خانے میں بیاض یا اکائی ہو گی، اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اگر

آپ یہ زحمت گوارا نہیں کرنا چاہتے تو براہِ کرم مضمون کا مطالعہ یہاں سے ترک کر دیجئے، لیکن غزلوں میں محض تعلق کی Modalities کے بیان کے علاوہ ایک اور بہت اہم چیز ہے جسے یوں تو کم و بیش ہر شاعر نے پوچھا ہے لیکن سلیم احمد نے اسے ایک ایسے مسلسل استفسار کی شکل دی ہے کہ یہ سوال ان کے وجود کی بنیادی تفتیش بن گیا۔ فنکار کیا ہے؟ وہ اس معاشرے میں کیا کرتا ہے، یہ اپنے فنی جوازِ وجود کی ایک مسلسل تلاش ہے اور اردو میں ایک نادر مثال۔ یہ سوال اس لیے بہت اہم بن جاتا ہے کہ فنکار انسانی تعلق کی بنیاد پر Operate کرتا ہے اور ان کی جزوی صورتوں کو جوڑ جوڑ کر ان کے اندر ایک منزہ اکائی تلاش کرتا ہے۔ جب سلیم احمد نے شاعری شروع کی اس وقت فنکار معاشرے میں اجنبی بن چکا تھا۔ یہ ایک عالمی المیے کا حصہ ہے۔ کولن ولسن کی Outsider اس کا بہت اچھا مطالعہ ہے۔ وجودیوں کے ہاں تو خیر اس کی بہت سی پرتیں کھلیں۔ خیر یہ صرف ایک فکری Contact کا معاملہ ہے۔ سلیم احمد کے ہاں اس تجربہ کا آغاز "صحرا میں اذان دے رہا ہوں" سے ہوتا ہے۔ جیسے جیسے آگے بڑھتے جائیں، یہ پہلو بہت نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کا تازہ ترین سلسلہ تو کم و بیش پورے کا پورا اسی مسئلے سے متعلق ہے۔ سلیم احمد نے معاشرے سے اپنے تعلق کو متعین کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی اپنا تعلق Define کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی معاشرتی جہت میں اب یہ احساس بہت نمایاں نظر آتا ہے کہ معاشرہ بحیثیت مجموعی فن سے بے نیاز ہو چکا ہے:

محلے والے میرے کارِ بے مصرف پہ ہنستے ہیں
میں بچوں کے لیے گلیوں میں غبارے بناتا ہوں

لیکن ایک جہت سے یہ کام کارِ بے مصرف بھی نہیں ہے:

غنیمِ وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کے لشکر بناتا ہوں

اس کے علاوہ وہ غزل جس کی ردیف "تیز ہوا کے شور میں" ہے اپنی جگہ ایک پورے تعلق کی نوعیت کو بیان کرتی ہے۔ اس میں ایک پہلو جو بہت سے شاعروں سے الگ ہے وہ اس کی بہت مضبوط فلسفیانہ

اساس ہے جو ایک مربوط تجربے سے پھوٹتی ہے اور ایک بہت بڑے تجربے کی شکل میں ہی ظاہر
ہوتی ہے۔ فن اور معاشرے کا تعلق مابعد الطبیعیاتی سطح سے لے کر عام معاشرتی سطح تک ظاہر ہوتا
ہے اور کسی طرح کی خود رحمی یا تعلّی سے پاک ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے
ہیں کیا کیا۔ سلیم احمد کی شاعری کا خمیر ایک تجزیاتی فراست سے اٹھتا ہے جسے معکوس کر دیں تو فکر کی
شکل پیدا ہوتی ہے۔ اس سے سلیم احمد نے خود جگہ جگہ بحث کی ہے، خصوصاً "غالب کون" کے بعض
ابواب میں۔ فکر کو انہوں نے تجربات کو جوڑ جوڑ کر دیکھنے کا نام دیا ہے۔ لیکن سلیم احمد کے ہاں تجربے
کو جوڑنے کا رجحان بہت کم ملتا ہے، بلکہ اس کی پرتیں الگ کر کر کے دیکھنے کا طریقہ وہ زیادہ استعمال
کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی لیے ان کی شاعری جذبے کی بہت سی سطحوں پر محیط ہوتے ہوئے بھی ایک
گھلاوٹ اور رچاؤ کا احساس کم رکھتی ہے۔ جو لوگ شاعری کو رچاؤ میں منحصر سمجھتے ہیں، ان کے لیے یہ
بڑی پریشانی کی بات ہو گی۔ انسانی تجربے کی کیفیات دو ہیں اور شاعری دونوں سے پیدا ہوتی ہے۔
ایک تو یہ کہ تجربہ انسان کی ذات میں گہرائی تک اترتا جائے۔ اس سے شاعری میں رچاؤ پیدا ہوتا
ہے۔ دوسرے یہ کہ تجربے کے تجزیے سے پیدا ہونے والی قوت ایک مرکز گریز حرکت اختیار کر
کے پوری طاقت سے ظاہر ہو، اس سے توانائی پیدا ہوتی ہے۔ سلیم احمد کی پوری شاعری انہیں دو
قوتوں کو یکجا کر دینے کا ایک مسلسل رزمیہ ہے جس میں وہ ابھی تک کامیاب نہیں ہیں۔ "میں تیرے
جسم کو دیکھوں تو نیند آنے لگے" اس میں اور "میری زبانِ آتشیں لو تھی مرے چراغ کی" میں
فرسنگوں کا فاصلہ ہے۔ کہیں کہیں یہ آوازیں ایک دوسرے کے قریب آجاتی ہیں لیکن پوری طرح
مل نہیں پاتیں اور اسی کش مکش کے نقطے پر سلیم احمد کا اہم ترین سوال پیدا ہوتا ہے۔ انسانی ذات سے
معاشرے تک گریزاں قوتوں کے درمیان فنکار کا منصب کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ سلیم احمد ان
دو آوازوں کو جوڑنے میں ہمیشہ ناکام رہیں۔ ان کی شخصیت کا اصول اکائی کا حصول نہیں، اس کی تلاش
ہے اور یہ تو درست ہے کہ بعض اوقات بہت بڑے فنی نمونے فنکار کی داخلی ناکامیوں سے پیدا
ہوتے ہیں۔ تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا۔ سلیم احمد کا یہ سارا مسئلہ ہمارے ہاں ڈرامے کی کمزور
روایت کی بنیاد پر شاعری میں بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا پس منظر ہے۔ جدید

اردو ادب کے باطن میں ایک کائناتی آویزش ہے جو بہت ڈرامائی اظہار چاہتی ہے۔ اس کشمکش کا تجربہ پہلے کی شاعری میں کہیں موجود نہیں۔ ڈراما اُس معاشرے میں پیدا ہی نہیں ہو تا جہاں چیزیں درجہ وار مابعد الطبیعاتی منطق میں گتھی ہوئی ہوں۔ اس لیے کہ ہر تضاد کا اس سے اوپر کی سطح پر حل موجود ہے۔ جب یہ کائناتی آویزش پیدا ہوئی تو ہم نے اپنا سب سے بڑا ڈراما نگار بھی پیدا کیا۔ اقبال! اگر یہ روایت آگے بڑھی ہوتی تو معاملات کی نوعیت اور ہوتی۔ بہر کیف فی الحال ہم سلیم احمد کے شعری مواد سے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کی غزل اُردو کی موجودہ شاعری میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے لیکن یہ سلیم احمد کی پوری ذات کو سمیٹ نہیں سکتی۔ سلیم احمد بنیادی طور پر مرکب صنف کے آدمی ہیں۔ غزل میں بھی وہ وہاں بہت کامیاب ہوتے ہیں جب شعر کو مکالمے کی چستی کے ساتھ موزوں کرتے ہیں۔ چنانچہ لہجے کی جتنی Variations سلیم احمد کے ہاں ہیں وہ جدید اردو ادب میں کسی شاعر کو نصیب نہیں ہیں۔ معاشرہ، فرد اور فنکار ایک مابعد الطبیعاتی پس منظر میں ایک بڑی آویزش کا شکار ہیں اور سلیم احمد نے اس کے لیے ایک مرکب صنف خود ایجاد کی۔ ادب میں کسی صنف کا موجد بہت بد قسمت آدمی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس ایجاد کو آپ ان معنوں میں نہ سمجھئے گا جن معنوں میں لوگ نثری نظم وغیرہ ایجاد کرتے ہیں۔ ''مشرق'' میرے نزدیک سلیم احمد کا ایک بہت ہی بڑا کارنامہ ہے۔ پوری نظم میری نظر سے نہیں گزری لیکن اس کے بہت سے حصے میں نے سنے ہیں۔ اپنی کلیت کو گرفت میں لینے کی یہ ایک غیر معمولی اور بہت سفاک کوشش ہے۔ اگر مجھ سے اردو کی پانچ اہم ترین نظموں کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو میں تین اقبال کی، ایک مسدس حالی اور پانچویں ''مشرق'' کا انتخاب کروں گا۔ اب ہماری گفتگو خود بخود طرز اور اسالیب کی طرف آ گئی ہے۔ مواد کے بارے میں مزید تفصیل یہاں بیان کرنی مقصود نہیں، وہ ایک الگ مضمون کا موضوع ہے۔

سلیم احمد کے ہاں غزل میں اسالیب کا تنوع اور چیز ہے، نظم میں بالکل اور چیز، لہٰذا ہمیں ایک سطح پر ان دونوں چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا ہوگا۔ ''بیاض'' کے دیباچے میں سلیم احمد نے ایک بات کہی تھی کہ میں شاعری کو شعور کی اولاد سمجھتا ہوں۔ یہ ان کے شعری تجربے کو سمجھنے کے لیے ایک کلیدی فقرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شعری عمل، اس کے عناصر پر زور اور اس کی تہذیبی

شناخت سلیم احمد کے ہاں ذات کے اندر کسی پراسرار کیمیا کا نام نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے اس بنیادی
تصور سے پھوٹتے ہیں جو ان کے ذہن میں ایک تجزیاتی وضاحت کے ساتھ راسخ ہیں۔ یہاں اگر
ایک جہت میں روایتی شعری طریقہ کار سے منسلک ہوتے ہیں اور دوسری جہت میں علیحدہ۔ منسلک
اس طور کہ روایت میں بھی شاعری علائم و رموز کے شعری انجذاب کا نام ہے اور انفرادی رویہ اے
شعر کی عمارت علوم شعریہ کے ایک بہت وسیع نظام پر استوار ہوتی ہے۔ الگ اس انداز میں ہیں کہ
ان کا شعور روایتی شعور سے الگ ہے۔ یعنی اس میں وہ کشمکش وہ آویزش اور وہ سوال پائے جاتے
ہیں جو روایتی شعورِ تہذیب میں موجود نہیں تھے۔ وہاں انفرادی اور تہذیبی شعور میں جذب ا
انجذاب کا رشتہ ہے اور یہاں گریز کا۔ جب اس گریز کو جذب میں بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس
سے وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو شعری شرر کو جنم دیتی ہے۔ سلیم احمد اپنی شخصیت میں موجود اس
جنگ کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس وقت اردو شاعری میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کے ہاں
یہ عمل اتنے وسیع پیمانے پر اتنی شدت سے جاری ہو۔ اسی سے سلیم احمد کے متنوع اسالیب شعر پیدا
ہوتے ہیں۔ روایت ان کے لیے ایک بسیط وحدانی حقیقت بھی ہے اور انفرادی پہلوؤں کا معمورہ
بھی۔ اگر وہ روایت کے بسیط پہلو کو قبول کرلیں تو یہ مسئلے کا ایک مجرد حل ہوگا لہٰذا پھر وہ اس کے
اندر موجود متنوع اسالیب کی طرف جاتے ہیں۔ یہ اسالیب طنز کے ہیں، بیانِ جمال کے ہیں، غصے
کے ہیں، اظہارِ محبت کے ہیں۔ غرضیکہ انسانی شخصیت کی کلیت، ترتیب دیتے ہیں۔ ان معنوں میں
سلیم احمد اسالیبِ شعر کے مسافر ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ انسانی نفس کی متنوع کیفیات کو
متعین استعاروں اور اسالیب میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا Infinity کو Finite میں گرفت کرنے
کی کوشش ہے۔ اس سارے کام میں سلیم احمد کے اردگرد کے شعری مزاج نے ان کی کوئی مدد نہیں
کی۔ اس لیے کہ اس کے سامنے وہ سوال ہی نہیں تھے جو سلیم احمد کے سوال ہیں۔ کہیں کہیں ہمیں
چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مل جاتے ہیں مثلاً کچھ معاملہ فراقؔ کا ہے، کچھ یگانہؔ کا، تھوڑا بہت سلیم احمد نے
حسرتؔ سے سیکھا ہے، اقبالؔ کا ذکر میں یہاں رہنے دیتا ہوں اس لیے کہ وہ معاملہ تفصیلی بحث کا
متقاضی ہے اور آگے آئے گا۔ اپنی کلیت، جس کے معنی ہیں تہذیبی واردات کی کلی درجہ وار

شناخت، کے بیان کے لیے سلیم احمد کو سب سے پہلے ایک چیز سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اردو کے ادبی مزاج نے ایک تقسیم شعری اور غیری شعری عناصر کی کر رکھی تھی۔ بعض دھندلے امیج اور مخصوص خیالات شعری سمجھے جاتے تھے اور عام زندگی کے اسالیب غیر شعری قرار پاتے تھے۔ یہ قطعیت حسب معمول ایک جدلیات میں ڈھلی۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو تغزل کا ایک محدود تصور رکھتے تھے اور دوسری طرف وہ جو صرف ان عناصر سے شاعری پیدا کرنا چاہتے تھے جو تغزل والوں نے مسترد کر دیئے تھے۔ سلیم احمد کا معاملہ یہ ہے کہ اسالیب و علائم میں تو ان کے ہاں شعری روایت کا تصور موجود ہے لیکن مواد میں نہیں۔ چنانچہ سلیم احمد نے ان دونوں گریزاں عناصر کو اپنی ذات میں جمع کیا۔ اس سے ان کے ہاں ایک الگ انداز کا لہجہ اور ایک خاص طرح کی "وِٹ" پیدا ہوئی جس کے نشانات ہمیں غالبؔ اور بہت حد تک میرؔ کے ہاں ملتے ہیں۔ سلیم احمد کے ہاں یہ عمل شعری فضا کے ردِ عمل میں نہیں بلکہ اپنے داخلی تصورِ روایت اور جدید دنیا میں اس کی آویزش سے پیدا ہونے والے سوالوں سے پھوٹتا ہے۔ اس لیے اس کے تنوع میں ایک بہت بڑی داخلی وحدت پائی جاتی ہے۔ نظم میں صورت حال یہ ہے کہ سلیم احمد نے ان عناصر کو پہلو بہ پہلو رکھ کے ایک کائنات تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظم اپنے تاثر میں شدید ہے لیکن اپنے ادبی Context کی طرف سے فرضِ کفایہ تو انہوں نے غزل میں ہی ادا کیا ہے۔ "مشرق" مجھے ایک طویل نظم سے کہیں زیادہ جوائس کے نیم منظوم ناول کی طرح کی چیز لگتی ہے۔ غزل میں اس پوری صورتِ حال کا ست کھنچ آیا ہے اور اس عمل میں سلیم احمد کو جس جوکھم سے گزرنا پڑا ہے اس کا اندازہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب آدمی اپنی ذات کے ریشے ریشے کو الگ کر کے دیکھنے کی ہمت رکھتا ہو کہ یہ کن کن نیستانوں سے آتے ہیں اور کس اصول پر مربوط ہیں۔

اردو میں آج کل خصوصاً کسی شاعر سے آپ اس کے قاری کے ردِ عمل کا ذکر کریں تو اس سے فوراً ایک Snobbery کا اظہار ہو گا۔ وہ ایک کائناتی بے نیازی کے ساتھ آپ کو بتائے گا کہ اسے اپنے قاری کی کوئی پروا نہیں ہے، وہ تو ایک تجربے کی گرفت میں ہے۔ اکثر اوقات یہ ایک بے جا تکبر اور صریح جھوٹ کی پیداوار ہوتا ہے۔ قاری سلیم احمد کا مسئلہ ہے، اس لیے کہ سلیم احمد کے پاس

قاری موجود ہیں لیکن یہ اس صورت میں نہیں کہ وہ اس کی ذہنی ساخت کے مطابق اپنے تجربے میں ترمیم کریں۔ وہ اسے ناراض کر سکتے ہیں، اسے چھیڑ سکتے ہیں، اس سے محبت کر سکتے ہیں اس سے نفرت کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن اس سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ شاعری کا مقصود ہم کلام رہنا ہے۔ صرف اپنی ذات سے ہم کلامی ایک خوش نما رومانی جھوٹ ہے۔ یہ ہوتی ہے لیکن اس کا وجود فی الخارج ہونا چاہیے۔ شاعر کی خود کلامی ہملٹ کی طرح ناظرین با تمکین کے سامنے واقع ہوتی ہے۔ اسٹیج کے پردے کے پیچھے نہیں، خیر تو سلیم احمد اس ہم کلامی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن ان کے قاری دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو ادب کی دنیا میں موجود ہیں اور سلیم احمد کی ذات میں موجود جدل کو سمجھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو بنیادی طور پر مصنفینِ کرام نہیں بلکہ ادب کے قاری ہیں۔ وہ ادب اپنی داخلی ضرورت سے پڑھتے ہیں۔ ان دونوں کے ردِ عمل مختلف ہیں۔ مصنفینِ کرام میں اکثر کا ردِ عمل یونانی ڈرامے کے ناظرین کا ہے۔ ان میں ارسطو کے اصول کے مطابق خوف اور رحم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ سلیم احمد کے اندر جو تہذیبی جنگ موجود ہے اس سے ان میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ ان کے اعصاب اس کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ پھر انہیں اپنے قبیلے کا ایک فرد جان کر وہ رحم کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ میری یہ Analogy مکمل ہے۔ اس کی مزید تفصیل بوطیقا میں دیکھ لیجئے۔ غیر مصنف قاری کا معاملہ ذرا احسان مندی کا ہوتا ہے۔ مسئلہ اس کے اندر موجود ہے لیکن وہ اپنے مسئلے کو اس طرح Live نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سلیم احمد کو پڑھتا ہے۔ سلیم احمد یہاں بھی دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔ اپنی تحریر کے بے پناہ تاثر میں!

سلیم احمد کی شعری تربیت ایک ایسے شخص نے کی جو خود مصرع موزوں نہیں کر سکتا تھا، محمد حسن عسکری۔ عسکری کا شعری مطالعہ اور تہذیبی Judgement ضرب المثل کی ذیل میں داخل ہے۔ لیکن محمد حسن عسکری کی نگاہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار کی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی نظر تجربے کے نتائج سے زیادہ اس کی نوعیتِ وقوع پر ہوتی تھی۔ یہ وہ نادر لمس تھا جو سلیم احمد کی شاعری کو نصیب ہوا۔ سلیم احمد خود کو عسکری کا شاگرد کہتے ہیں اور انہوں نے کوئی چالیس (۴۰) برس عسکری کی شاگردی میں گزار دیئے لیکن اگر ہم اسے مروجہ معنوں میں سمجھیں تو ہم ایک

ہولناک غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ عسکری اور سلیم احمد کی استادی شاگردی کا معاملہ کچھ افلاطون اور ارسطو والا ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ افلاطون وارسطو کو عسکری اور سلیم احمد سے بھڑا رہا ہوں، تعلق کی نوعیت کو سمجھنا مقصود ہے۔ سلیم احمد اور محمد حسن عسکری کے مزاج میں قطبین کا فرق ہے۔ یہ دونوں ہر چیز میں الٹ ہیں اور اسی لیے ان کا تعلق Complementary ہے۔ سلیم احمد نے عسکری کو کس کس طرح متاثر کیا، یہ ایک الگ مضمون کا موضوع ہے۔ لیکن وہ چیز جسے عسکری کا مکتبِ فکر کہا جاتا ہے، وہ ان دونوں سے مل کر ہی ترتیب پاتا ہے۔ یہ ایک مشترک Praxis ہے۔ عسکری کی نظر ادبیاتِ عالم پر وسیع تھی۔ یہ ایک دور بینی نگاہ تھی کہ جس کے سامنے زمینوں اور زمانوں کے ادب اور فلسفے پھیلتے چلے جاتے تھے۔ یہ رزمیے کا طریقہ کار ہے۔ سلیم احمد کی نگاہ خوردبینی ہے۔ انہیں ایک شعر دے دیجئے، وہ اس کی پرتیں اتارتے، اس کے تانے بانے ادھیڑتے اور اس کا تجزیہ کرتے کرتے اس کی باطنی وحدت تک پہنچ جائیں گے۔ یہ ڈرامے کا تجزیاتی طریقہ کار ہے۔ چالیس برس کا گہرا تعلق ایسا نہیں ہوتا کہ اسے میں چار سطروں میں نمٹا دوں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ سلیم احمد اور عسکری کے تعلق کو ایک جامد استادی شاگردی کا تعلق نہ سمجھ لیا جائے۔ سلیم احمد کے دعوے کے باوجود عسکری کی وفات پر سلیم احمد نے کہا کہ میں عسکری کا آدھا شاگرد ہوں، میں تو خود کو ان کا شاگرد کہتا تھا، وہ نہیں مانتے تھے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ یعنی آدھا شاگرد ہونے والی بات۔ سلیم احمد کی شخصیت کا ایک حصہ عسکری صاحب کے اثر سے باہر اپنے الگ اصولِ نمو کے مطابق پھلا پھولا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جہاں سے سوال پیدا ہوتے تھے اور عسکری کی سمت سفر متعین کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ سوال آدھا علم ہے۔ روایت، تہذیب اور جدیدیت کے بارے میں سلیم احمد کے تصورات اپنے داخلی اسٹرکچر میں عسکری صاحب کے نتائج سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ ان پر ہم کبھی اور گفتگو کریں گے۔ سلیم احمد کا معاملہ یہ ہے کہ شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا۔ وہ عسکری صاحب کا اثر ایک حد سے زیادہ قبول نہیں کر سکتے تھے اور اس اثر کو بھی وہ اپنے تجربے اور اپنی کلیت میں رکھ کر بالکل منقلب کر دیتے ہیں۔ ان کے ذہن میں بنیادی Figure اقبال کی ہے۔ یہ ان کا Substance ہے۔ سلیم احمد کی شخصیت میں اقبال اور عسکری کا اثر ان کے زایئے میں قران شمس و

زحل کی طرح ہے۔ ایک سب آگ ایک سب پانی! سلیم احمد کا بنیادی مزاج فراق کا ہے ہی نہیں، وہ اقبال کا ہے، وہی جذب و شوق، وہی سرمستی۔ دوسری طرف عسکری صاحب کی مناسبت مجردات سے کہیں زیادہ ہے۔ ان دونوں عناصر کی کشمکش نے سلیم احمد کی شخصیت میں ایک عجیب و غریب برقی چارج پیدا کر دیا ہے۔ ابھی تک یہ عناصر یکجا نہیں ہو سکے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں لیکن ان کا پہلو بہ پہلو موجود رہنا ایک بڑا تہذیبی واقعہ ہے۔ یہ فرض کفایہ سلیم احمد ہی ادا کر سکتے ہیں، اس لیے کہ معمولی اعصاب کا آدمی تو اس کششِ قطبین کے درمیان دو دنوں میں خون تھوک جائے گا۔

سلیم احمد کی شاعری اور اس کی نوعیتِ ترکیب کی طرف ان ضروری اشاروں کے بعد آیئے، ہم پھر ان کی تنقید کی طرف لوٹیں۔ شخصیات پر سلیم احمد نے تین کتابیں لکھی ہیں "غالب کون" "اقبال ایک شاعر" اور "محمد حسن عسکری، انسان یا آدمی۔" یہ تین کتابیں سلیم احمد کے سوانحی ناول کے ابواب ہیں۔ وہ میرؔ کے بڑے قائل ہیں۔ لیکن کتاب درکنار، مضمون ان سے نہیں لکھا جاتا کیوں؟ فراقؔ کے عاشق ہیں، مضامین میں حوالے آتے ہیں لیکن تفصیل سے نہیں لکھ سکتے۔ جوش پر تین مضمون (جو جوشؔ پر اردو میں سب سے اچھے مضامین ہیں) اس اعلان کے ساتھ لکھے کہ کتاب ہوگی، لیکن نہ لکھ سکے، کیوں؟ اصل میں جس آدمی کا مسئلہ حل ہو گیا ہو، جو غلط یا صحیح، کسی موقف میں Crystallise ہو گیا ہو، جس کی روح میں جنگ کسی مثبت یا منفی انجام کو پہنچ چکی ہو، سلیم احمد کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے ان کی دلچسپی حسرت کی ہو سکتی ہے، عبرت کی ہو سکتی ہے لیکن وہ ان کی ذات کا اصولِ حرکت نہیں بن سکتا۔ یہ بات سب کے بارے میں درست ہے حتیٰ کہ میرؔ کے بارے میں بھی۔ وہ میرؔ کے توازن کو حسرت سے دیکھتے ہیں لیکن اپنے مسئلے کا عکس انہیں غالبؔ میں ہی نظر آتا ہے۔ یہ تمام مفکرین اور صوفیہ کو پڑھ سکتے ہیں لیکن اپنی آواز انہیں اقبالؔ کے ہاں ہی سنائی دیتی ہے۔ لارنس اور آسپنسکی ان کے ہاں ہر سطر میں آتے ہیں مگر چالیس برس کا تعلق عسکری سے ہی رہ سکتا ہے۔ تکمیل سلیم احمد کا خواب بھی ہے اور خوف بھی۔ یہ ان کے بارے میں بنیادی بات ہے۔

سلیم احمد کی ہر کتاب پر تنازعہ بپا ہوتا ہے اس لیے کہ ان کی ہر تحریر بڑی شخصیت کے گرد نمو پانے والے تصورات کے جنگل کو کاٹ کر ایک نیا راستہ بناتی ہے۔ "غالب کون" کے سلسلے میں یہی

ہوا اور "اقبال ایک شاعر" کے سلسلے میں یہی صورت پیش آئی۔ ان دونوں کتابوں میں سلیم احمد کا طریقہ کار نفسیاتی ہے یعنی شاعری کو شاعر کے Inner Structure کے طور پر قبول کر کے اس سے اس کی ذات کی تہوں کو ترتیب دینا۔ خدارا اسے موجودہ نفسیاتی طریقۂ تنقید کے ساتھ مخلوط نہ کریں جو نفسیاتی صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ اس میں کچھ مشہور اور کچھ غریب الانام ماہرین نفسیات کے نام آجاتے ہیں۔ سلیم احمد نے نفسیاتی طریقہ تنقید کو ایک ایسا طریقہ بنا دیا ہے جس میں ہم شاعر کے ساتھ اس کے تجربے کی تہوں سے گزرتے ہیں اور ہر سطح کو ایک وسیع علمی پس منظر میں Formulate کرتے جاتے ہیں۔ اس طریقے کو "اقبال ایک شاعر" میں سلیم احمد نے جس کامیابی کے ساتھ برتا ہے، وہ بے مثال ہے۔ البتہ یہ ان کی سب سے زیادہ Misunderstood کتاب ہے۔ محمد حسن عسکری پر ان کی کتاب تصورات کو بہت وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے اور فی الحال اس کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اپنی جگہ ایک اہم کتاب ہے۔ لیکن اس کی خامی یہ ہے کہ عسکری کے نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ تجربہ نہیں جس کے ذریعے وہ ان نتائج تک پہنچے۔ اس کتاب کو سلیم احمد کی شاعری کا دیباچہ جاننا چاہیے۔

سلیم احمد کی ذات کے مختلف پہلوؤں کے الگ الگ تجزیئے کو میں کسی اور وقت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ اس مضمون کا مقصود یہ تھا کہ ان کی شخصیت کا بنیادی اصول پوری طرح سمجھ میں آجائے۔ اب اوراق پلٹ کر پڑھتا ہوں تو یہ بات بھی مکمل نہیں ہو سکی۔ کالم، ڈراما، فلم، مذہبیات، کتنے دائرے ہیں جن پر گفتگو نہیں ہوئی اور یہ لکھنے والے کی ناکامی ہے۔ لیکن اگر میں سلیم احمد کی پوری شخصیت کو ایک مضمون میں بیان کر لیتا تو میرے لیے یہ بڑی افسوسناک بات ہوتی۔ اور سلیم احمد کے سلسلے میں بھی یکساں طور پر۔ اگر کامیاب ہو جائے تو جس پر لکھی گئی وہ ناکام آدمی ہے۔ اس کے تجربات اتنے ہیں کہ آپ ایک مٹھی بھر لیں تو اس کی زنبیل خالی ہو جائے۔ میرے لیے سلیم احمد ایک تنقیدی مضمون کا موضوع نہیں بلکہ ایک گہرا تجربہ ہیں۔ میں بار بار اس تجربے کی طرف پلٹتا ہوں اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لارنس نے کہا ہے کہ ہر آدمی کی ذات میں ایک تاریک بر عظیم ہوتا ہے جس میں اسے بہت سی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ سلیم احمد کی تحریریں میرے لیے ایسا ہی تاریک براعظم ہیں۔

ان میں تہ بہ تہ کیا کچھ ہے، کتنے اعصاب شکن تجربے ہیں، کس قدر مطالعہ ہے، تہذیبوں کا کتنا بڑا تقابلی جائزہ ہے اور سب سے بڑھ کر انسانی نفسیات کا کتنا غیر معمولی ادراک ہے۔ ان سب چیزوں کا ایک مبہم نقشہ میرے ذہن میں بنتا ہے۔ لیکن ابھی یہ ساری باتیں مجھ پر پوری طرح واضح نہیں ہوئیں۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ شخص مجھ جیسے بچوں کے لیے گلیوں میں غبارے بناتا ہے اور یہ ایک بہت قیمتی آدمی ہے۔ بہت زندہ۔ بہت خوفناک حد تک زندہ آدمی، جو ان سوالوں سے نبرد آزما ہے۔ جن سے تہذیبیں نبرد آزما ہوتی تھیں۔ میرے لیے یہ بوجھ کون اٹھا سکتا ہے؟

چراغِ نیم شب

وہ ابتداؤں کی ابتدا ہے، وہ انتہاؤں کی انتہا ہے
ثنا کرے اُس کی کوئی کیوں کر، بشر ہے لیکن خدا نما ہے

وہ کون ہے منتظر تھا جس کا جہانِ نورانیاں ازل سے
گواہ ہے کہکشاں ابھی تک کہ کوئی اس راہ سے گیا ہے

وہ سرِ تخلیق ہے مجسم کہ خود ہی آدمؑ ہے خود ہی عالم
وجود کی ساری وسعتوں پر محیط ہے جو وہ دائرہ ہے

وہی ہے اول وہی ہے آخر، وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
یہ سوچ ہے آگہی سے باہر، وہ اور کیا ہے جو رہ گیا ہے

اُنہی کا مسکن اُنہی کا گھر ہیں، اُنہی کی نسبت سے معتبر ہیں
حرم ہو، طیبہ ہو، میرا دل ہو، یہ سب وہی ایک سلسلہ ہے

نہیں ہے کوئی مثیل اُس کا، نہیں ہے کوئی نظیر اُس کا
وہ شخص بھی ہے، وہ عکس بھی ہے اور آپ اپنا ہی آئینہ ہے

ہے حدِ فاصل کہ خطِ واصل کہ قوس کے قوس ہے مقابل
سلیم عاجز ہے فہمِ کامل کہاں بشر ہے کہاں خدا ہے

شوقِ بے حد، غمِ دل، دیدۂ تر مل جائے
مجھ کو طیبہ کے لیے رختِ سفر مل جائے

نامِ احمدؐ کا اثر دیکھ جب آئے لب پر
چشمِ بے مایہ کو آنسو کا گُہر مل جائے

چشمِ خیرہ نگراں ہے رُخِ آقاؐ کی طرف
جیسے خورشید سے ذرے کی نظر مل جائے

یادِ طیبہ کی گھنی چھاؤں ہے سر پر میرے
جیسے تپتی ہوئی راہوں میں شجر مل جائے

نخلِ صحرا کی طرح خشک ہوں، وہ ابرِ کرم
مجھ پہ برسے تو مجھے برگ و ثمر مل جائے

مجھے اِن آتے جاتے موسموں سے ڈر نہیں لگتا
نئے اور پُر اذیت منظروں سے ڈر نہیں لگتا

خموشی کے ہیں آنگن اور سناٹے کی دیواریں
یہ کیسے لوگ ہیں جن کو گھروں سے ڈر نہیں لگتا

مجھے اس کاغذی کشتی پہ اک اندھا بھروسا ہے
کہ طوفاں میں بھی گہرے پانیوں سے ڈر نہیں لگتا

سمندر چیختا رہتا ہے پس منظر میں اور مجھ کو
اندھیرے میں اکیلے ساحلوں سے ڈر نہیں لگتا

یہ کیسے لوگ ہیں صدیوں کی ویرانی میں رہتے ہیں
انہیں کمروں کی بوسیدہ چھتوں سے ڈر نہیں لگتا

مجھے کچھ ایسی آنکھیں چاہئیں رفیقوں میں
جنہیں بے باک سچے آئنوں سے ڈر نہیں لگتا

مرے پیچھے کہاں آئے ہو نامعلوم کی دُھن میں
تمہیں کیا اِن اندھیرے راستوں سے ڈر نہیں لگتا

یہ ممکن ہے وہ اُن کو موت کی سرحد پہ لے جائیں
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا

اب ڈوب گئی ہیں وہ صدائیں
لوگوں سے کہو کہ لوٹ جائیں

بارش سے چھتیں ٹپک رہی ہیں
چڑیاں کہاں گھونسلے بنائیں

یہ راہ طلسمِ عشق کی ہے
ملتی ہیں بڑی بڑی بلائیں

آنچل میں چراغ جل رہے ہیں
بچوں کو بُلا رہی ہیں مائیں

ساماں تو یہی ہے عافیت کا
اب آؤ یہ کشتیاں جلائیں

ہونٹوں پہ دھوئیں کی تہ جمی ہے
سینے میں سلگ اٹھیں دعائیں

وہ شہر تو چھٹ چکا ہے کب کا
اِس عمر کو اب کہاں گنوائیں

بچوں کی طرح سے خواب دیکھیں
اور صبح اٹھیں تو بھول جائیں

اک مٹھی میں خاک بھرلیں اپنی
جب تیز ہوا چلے اڑائیں

کل شب بھی چلی تھی ایک آندھی
اِس شب بھی ہیں تیز تر ہوائیں

اِس شور کے باوجود دن بھر
کرتا ہے یہ شہر سائیں سائیں

جیسے کسی دریا میں سرِ آب پرندے
لگتے ہیں مجھے انجم و مہتاب پرندے

بچوں کے لیے حیرتِ پرواز نہیں ہے
اس شہر میں مدت سے ہیں نایاب پرندے

کس دیس اُنہیں لے گئیں بیتاب اُڑانیں
آنکھوں کے نشیمن سے گئے خواب پرندے

میں ساحلِ افتادہ پہ خاموش کھڑا ہوں
دریا میں نہاتے ہیں سرِ آب پرندے

میں گوشۂ صحرا میں ہوں اور جوئے رواں ہوں
ہوتے ہیں مرے لمس سے سیراب پرندے

سوتے نہیں مدت سے مرے شہر کے بچے
جیسے ہوں کسی خوف سے بے خواب پرندے

اِس شاخ پہ جب سے وہ گُلِ سرُخ کھلا ہے
اک رقصِ طرب کرتے ہیں بیتاب پرندے

یہ ربط کسی فصل کا پابند نہیں ہے
میں دریا ہوں اور ہیں مرے احباب پرندے

بن کے دنیا کا تماشا معتبر ہو جائیں گے
سب کو ہنستا دیکھ کر ہم چشمِ تر ہو جائیں گے

مجھ کو قدروں کے بدلنے سے یہ ہوگا فائدہ
میرے جتنے عیب ہیں سارے ہنر ہو جائیں گے

آج اپنے جسم کو تو جس قدر چاہے چھپا
رفتہ رفتہ تیرے کپڑے مختصر ہو جائیں گے

رفتہ رفتہ ان سے اُڑ جائے گی یکجائی کی بو
آج جو گھر ہیں وہ سب دیوار و در ہو جائیں گے

آتے جاتے رہرووں کو دیکھتا ہوں اس طرح
راہ چلتے لوگ جیسے ہم سفر ہو جائیں گے

آدمی خود اپنے اندر کربلا بن جائے گا
سارے جذبے خیر کے نیزوں پر سر ہو جائیں گے

گرمیٔ رفتار سے وہ آگ ہے زیرِ قدم
میرے نقشِ پا چراغِ رہگزر ہو جائیں گے

کیسے قصے تھے کہ چھڑ جائیں تو اُڑ جاتی تھی نیند
کیا خبر تھی وہ بھی حرفِ مختصر ہو جائیں گے

کیا کہیں ایسے تقاضے ہیں محبت کے تو ہم
اپنی بیتابی سے ہر رقصِ شرر ہو جائیں گے

ایک ساعت ایسی آئے گی کہ یہ وصل و فراق
میرے رنگِ بے دلی سے یک دگر ہو جائیں گے

کاخ و کوئے اہلِ دولت کی بنا ہے ریت پر
اک دھماکے سے یہ سب زیر و زبر ہو جائیں گے

یہ عجب شب ہے انہیں سونے نہ دو ورنہ سلیم
خواب بچوں کے لیے وحشت اثر ہو جائیں گے

دلوں میں درد بھرتا آنکھ میں گوہر بناتا ہوں
جنہیں مائیں پہنتی ہیں میں وہ زیور بناتا ہوں

غنیمِ وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

پرانی کشتیاں ہیں میرے ملاحوں کی قسمت میں
میں اِن کے بادباں سیتا ہوں اور لنگر بناتا ہوں

یہ دھرتی میری ماں ہے اس کی عزت مجھ کو پیاری ہے
میں اس کے سر چھپانے کے لیے چادر بناتا ہوں

یہ سوچا ہے کہ اب خانہ بدوشی کر کے دیکھوں گا
کوئی آفت ہی آتی ہے اگر میں گھر بناتا ہوں

حریفانِ فسوں گر مو قلم ہے میرے ہاتھوں میں
یہی میرا عصا ہے اس سے میں اژدر بناتا ہوں

مجھے اِن سیپیوں کو دیکھ کر یوں ہی خیال آیا
یہ پانی سے میں اپنے خون سے گوہر بناتا ہوں

مرے خوابوں پہ جب تیرہ شبی یلغار کرتی ہے
میں کرنیں گوندھتا ہوں چاند سے پیکر بناتا ہوں

شب کو یہ سلسلہ ہے برسوں سے
گھر کا گھر جاگتا ہے برسوں سے

جانے کیا ہے کہ اس ندی کے پار
اک دیا جل رہا ہے برسوں سے

چلنے والے رُکے رہیں کب تک
راستہ بن رہا ہے برسوں سے

روز مل کر بھی کم نہیں ہوتا
دل میں وہ فاصلہ ہے برسوں سے

اب کے طرزِ تعلقات ہے اور
یوں تو وہ آشنا ہے برسوں سے

سوچ یہ ختم ہو نہ جائے کہیں
دل یہی سوچتا ہے برسوں سے

کس پتے پر اُسے تلاش کروں
شخص اک کھو گیا ہے برسوں سے

کس کو آواز دے رہے ہو سلیم
شہر یہ سو رہا ہے برسوں سے

جانے کسی نے کیا کہا تیز ہوا کے شور میں
مجھ سے سُنا نہیں گیا تیز ہوا کے شور میں

میں بھی تجھے نہ سُن سکا، تُو بھی مجھے نہ سُن سکا
تجھ سے ہوا مکالمہ تیز ہوا کے شور میں

کشتیوں والے بے خبر بڑھتے رہے بھنور کی سمت
اور میں چیختا رہا تیز ہوا کے شور میں

میری زبانِ آتشیں لَو تھی مرے چراغ کی
میرا چراغ چُپ نہ تھا تیز ہوا کے شور میں

جیسے خروشِ بحر میں شورِ پرند ڈوب جائے
ڈوب گئی مری صدا تیز ہوا کے شور میں

نوحہ گرانِ شامِ غم تم نے سُنا نہیں مگر
کیسا عجیب درد تھا تیز ہوا کے شور میں

میرے مکاں کی چھت پہ تھے طائرِ شب ڈرے ڈرے
جیسے پیامِ مرگ تھا تیز ہوا کے شور میں

منتِ گوشِ بے حساں کون اٹھائے اب سلیم
نوحۂ غم ملا دیا تیز ہوا کے شور میں

افق پر جا ملیں گے آسماں سے
یہ کتنا فاصلہ ہوگا یہاں سے

اندھیرے کے گھنیرے حاشیوں میں
یکایک روشنی آئی کہاں سے

ہوا نے دی درِ ویراں پہ دستک
کئی پرچھائیاں نکلیں مکاں سے

سلیقہ جس کو مرنے کا نہیں ہے
وہ اُٹھ جائے ہمارے درمیاں سے

یقیں کی بات میں کچھ بھی نہیں تھا
نئے پہلو ہوئے پیدا گماں سے

خموشی اُس گرہ کو کھولتی ہے
جو کھل سکتی نہیں لفظ و بیاں سے

کبھی اپنی طرف بھی لوٹ آنا
اگر فرصت ملے کارِ جہاں سے

میں موسم کے تقاضے دیکھتا تھا
سفر کی فال لی ابرِ رواں سے

یہ طلسمِ رنگ ہے یا سحر ہے تحریر کا
دمبدم چہرہ بدلتا ہے تری تصویر کا

دونوں ساتھی ہیں کسی اک قید سے بھاگے ہوئے
میرا تیرا ربط ہے یا جبر ہے زنجیر کا

اِس سرے سے اُس سرے تک دوڑنا آساں نہیں
میرے تیرے درمیاں اک دشت ہے تاخیر کا

لوگ جو تخریب کے الزام میں مارے گئے
اُن کی آنکھوں میں بھی کوئی خواب تھا تعمیر کا

بے خیالی میں لکیریں کھینچتا رہتا تھا میں
جانے کیسے بن گیا خاکہ تری تصویر کا

میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاؤں ہیں میرے نصیب
میں جدھر جاؤں وہی ہے فیصلہ تقدیر کا

سانپ میرے گھر کے دروازے سے لپٹا تھا مگر
جھٹپٹے میں شام کے دھوکا ہوا زنجیر کا

کتنے لکھنے والے اس حسرت میں مٹی ہو گئے
صفحۂ آبِ رواں پر نقش ہو تحریر کا

کس کے حرفِ آتشیں سے لوحِ امکاں جل اٹھی
کس کے ہاتھوں نے دکھایا معجزہ تحریر کا

جانے کیسا خواب دیکھا تھا لڑکپن میں سلیم
منتظر رہنا پڑا ہے عمر بھر تعبیر کا

کچھ بُرا نہیں لگتا کچھ بھلا نہیں لگتا
اب مجھے کسی شے میں بھی مزا نہیں لگتا

اس کے پیچھے اتنی دُور ہم چلے تو آئے ہیں
یہ کوئی بگولا ہے قافلہ نہیں لگتا

کب تلک چلوگے یوں کوئی بات ہی چھیڑو
بات کرتے چلنے میں راستا نہیں لگتا

کھُب گئی ہے آنکھوں میں بستیوں کی ویرانی
جنگلوں کا سناٹا اب بُرا نہیں لگتا

جتنا آگے بڑھتا ہوں دور ہوتا جاتا ہے
یہ کوئی چھلاوا ہے یہ دیا نہیں لگتا

گمرہوں سے مت پوچھو کتنی دور آئے ہیں
ایسے چلنے والوں کو فاصلہ نہیں لگتا

ایک اجنبی کے ساتھ میں کہاں نکل آیا
یہ تو میری بستی کا راستا نہیں لگتا

نقش تو بنائے ہیں کچھ غزل کی صورت میں
یہ کتابِ فردا ہے دیکھئے گا فرصت میں

خیر و شر کی خبروں کو مانتے تو سب ہی ہیں
کس کو ہوش رہتا ہے جبر اور ضرورت میں

دونوں درد دیتی ہیں آہِ سرد دیتی ہیں
فرق کچھ نہیں ایسا نفرت و محبت میں

ہوتی ہے صداقت میں خامشی کی گہرائی
صرف شور ہوتا ہے حرفِ بے صداقت میں

دیکھ کر تجھے میں نے اور کچھ نہیں دیکھا
پھر بھی رنگ ہیں کتنے میری چشمِ حیرت میں

آسماں کے تاروں میں آگ یہ کہاں ہوگی
آدمی سلگتا ہے آدمی کی حسرت میں

روشنی چراغوں کی دور ہوتی جاتی ہے
جتنا آگے بڑھتے ہیں شب کو دشتِ وحشت میں

طاق بے دیاروں کے بے چراغ ہیں کب سے
اک دیا جلا دینا شب کو شہرِ غربت میں

عمر ہوگئی آدھی صبر و جبر و وحشت میں
پھر نہیں مزا آیا دوسری محبت میں

بے شناخت لوگو تم اس سے دُور ہی رہنا
ایک زہر ہوتا ہے حرف کی صداقت میں

اِک بُجھا دِیا جیسے خود بخود سُلگ اُٹھے
اپنے گھر کی یاد آئی یوں دیارِ غربت میں

کتنے چہرے ملتے ہیں بھُولتے نہیں برسوں
دُور کے دیاروں کی اجنبی رفاقت میں

جانے کتنے سائے سے اس کی لو میں رقصاں تھے
اِک دیا نظر آیا شب کو خوابِ وحشت میں

اے وفورِ گویائی دردِ بے نوائی دے
کیا کریں گے نغمے کو شہرِ بے سماعت میں

خود پسند و خود آرا ہیں مسرتیں لیکن
آدمی سے ملتا ہے آدمی مصیبت میں

آج جوشِ نغمہ سے آگ سی دلوں میں ہے
آبلے نہ پڑجائیں سینۂ سماعت میں

ایک قبر کا مردہ دوسرے سے کہتا تھا
نیند کچھ ابھی لے لیں دیر ہے قیامت میں

اور کیا بتاؤں میں زندگی کی ظلمت میں
وہ چراغ روشن تھا آدمی کی صورت میں

زندگی کا رخ جن سے دفعتاً بدل جائے
حادثے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں محبت میں

جانے کتنے ہنگامے دل میں جاگ جاتے ہیں
جب کتابِ ماضی کو دیکھتا ہوں فرصت میں

ایک اجنبی چہرہ کھُب گیا ہے آنکھوں میں
جانے کس کو دیکھا ہے میں نے کس کی صورت میں

شہر اور نگر بدلے دشت اور گھر بدلے
فرق کچھ نہیں آیا آدمی کی حالت میں

اب نہ یادِ ماضی ہے اور نہ فکرِ مستقبل
صرف ہوش اتنا ہے زندہ ہوں اذیت میں

اپنی اپنی منزل پر سب اُترتے جاتے ہیں
جیسے کچھ مسافر ہوں ریل کی رفاقت میں

عمرِ مختصر اپنی صرف عشق میں گزری
کتنے کام کرلیتے دو گھڑی کی فرصت میں

لمحۂ رفتہ کا دل میں زخم سا بن جائے گا
جو نہ پُر ہوگا کبھی ایسا خلا بن جائے گا

یہ نئے نقشِ قدم میرے بھٹکنے سے بنے
لوگ جب ان پر چلیں گے راستہ بن جائے گا

گونج سننی ہو تو تنہا وادیوں میں چیخئے
ایک ہی آواز سے اک سلسلہ بن جائے گا

جذب کر دے میری مٹی میں لطافت کا مزاج
پھر وہ تیرے شہر کی آب و ہوا بن جائے گا

کھینچ لائے گی بگولوں کو یہ ویرانی مری
میری تنہائی سے میرا قافلہ بن جائے گا

اس میں لو رکھ دوں گا میں جلتے ہوئے احساس کی
لفظ جو ہونٹوں سے نکلے گا دیا بن جائے گا

جگنوؤں کی مشعلوں سے صحن کی دیوار پر
رقص کرتی روشنی کا دائرہ بن جائے گا

تلخیاں احساس کی جب خون میں گھل جائیں گی
میرا چہرہ میرے غم کا آئینہ بن جائے گا

اک برہمن نے یہ آکے صحنِ مسجد میں کہا
عشق جس پتھر کو چھو لے وہ خدا بن جائے گا

ایک سیدھی بات ہے ملنا نہ ملنا عشق میں
اس پہ سوچو گے تو یہ بھی مسئلہ بن جائے گا

میرے سینے میں ابھی اک جذبۂ بے نام ہے
ضبط کرتے کرتے حرفِ مدعا بن جائے گا

دل میں جو کچھ ہے وہ کہہ دو دوست سے ورنہ سلیم
حرفِ ناگفتہ دلوں کا فاصلہ بن جائے گا

بیٹھے ہیں سنہری کشتی میں اور سامنے نیلا پانی ہے
وہ ہنستی آنکھیں پوچھتی ہیں یہ کتنا گہرا پانی ہے
بے تاب ہوا کے جھونکوں کی فریاد سُنے تو کون سُنے
موجوں پہ تڑپتی کشتی ہے اور گونگا بہرا پانی ہے
ہر موج میں گریاں رہتا ہے، گرداب میں رقصاں رہتا ہے
بے تاب بھی ہے بے خواب بھی ہے یہ کیسا زندہ پانی ہے
بستی کے گھروں کو کیا دیکھے بنیاد کی حرمت کیا جانے
سیلاب کا شکوہ کون کرے سیلاب تو اندھا پانی ہے
اس بستی میں اس دھرتی پر سیرابیٔ جاں کا حال نہ پوچھ
یاں آنکھوں آنکھوں آنسو ہیں اور دریا دریا پانی ہے
یہ راز سمجھ میں کب آتا آنکھوں کی نمی سے سمجھا ہوں
اس گرد و غبار کی دنیا میں ہر چیز سے سچا پانی ہے

کوئی ستارۂ گرداب آشنا تھا میں
کہ موج موج اندھیروں میں ڈوبتا تھا میں

اُس ایک چہرے میں آباد تھے کئی چہرے
اُس ایک شخص میں کس کس کو دیکھتا تھا میں

نئے ستارے مری روشنی میں چلتے تھے
چراغ تھا کہ سرِ راہ جل رہا تھا میں

سفر میں عشق کے اک ایسا مرحلہ آیا
وہ ڈھونڈتا تھا مجھے اور کھو گیا تھا میں

تمام عمر کا حاصل سراب و تشنہ لبی
مرا قصور یہی تھا کہ سوچتا تھا میں

بگڑ رہا تھا میں دنیا کے زاویے سے مگر
اک اور زاویہ تھا جس سے بن رہا تھا میں

نہیں رہا میں ترے راستے کا پتھر بھی
وہ دن بھی تھے ترے احساس میں خدا تھا میں

مجھے گلہ نہ کسی سنگ کا نہ آہن کا
اُسی نے توڑ دیا جس کا آئینہ تھا میں

وہ خواب تھا کہ حقیقت تھا یا تماشا تھا
تمام عمر اِسی مسئلے پہ سوچا تھا

وہ گم ہوا تو مضامین ہوگئے بے ربط
وہی تو تھا جو مرا مرکزی حوالہ تھا

وہ صرف اپنے حدود و قیود کا نکلا
اُس ایک شخص کو کیا کیا سمجھ کے چاہا تھا

مکاں بنا کے اسے بند کردیا ورنہ
یہ راستہ کسی منزل کو جانے والا تھا

میں تہ نشیں تھا کہ باقی تھی زندگی مجھ میں
جو مرگئے تھے اُنہیں موج نے اُچھالا تھا

اُسے تو جانا کسی اور سمت تھا لیکن
مجھے وہ چھوڑنے میرے مکاں تک آیا تھا

پھر اس کے بعد مری گمرہی کا قصہ ہے
میں اُس مقام پہ پہنچا جہاں دوراہا تھا

سکوں ہوا تو مگر صرف ایک پل کے لیے
ترا خیال بھی ابرِ رواں کا سایا تھا

وہ اک ستارۂ گردوں نژاد تھا کوئی
اگرچہ مادرِ گیتی نے اُس کو پالا تھا

اندھیرا تھا کہ برستا تھا آسماں سے مگر
شبِ سیاہ کا وہ آخری سنبھالا تھا

چہک رہا تھا جو آنگن کے پیڑ پر سرِ شام
کہیں سے آیا ہوا موسمی پرندہ تھا

اگر کسی سے کہوں بھی تو کون مانے گا
جو گم ہوا ہے زمیں میں وہ ایک دریا تھا

اسی طرح مرے بچے بھی رقص کرتے ہیں
فضا میں جگنوؤں نے دائرہ بنایا تھا

میں رات چھت پہ کھڑا دیکھتا تھا تارے کو
یہ ایک ساتھ بھی سب کے تھا پھر بھی تنہا تھا

اب اس کے سوگ میں کچھ اور کیا کہیں ہم لوگ
کہ مرنے والا تو ہم سے زیادہ زندہ تھا

نجانے شعر میں کس درد کا حوالہ تھا
کہ جو بھی لفظ تھا وہ دل دکھانے والا تھا

افق پہ دیکھتا تھا میں قطار قازوں کی
مرا رفیق کہیں دور جانے والا تھا

مرا خیال تھا یا کھولتا ہوا پانی
مرے خیال نے برسوں مجھے اُبالا تھا

ابھی نہیں ہے مجھے سرد و گرم کی پہچان
یہ میرے ہاتھوں میں انگارا تھا کہ ژالہ تھا

میں آج تک کوئی ویسی غزل نہ لکھ پایا
وہ سانحہ تو بہت دل دُکھانے والا تھا

معانی شبِ تاریک کُھل رہے تھے سلیم
جہاں چراغ نہیں تھا وہاں اُجالا تھا

دُکھ دے یا رسوائی دے
غم کو مرے گہرائی دے

اپنے لمس کو زندہ کر
ہاتھوں کو بینائی دے

مجھ سے کر کوئی ایسی بات
بن بولے جو سنائی دے

جتنا آنکھ سے کم دیکھوں
اُتنی دُور دکھائی دے

اِس شدت سے ظاہر ہو
اندھوں کو بھی سجھائی دے

افق افق گھر آنگن ہے
آنگن پار رسائی دے

آج تو نہیں ملتا اور چھوڑ دریا کا
تو بھی آ کے ساحل پر دیکھ زور دریا کا

میرا شورِ غرقابی ختم ہو گیا آخر
اور رہ گیا باقی صرف شور دریا کا

میرے جرمِ سادہ پر تشنگی بھی ہنستی ہے
ایک گھونٹ پانی پر میں ہوں چور دریا کا

مور اور بھنور دونوں محوِ رقص رہتے ہیں
یہ بھنور ہے جنگل کا وہ ہے مور دریا کا

ملا جو کام غم معتبر بنانے کا
ہنر اُس آنکھ کو آیا گہر بنانے کا

تجھی سے خواب ہیں میرے تجھی سے بیداری
تجھے سلیقہ ہے شام و سحر بنانے کا

میں اپنے پیچھے ستاروں کو چھوڑ آیا ہوں
مجھے دماغ نہیں ہم سفر بنانے کا

یہ میرے ہاتھوں میں پتھر ہیں اور رات ہے سرد
میں کام لیتا ہوں ان سے شرر بنانے کا

سرائے میں کوئی اک شب رکے تو بات ہے اور
مگر سوال ہے دنیا کو گھر بنانے کا

مکاں کے نقشے پہ دیوار لکھ دیا کس نے
یہاں تو میرا ارادہ تھا در بنانے کا

یہ اور بات کہ منزل فریب تھا لیکن
ہنر وہ جانتا تھا ہم سفر بنانے کا

وہ لوگ کشتی و ساحل کی فکر کیا کرتے
جنہیں ہے حوصلہ دریا میں گھر بنانے کا

ہر ایک تخم کو رزقِ شکم پُری نہ سمجھ
ہنر بھی سیکھ زمیں سے شجر بنانے کا

بہت طویل مری داستانِ غم تھی مگر
غزل سے کام لیا مختصر بنانے کا

زندگی موت کے پہلو میں بھلی لگتی ہے
گھاس اِس قبر پہ کچھ اور ہری لگتی ہے

روز کاغذ پہ بناتا ہوں میں قدموں کے نقوش
کوئی چلتا نہیں اور ہم سفری لگتی ہے

آنکھ مانوسِ تماشا نہیں ہونے پاتی
کیسی صورت ہے کہ ہر روز نئی لگتی ہے

گھاس میں جذب ہوئے ہوں گے زمیں کے آنسو
پاؤں رکھتا ہوں تو ہلکی سی نمی لگتی ہے

سچ تو کہہ دوں مگر اِس دور کے انسانوں کو
بات جو دل سے نکلتی ہے بُری لگتی ہے

میرے شیشے میں اُتر آئی ہے جو شامِ فراق
وہ کسی شہرِ نگاراں کی پَری لگتی ہے

بوند بھر اشک بھی ٹپکا نہ کسی کے غم میں
آج ہر آنکھ کوئی اَبرِ تہی لگتی ہے

شورِ طفلاں بھی نہیں ہے نہ رقیبوں کا ہجوم
لوٹ آؤ یہ کوئی اور گلی لگتی ہے

گھر میں کچھ کم ہے یہ احساس بھی ہوتا ہے سلیم
یہ بھی کھلتا نہیں کس شے کی کمی لگتی ہے

ربط ٹوٹ جاتا ہے سلسلا نہیں ملتا
مجھ کو دھیان گلیوں میں راستا نہیں ملتا

اِس قطارِ روشن میں اک کمی سی لگتی ہے
جس پہ نام تھا تیرا وہ دیا نہیں ملتا

سب کو ایک حسرت ہے دوسرے کے ملنے کی
سب کو اک شکایت ہے دوسرا نہیں ملتا

دل میں ہو تو کچھ کہیے جب نہ ہو تو کیا کہیے
لفظ مل بھی جاتے ہیں مدعا نہیں ملتا

کتنا تنگ کرتی ہیں یہ بھری پُری سڑکیں
اتنے لوگ چلتے ہیں راستہ نہیں ملتا

جس کی آنکھ پتھر ہو جس کا دل لہو روئے
اُس سوا کسی کو بھی دیکھنا نہیں ملتا

یوں تو شہر میں تیرے دوست بھی ہیں دشمن بھی
آدمی کوئی اپنے کام کا نہیں ملتا

مجھ سے کی مسافر نے راستے میں سرگوشی
کب سے ڈھونڈتا ہوں میں اور خدا نہیں ملتا

شب کو چائے خانوں میں اب بھی بھیڑ ہوتی ہے
ہاں مگر کوئی چہرہ آشنا نہیں ملتا

میں دیے جلاتا ہوں طاق غم گساری میں
گو دیے جلانے کا کچھ صِلا نہیں ملتا

آنکھوں میں ستارے سے چمکتے رہے تا دیر
اک گھر کے در و بام کو تکتے رہے تا دیر

آنسو تو ہوئے خشک پہ گریہ رہا جاری
بچوں کی طرح رو کے سسکتے رہے تا دیر

اُس شاخ سے اک مارِ سیہ لپٹا ہوا تھا
لیکن وہیں طائر بھی چہکتے رہے تا دیر

کیا لمس تھا اس دستِ حنائی کا تہ آب
انگارے سے ہاتھوں میں دہکتے رہے تا دیر

اک آگ سی جلتی رہی تا عمر لہو میں
ہم اپنے ہی احساس میں پکتے رہے تا دیر

وہ گرمیِ انفاس وہ جاڑے کی خنک رات
احساس میں شعلے سے لپکتے رہے تا دیر

یہ جو اک صورت ہے اب پتھر کے بیچ
نقش تھی پہلے دلِ آزر کے بیچ

دیکھنا ہے اب دیئے کے زور کو
لا کے رکھ دوں گا ہوا میں در کے بیچ

آنکھ ہے نادیدگاں کی منتظر
اک کمی لگتی ہے ہر منظر کے بیچ

وہ لباسِ درد میں ملبوس تھا
سینکڑوں پیوند تھے چادر کے بیچ

کیا بتاؤں کیوں ہوئی مجھ کو شکست
میرا دشمن تھا مرے لشکر کے بیچ

کس نے دل میں رکھ دیئے یہ فاصلے
کس نے دیواریں اٹھادیں در کے بیچ

نشے کے اسرار ہیں، کھلتا نہیں
موج ہے یا سانپ ہے ساغر کے بیچ

یہ دَر و دیوار ہیں رختِ سفر
میں مسافر ہوں خود اپنے گھر کے بیچ

یہ سمندر یہ سنہری کشتیاں
کاش ہوتا تو بھی اِس منظر کے بیچ

بیٹھ کے صوفے پہ اِٹھلاتا ہے جو
کھینچیے اُس کو کبھی بستر کے بیچ

وہ میرا یار دیوانہ بہت تھا رنگ و نکہت کا
سو اُس کی قبر پر کچھ پھول رکھے اور لوٹ آیا

میں اُس کی رنگ موجوں میں کبھی ڈوبا کبھی اُبھرا
بدن تھا یا شبِ مہتاب میں بہتا ہوا دریا

ترے بارے میں، میں اِس کے سوا کچھ اور کیا کہتا
نظر کچھ بھی نہ آیا اس قدر نزدیک سے دیکھا

مجھے اک مصرعِ موزوں بنایا حُسنِ فن بخشا
وہ میرا سوچنے والا کوئی شاعر رہا ہوگا

وہ ہر چہرے کے خدوخال کو پہچان لیتا ہے
مگر دیکھو تو آئینے کا خود کوئی نہیں چہرا

وہ شامِ بے بسی کیسی اداسی لے کے آئی تھی
اندھیرا بڑھ رہا تھا اور دیا میں نے جلایا تھا

وہ مرے دل کی روشنی وہ مرے داغ لے گئی
ایسی چلی ہوائے شام سارے چراغ لے گئی

شاخ و گل و ثمر کی بات کون کرے کہ ایک رات
بادِ شمال آئی تھی باغ کا باغ لے گئی

وقت کی موج تُند رَو آئی تھی سوئے میکدہ
میری شراب پھینک کر میرے ایاغ لے گئی

دل کا حساب کیا کریں دل تو اُسی کا مال تھا
نکہتِ زلفِ عنبریں اب کے دماغ لے گئی

باغ تھا اُس میں حوض تھا، حوض تھا اُس میں پھول تھا
غیر کی بے بصیرتی مجھ سے سراغ لے گئی

ستارہ حرف بناتے ہیں خواب لکھتے ہیں
تمہارے نام پر اک انتساب لکھتے ہیں

حیات سب کے لیے اک سوال لاتی ہے
تمام عمر اُسی کا جواب لکھتے ہیں

میں ان کو حرف بناتا ہوں اور پڑھتا ہوں
یہ حادثے مرے دل میں کتاب لکھتے ہیں

عجیب رنگ ہیں اُن کے عجیب تحریریں
یہ روز و شب مری آنکھوں میں خواب لکھتے ہیں

سمندروں کو بھی لب تشنگانِ بے پروا
غرور تشنہ لبی سے سراب لکھتے ہیں

ہم ایک حرف کو بھی رائیگاں نہیں لکھتے
بیادِ کم سُخناں انتخاب لکھتے ہیں

بُرا نہ مان کہ یہ شاعروں کی باتیں ہیں
یہ لوگ اپنے عذاب و ثواب لکھتے ہیں

سلیم میرے حریفوں میں یہ خرابی ہے
کہ جھوٹ بولتے ہیں اور خراب لکھتے ہیں

جو دل میں ہیں داغ جل رہے ہیں
مسجد میں چراغ جل رہے ہیں

جس آگ سے دل سُلگ رہے تھے
اب اس سے دماغ جل رہے ہیں

بچپن مرا جن میں کھیلتا تھا
وہ کھیت وہ باغ جل رہے ہیں

چہرے پہ ہنسی کی روشنی ہے
آنکھوں میں چراغ جل رہے ہیں

رستوں میں وہ آگ لگ گئی ہے
قدموں کے سُراغ جل رہے ہیں

شفق کے رنگ سے برگ و ثمر گلابی ہیں
سنہری شام ہے سارے شجر گلابی ہیں
یہ کون ہے جو مرے گھر میں رنگ لے آیا
یہ کس کے عکس سے دیوار و در گلابی ہیں
یہ کس کا دستِ حنائی ہے میری آنکھوں پر
کہ میرے خوابوں کے سارے نگر گلابی ہیں
سنہری بالوں پہ ہلکی سی دھوپ پڑتی ہے
سفید برف سے چہرے ہیں سر گلابی ہیں

ہے کبھی سایہ کبھی ہے روشنی دیوار پر
رنگ بکھراتی ہے کیا کیا زندگی دیوار پر
دونوں ہمسایوں میں ویسے تو محبت ہے بہت
ایک جھگڑا پڑگیا ہے بیچ کی دیوار پر
میں اندھیرے میں کھڑا حیرت سے پڑھتا ہوں اسے
اک عبارت لکھ رہی ہے روشنی دیوار پر
ہم سمجھتے تھے ہمارے بام و در ڈھل جائیں گے
بارشیں آئیں تو کائی جم گئی دیوار پر
اک اُدھورا نام، کچھ مدھم لکیریں، کچھ حروف
یہ مکینوں کی نشانی رہ گئی دیوار پر
اِس جگہ شاید کبھی اس کا بسیرا ہو سلیم
ایک چڑیا دیر تک بیٹھی رہی دیوار پر

جو آنکھوں کے تقاضے ہیں وہ نظارے بناتا ہوں
اندھیری رات ہے کاغذ پہ میں تارے بناتا ہوں

محلے والے میرے کارِ بے مصرف پہ ہنستے ہیں
میں بچوں کے لیے گلیوں میں غبارے بناتا ہوں

وہ لوری گائیں گی اور ان میں بچوں کو سلائیں گی
میں ماؤں کے لیے پھولوں کے گہوارے بناتا ہوں

فضائے نیلگوں میں حسرتِ پرواز تو دیکھو
میں اُڑنے کے لیے کاغذ کے طیارے بناتا ہوں

مجھے رنگوں سے اپنے حیرتیں تخلیق کرنی ہیں
کبھی تتلی کبھی جگنو کبھی تارے بناتا ہوں

زمیں یخ بستہ ہو جاتی ہے جب جاڑوں کی راتوں میں
میں اپنے دل کو سُلگاتا ہوں انگارے بناتا ہوں

ترا دستِ حنائی دیکھ کر مجھ کو خیال آیا
میں اپنے خون سے لفظوں کے گل پارے بناتا ہوں

مجھے اک کام آتا ہے یہ لفظوں کے بنانے کا
کبھی میٹھے بناتا ہوں کبھی کھارے بناتا ہوں

بلندی کی طلب ہے اور اندر انتشار اتنا
سو اپنے شہر کی سڑکوں پہ فوارے بناتا ہوں

ہر آنکھ کا حاصل دُوری ہے
ہر منظر اک مستُوری ہے

جو سود و زیاں کی فکر کرے
وہ عشق نہیں مزدوری ہے

سب دیکھتی ہیں سب جھیلتی ہیں
یہ آنکھوں کی مجبوری ہے

اِس ساحل سے اُس ساحل تک
کیا کہیے کتنی دُوری ہے

یہ قُربِ حباب و آب کا ہے
یہ وصل نہیں مہجوری ہے

میں تجھ کو کتنا چاہتا ہوں
یہ کہنا غیر ضروری ہے

فصلِ گُل آئی ہے یادوں میں دیے جلتے ہیں
دل دہک اٹھتا ہے زخموں میں دیے جلتے ہیں

شہرِ احساس ترے لمس سے جاگ اٹھتا ہے
رات آتی ہے تو ہاتھوں میں دیے جلتے ہیں

روشنی سبز درختوں پہ اُتر آتی ہے
پھُول کھلتے ہیں تو شاخوں میں دیے جلتے ہیں

اک اُجالے کو سخن کرتے سنا ہے میں نے
ہونٹ کو دیتے ہیں لفظوں میں دیے جلتے ہیں

یہ ترے نقشِ قدم ہیں کہ ستارے ہیں کہ پھول
تُو گزرتا ہے تو رستوں میں دیے جلتے ہیں

فکر اک عمر میں احساس میں حل ہوتی ہے
بڑی مشکل سے دماغوں میں دیے جلتے ہیں

دیکھنے کے لیے اک شرط ہے منظر ہونا
دوسری شرط ہے پھر آنکھ کا پتھر ہونا

وہاں دیوار اٹھا دی مرے معماروں نے
گھر کے نقشے میں مقرر تھا جہاں در ہونا

مجھ کو دیکھا تو فلک زاد رفیقوں نے کہا
اِس ستارے کا مقدر ہے زمیں پر ہونا

باغ میں یہ نئی سازش ہے کہ ثابت ہو جائے
برگِ گل کا خس و خاشاک سے کمتر ہونا

میں بھی بن جاؤں گا پھر سحر ہوا سے کشتی
رات آجائے تو پھر تم بھی سمندر ہونا

وہ مرا گرد کی مانند ہوا میں اُڑنا
پھر اسی گرد سے پیدا مرا لشکر ہونا

در بدر ٹھوکریں کھائیں تو یہ معلوم ہوا
گھر کسے کہتے ہیں کیا چیز ہے بے گھر ہونا

کیسا گرداب تھا وہ ترکِ تعلق تیرا
کام آیا نہ مرے میرا شناور ہونا

تم تو دشمن بھی نہیں ہو کہ ضروری ہے سلیم
میرے دشمن کے لیے میرے برابر ہونا

آئینے کا آب آب چہرہ
بے عکس بنا سراب چہرہ

شاخوں پہ خیال کی کھلا ہے
بھولا ہوا اک گلاب چہرہ

یادوں کے اُفق سے جھانکتا ہے
وہ زرد سا ماہتاب چہرہ

میں نیند میں خواب دیکھتا ہوں
بے خواب ہے خواب خواب چہرہ

میں حرف شناس بھی نہیں ہوں
پڑھتا ہوں مگر کتاب چہرہ

وہ رات ہے اور ہاتھ تیرے
اور ہاتھ میں آفتاب چہرہ

بھیجتی ہیں جو پیامِ روشنی تاروں کے نام
رات میں نے اک غزل لکھی ہے اُن آنکھوں کے نام

کل کے اخباروں میں چھپ جائے گی یہ تازہ خبر
کشتیاں، ساحل کا منظر، ڈوبنے والوں کے نام

جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہیں اُس کی حیرتیں
میرا بچہ پوچھتا ہے رات کو تاروں کے نام

جانے اس گھر کے مکیں کس دیس پہنچے کیا ہوئے
رہ گئے دیوار پر لکھے ہوئے بچوں کے نام

رنگ و بُو کے کتنے مُردہ تجربے زندہ ہوئے
یاد آئے دیکھ کر تجھ کو کئی پھولوں کے نام

میں نے دریا میں بہائے جاگتے سوتے دیے
کچھ تری صبحوں کے نام اور کچھ تری شاموں کے نام

اک اِمکاں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے دل کے پاس
دل کی دولت خواب ہیں اور خواب مستقبل کے پاس

کل جنہیں رخصت کیا تھا وہ مسافر کیا ہوئے
کشتیاں ٹوٹی ہوئی لوٹ آئی ہیں ساحل کے پاس

میں پلٹ آؤں گا صحرا میں بھٹکنے کے لیے
قافلہ میرا پہنچ جائے گا جب منزل کے پاس

میری خُوں آلودہ آنکھوں نے یہ منظر بھی سہا
جو مرا ساتھی تھا بیٹھا تھا مرے قاتل کے پاس

مجھ سے وہ طالب محبت کا ہے اور واقف ہوں میں
مجھ سے یہ دولت زیادہ ہے مرے سائل کے پاس

عقلِ پختہ کار کو جن کی خبر تک بھی نہیں
اپنے کاموں کی ہیں کچھ ایسی دلیلیں دل کے پاس

کوئی پُورا کر نہیں سکتا جسے اُس کے سوا
ایک ایسی بات ہے ہر ناقص و کامِل کے پاس

اپنی موج مستی میں، میں بھی ایک دریا ہوں
پھر بھی پاسِ صحرا سے اپنی حد میں بہتا ہوں

اپنی دید سے اندھا، اپنی گونج سے بہرا
سب کو دیکھ لیتا ہوں سب کی بات سنتا ہوں

مجھ میں کسی نے رکھ دی ہے یہ محال کی خواہش
میں کہ ریگِ صحرا کو چھلنیوں میں بھرتا ہوں

گو چراغِ روشن ہوں پر ہوں رائیگاں اتنا
ایک طاق میں رکھا دوپہر میں جلتا ہوں

ڈوبنے کا ڈر ہونا چاہیے سفینوں کو
مجھ کو خوفِ طوفاں کیا میں تو ایک تنکا ہوں

میرے پاس آتے ہیں مجھ سے خوف کھاتے ہیں
میں ہجومِ طفلاں میں سانپ کا تماشا ہوں

کل نشاطِ قُرب سے موسم بہار اندازہ تھا
کچھ ہوا بھی نرم تھی کچھ رنگِ گُل بھی تازہ تھا

تھک کے سنگِ راہ پر بیٹھے تو اُٹھے ہی نہیں
حد سے بڑھ کر تیز چلنے کا یہی خمیازہ تھا

آئینہ دونوں کے آگے رکھ دیا تقدیر نے
میرے چہرے پہ لہو تھا روئے گُل پر غازہ تھا

مجھ کو ملاحوں کے گیتوں سے محبت ہے مگر
رات ساحل پر ہوا کا شور بے اندازہ تھا

اب تو کچھ دکھ بھی نہیں ہے داغ بھی جاتا رہا
کل اِسی دل میں یہیں اک زخم تھا اور تازہ تھا

گو یقینی تو نہیں تھے میرے تخمینے مگر
جو تجھے پیش آیا اُس کا کچھ مجھے اندازہ تھا

میرے اوراقِ پریشاں دیکھنے والے، کبھی
میں کتابِ عشق تھا اور دل مرا شیرازہ تھا

آنکھ میں اُس کی چمک تھی پر ہوسناکی بھی تھی
رنگ اُس کے رخ پہ تھا لیکن رہینِ غازہ تھا

جوشِ گریہ میرے رونے کا یہ شورِ باز گشت
کچھ نہ تھا اک کوچہ گردِ صبر کا آوازہ تھا

جانے اندر کیا ہوا میں شور سن کر اے سلیمؔ
اُس جگہ پہنچا تو دیکھا بند یہ دروازہ تھا

بارہا شب کو یوں لگا ہے مجھے
کوئی سایہ پکارتا ہے مجھے

جیسے یہ شہر کل نہیں ہوگا
جانے کیا وہم ہوگیا ہے مجھے

میں ستاروں کا ایک نغمہ ہوں
بیکراں رات نے سُنا ہے مجھے

میں ادھورا سا ایک جملہ ہوں
اہتماماً کہا گیا ہے مجھے

دکھ ہے، احساسِ جرم ہے، کیا ہے
کوئی اندر سے توڑتا ہے مجھے

جیسے میں دیکھتا ہوں آئینہ
یوں ہی آئینہ دیکھتا ہے مجھے

جب میں باتوں سے ٹوٹ جاتا ہوں
کوئی ہونٹوں سے جوڑتا ہے مجھے

سازشیں یہ کسی چراغ کی ہیں
میرا سایہ ڈرا رہا ہے مجھے

وہ مجھے پوچھنے کو آیا تھا
حال اپنا سُنا رہا ہے مجھے

جانے وہ کون تھا دیے کی طرح
راستے میں جلا گیا ہے مجھے

نیند کے حاشیوں میں پچھلے پہر
اک ستارا پکارتا ہے مجھے

اُس نے کیسا سجا کے سلیم
اک غزل کی طرح لکھا ہے مجھے

چھایا ہوا تھا رنگِ غمِ دل پہ غبار کی طرح
میں نے اسی غبار سے ڈالی بہار کی طرح

رنج ہزار ہا سہی دل نہ دُکھے تو کیا علاج
بے حس و بے خیال ہوں سنگِ مزار کی طرح

چلتا ہوں اپنے زور میں مرکبِ وقت کے بغیر
سعی و عمل کی نے پہ ہوں طفلِ سوار کی طرح

زورِ ہوا سے اُڑ گئے حبسِ ہوا سے گھٹ گئے
قافلہ حیات میں ہم ہیں غبار کی طرح

میری بہائے فن ہے یہ مجھ سے ہے کارِ زرگراں
رکھا گیا دکان میں مجھ کو عیار کی طرح

دل سے غمِ حیات کو عشق سے کھینچ لیجئے
بعد میں پھینک دیجئے دونوں کو خار کی طرح

حالتِ یاس اور گناہ دل میں کوئی خیال سا
رات کی تیرگی میں ہے دیدۂ مار کی طرح

اب مرے برگ و بار میں باقی نہیں نم و نمو
تُو مری زندگی میں تھا فصلِ بہار کی طرح

عمر اپنی جہاں جہاں گزری
اچھے لوگوں کے درمیاں گزری

کٹ گئی انتظارِ فردا میں
کیسے کہیے کہ رائیگاں گزری

ساتھ گزرا ہجوم نوحہ گراں
دل سے جب یادِ رفتگاں گزری

بات کرتے میں ایک پرچھائیں
تیری آنکھوں کے درمیاں گزری

ہر صدائے نفس تھی بانگِ جرس
زندگی مثلِ کارواں گزری

دن کٹا تھا تمازتوں میں سلیم
شام ہو کر دھواں دھواں گزری

چین نہیں ہے دل کو جب رات کٹے گی کس طرح
ہم نفسانِ نیم شب رات کٹے گی کس طرح

ساعتِ وعدہ کٹ گئی آ کے خوشی پلٹ گئی
دل کو سکوں نہیں ہے اب رات کٹے گی کس طرح

وجہ کوئی نہیں مگر صبح سے میں اداس ہوں
وہ بھی خفا ہے بے سبب رات کٹے گی کس طرح

شام ملال ہے تہی یاد شب وصال سے
دل میں نہیں کوئی طلب رات کٹے گی کس طرح

صبح سے کیوں خفا ہے تو شام کو کیوں ملا نہیں
میں نے کہا تھا تجھ سے کب رات کٹے گی کس طرح

ہجر کے غم میں آنکھ سے طائرِ خواب اڑ گیا
حال ہے شام سے عجب رات کٹے گی کس طرح

اب وہ سرُورِ مے کہاں، نغمہ گروں کی لے کہاں
بادہ کشانِ تشنہ لب رات کٹے گی کس طرح

کچھ ہیں منظر حال کے کچھ خواب مستقبل کے ہیں
یہ تمنا آنکھ کی ہے وہ تقاضے دل کے ہیں

ہم نے یہ نیرنگیاں بھی دہر کی دیکھیں کہ لوگ
دوست ہیں مقتول کے اور ہمنوا قاتل کے ہیں

عمر ساری راہ کے پتھر ہٹاتے کٹ گئی
زخم میرے ہاتھ میں اک سعی لاحاصل کے ہیں

اک دھنک لہرا رہی ہے آنسوؤں کے درمیاں
میری آنکھوں میں ابھی تک رنگ اس محفل کے ہیں

اس سے آگے کون جائے دشت نامعلوم میں
ہم نہ کہتے تھے کہ سارے ہم سفر منزل کے ہیں

ان کو طوفانوں سے کیا مطلب بھنور سے کیا غرض
دوست جتنے ہیں تماشائی فقط ساحل کے ہیں

تو جسے اپنا سمجھتا ہے وہ مال غیر ہے
تیرے ہاتھوں میں جو سکے ہیں کسی سائل کے ہیں

جانچتی ہے غیر کو ہر لحظہ چشم عیب جو
نقش مجھ میں جتنے ہیں سارے کسی کامل کے ہیں

دل کے اندر درد آنکھوں میں نمی بن جایئے
اِس طرح ملیۓ کہ جزوِ زندگی بن جایئے

اک پتنگے نے یہ اپنے رقصِ آخر میں کہا
روشنی کے ساتھ رہیۓ روشنی بن جایئے

جس طرح دریا بجھا سکتے نہیں صحرا کی پیاس
اپنے اندر ایک ایسی تشنگی بن جایئے

دیوتا بننے کی حسرت میں معلق ہوگئے
اب ذرا نیچے اتریۓ آدمی بن جایئے

جس طرح خالی انگوٹھی کو نگینہ چاہیے
عالمِ امکاں میں اک ایسی کمی بن جایئے

عقلِ کل بن کر تو دنیا کی حقیقت دیکھ لی
دل یہ کہتا ہے کہ اب دیوانگی بن جایئے

وسعتوں میں لوگ کھودیتے ہیں خود اپنا شعور
اپنی حد میں آیئے اور آگہی بن جایئے

حُسنِ معنی کیوں رہے حرف و صدا کی قید میں
ماورائے گوش و لب اک اَن کہی بن جایئے

عالمِ کثرت نہاں ہے اس اکائی میں سلیم
خود میں خود کو جمع کیجیے اور کئی بن جایئے

وہ ہاتھ ہاتھ میں آیا ہے آدھی رات کے بعد
دیا دیے سے جلایا ہے آدھی رات کے بعد

میں آدھی رات تو تیرہ شبی میں کاٹ چکا
چراغ کس نے جلایا ہے آدھی رات کے بعد

میں جانتا ہوں کہ سب سو رہے ہیں محفل میں
فسانہ میں نے سنایا ہے آدھی رات کے بعد

ستارے جاگ اٹھے ہیں کسی کی آہٹ سے
یہ کون ہے کہ جو آیا ہے آدھی رات کے بعد

مجھے خبر بھی نہیں ہے کہ شب نوردوں نے
مجھے کہاں سے اٹھایا ہے آدھی رات کے بعد

ہوا تھا شامِ خیال و ملال سے آغاز
وہی دیا وہی سایا ہے آدھی رات کے بعد

یہاں تو کوئی نہیں ہے، ہوا، نہ تُو، نہ چراغ
یہ مجھ کو کس نے جگایا ہے آدھی رات کے بعد

کبھی جو دن کو بھی ملتا نہیں اکیلے میں
اُسی نے مجھ کو بلایا ہے آدھی رات کے بعد

یہ زمیں یہ چاند یہ سورج یہ تارے دیکھنا
حُسنِ نادیدہ کے سارے استعارے دیکھنا

اک خبر دینا کسی آتے ہوئے طوفان کی
کشتیوں کو جب کبھی دریا کنارے دیکھنا

جنوری کی سردیوں میں ایک آتشداں کے پاس
گھنٹوں تنہا بیٹھنا بجھتے شرارے دیکھنا

جب کبھی فرصت ملے تو گوشۂ تنہائی میں
یادِ ماضی کے پرانے گوشوارے دیکھنا

میرے ماضی کے رسالوں کو نہ کھودینا سلیم
اب کہیں ملتے نہیں ہیں یہ شمارے دیکھنا

خیر کا تجھ کو یقیں ہے اور اُس کو شر کا ہے
دونوں حق پر ہیں کہ جھگڑا صرف پس منظر کا ہے

آنسوؤں سے تُو ہے خالی درد سے عاری ہوں میں
تیری آنکھیں کانچ کی ہیں میرا دل پتھر کا ہے

کون دفناتا اُسے وہ اک برہنہ لاش تھی
سب نے پوچھا کون ہے وہ کون سے لشکر کا ہے

تُو سکوں سے تھک گیا ہے اور بیتابی سے میں
شوق ہے تجھ کو سفر کا اور مجھ کو گھر کا ہے

ایک پودا صحن میں تھا دھوپ کھا کر جل گیا
صرف میرا ہی نہیں ہے رنج یہ گھر بھر کا ہے

سوچتا رہتا ہوں میں تیری اُڑانیں دیکھ کر
یہ ہوا کا زور ہے یا تیرے بال و پر کا ہے

ایک بوڑھے نے کیا عصرِ رواں پہ تبصرہ
یہ زمانہ آدمی کا ہے کہ زور و زر کا ہے

میں نے سینچا ہے لہو سے اس دل سرسبز کو
عمر بھر سے یہ علاقہ میری چشمِ تر کا ہے

میں سمٹ کر لیٹتا ہوں بسترِ ادراک پر
پاؤں پھیلاؤں تو اندیشہ مجھے چادر کا ہے

اس مسافت کا مداوا تجھ سے بھی ممکن نہیں
زخمِ دل سے کچھ زیادہ زخم میرے سر کا ہے

ایک طبیبِ آدمیت نے کہا ہے صاف صاف
زہر دنیا کی رگوں میں سب فسادِ زر کا ہے

دیکھ کر انسان کو کہتی ہے ساری کائنات
یہ تو ہم میں سے نہیں ہے، یہ کوئی باہر کا ہے

ساری کڑیاں توڑ دیں میں نے محبت کے سوا
کون توڑے گا اِسے یہ جبر تو اندر کا ہے

مشرق

پیش لفظ

"مشرق ہار گیا" میں نے ۱۹۷۱ء میں لکھی لیکن یہ نظم میری روح میں پینتیس سال سے پک رہی تھی۔ اس طویل پس منظر کے بغیر یہ نظم لکھی نہیں جاسکتی تھی۔ مجھے اپنے مخصوص مزاج کے باعث ذاتی باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کچھ شرم سی آتی ہے، کچھ خود پسندی سی معلوم ہوتی ہے لیکن ایک شاعر کے پاس ذاتی تجربے کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ اس سے اس کی ذاتی زندگی چھین لیجئے اور آپ دیکھیں گے کہ وہ ساحل کی سیپیوں کی طرح خالی ہے، اس نظم کی بنیاد میری ذاتی زندگی پر ہے۔ اب اسے پینتالیس سال پہلے کی بات ہے جب ۱۵ مئی ۱۹۲۶ء کو میرے والد سید شرافت علی کا انتقال ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر نو سال تھی اور میں لکھنؤ کے سینٹیل اسکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد میرے منجھلے تائے حکیم سید شجاعت علی نے جنہیں میں منجھلے ابا کہتا تھا مجھے اپنے پاس رکھ لیا اور شکلا ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ لکھنؤ کے ایک محلّہ ٹکیٹ گنج میں رہتے تھے اور طبابت کا پیشہ کرتے تھے، پرانے مسلم لیگی تھے اور چودھری خلیق الزماں سے ان کے خصوصی تعلقات تھے، شاعر بھی تھے، شجاع تخلص کرتے تھے۔ میں ان کے پاس دو سال رہا۔ یہ زمانہ لکھنؤ کی زندگی میں ایک ہیجانی زمانہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے کہ سیاسی ہلچل کی جو لہر ہندوستان کے کسی گوشے سے اٹھتی تھی وہ لکھنؤ بھی پہنچ جاتی تھی دوسرے خاص لکھنؤ میں مدحِ صحابہ اور تبرا ایجی

ٹیشن کا زمانہ تھا۔ ان دونوں باتوں کے اثر سے لکھنؤ کی اجتماعی زندگی صبح و شام زیر و زبر ہوتی۔ مذہبی مناظرے کثرت سے ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ زور شیعہ عقائد پر تھا لیکن دیگر فرقوں کے درمیان بھی مناظرے ہوتے رہتے تھے۔ میرے سنجھلے تائے سید لیاقت علی مذہبی آدمی تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھے۔ وہ مجھے لے کر مناظروں اور جلسوں میں جایا کرتے تھے اور میں ان کے ساتھ رات رات بھر جاگ کر وعظ اور مناظرے سنا کرتا تھا لیکن یہ میرے والد کے انتقال سے پہلے کی بات ہے۔ منجھلے ابا کے یہاں مذہبی باتوں کی جگہ سیاسی دلچسپیوں نے لے لی تھی۔ ان کے مطب میں طرح طرح کے لوگ جمع ہوتے اور دن رات کانگریس، مسلم لیگ، مجلس احرار، جمیعۃ العلمائے ہند اور نہ جانے کن کن سیاسی جماعتوں پر بحث و مباحثہ ہوتے تھے۔ دنیائے اسلام میں ہونے والی تبدیلیاں یہاں کی گفتگو کا ایک حصہ تھیں۔ میں گھنٹوں سنجھلے ابا کے مطب میں بیٹھا سنتا رہتا اور مجھے ان سے شدید دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ اس طرح سیاست اور مذہب بچپن ہی سے میری توجہ کا مرکز بن گئے۔

منجھلے ابا کی عادت تھی کہ رات کے کھانے کے بعد مجھے آواز دیتے اور حقہ لانے کے لئے کہتے تھے پھر گھر کے سارے لوگوں کو جمع کر کے "واقدی" کی فتوح الشام کھول کر بیٹھ جاتے اور اپنی پاٹ دار آواز میں اسلامی فتوحات کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ضرار بن ازورؓ، حضرت شرجیل بن حسنہؓ کے نام روز میرے کانوں میں پڑتے اور منجھلے ابا کے سنانے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ دل میں جوش پیدا ہو جاتا۔ میں دل میں سوچا کرتا کہ کاش اک بار پھر وہ زمانہ لوٹ آئے۔ اسلامی لشکر فتوحات کے لئے نکلیں اور میرا ننھا سا خواب یہ تھا کہ میں بھی اس لشکر کے ساتھ ہوں اور میرا نام بھی مجاہدوں میں شامل ہو۔

ٹھیک یہی زمانہ تھا جب ایک واقعہ کا میری زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ منجھلے ابا کے بیٹے جن کا نام اشفاق حسین ہے اور جنہیں ہم پٹن بھائی کہتے ہیں مجھے خاکساروں کا ایک مظاہرہ دکھانے لے گئے جس میں مصنوعی جنگ کا پروگرام بھی شامل تھا۔ شام کا وقت تھا۔ خاکسار اپنی وردیوں میں بیلچے لگائے، چپ راست کرتے ہوئے جنگی مظاہرہ کر رہے تھے کہ تیز بارش شروع ہو گئی مگر تماشائیوں کے جوش و اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ کوئی آدمی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ مجھے یہ سارا منظر

اب تک یاد ہے، میں اس میں ڈوب سا گیا تھا۔ مظاہرہ کرنے والوں میں ایک گیارہ بارہ برس کا بچہ بھی شامل تھا۔ سرخ و سفید سرحدی بچہ۔ اپنی خوبصورت وردی میں ننھا سا بیلچہ لگائے مجھے اتنا اچھا لگا کہ دعا مانگنے لگا کہ کاش اس کی طرح میں بھی خاکسار تحریک کے مجاہدوں میں شامل ہو جاؤں۔ تب سے خاکسار تحریک سے مجھے شدید دلچسپی پیدا ہو گئی۔ خاکسار مجاہدین میری نظر میں خالد بن ولیدؓ کے جدید لشکر کا نیا روپ تھے۔ بعد میں کانگریس حکومت نے خاکساروں پر گولی چلائی جس میں متعدد خاکسار شہید ہوئے۔ اس واقعہ نے خاکساروں سے میری دلچسپی اور ہمدردی کو عشق تک پہنچا دیا۔

ہمارے محلے میں ایک خاکسار ہوتے تھے جن کے پاس علامہ مشرقی کا اخبار "الاصلاح" آتا تھا۔ میں نے ان سے لے کر وہ اخبار پڑھنا شروع کر دیا اور ان سے علامہ اور ان کی تحریک کی باتیں سننے اور کرنے لگا۔ خاکسار تحریک سے میری یہی دلچسپی تھی جو میرٹھ میں پروفیسر کرار حسین سے میرے تعلق کی بنیاد بنی۔ میں جب لکھنؤ سے میرٹھ آیا تو میرے ایک دوست نعیم قریشی مرحوم جو خود بھی خاکسار تھے، پروفیسر کرار صاحب سے میری ملاقات کا سبب بنے اور میں اس گروپ میں شامل ہو گیا جسے میرٹھ میں "الامین" گروپ کہا جاتا تھا۔ اختر حمید خاں، اختر حامد خاں، رؤف صاحب، یونس منصور یہ سب لوگ اسی گروپ کے روح رواں تھے۔ اختر حامد خاں سے مجھے ایک خصوصی تعلق پیدا ہو گیا۔ یونس منصور اب بھی ملتے ہیں تو سارا ماضی زندہ ہو جاتا ہے۔

خاکسار مسلم لیگ سے خوش نہیں تھے اور "الامین" کا انٹلکچوئل گروپ تو مسلم لیگی ذہنیت ہی سے بیزار تھا مجھے خود مسلم لیگی قیادت اچھی نہیں لگتی تھی اور میں انہیں ٹوڈی، کاسہ لیس، مطلب پرست اور انگریزوں کا ایجنٹ سمجھا کرتا تھا۔ کرار صاحب کی رہائش گاہ پر ہم لوگ رات کو جمع ہوتے تو گفتگو کا ایک حصہ مسلم لیگ کی تنقید کے لئے بھی وقف ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں بھی مسلم لیگیوں کو یہ مسلم لیگی، کہہ کر ان کا مذاق اڑانے میں پیش پیش ہوتا۔ مسلم لیگ کے پاکستان کی جگہ میرا نصب العین پورے برصغیر میں خلافت اسلامیہ کا قیام تھا۔ کیوں اور کیسے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن خاکسار تحریک کی عسکریت شاید لاشعوری طور پر میرے ذہن میں اسی سوال کا جواب تھی۔

۴۵ء میں محمد حسن عسکری میرٹھ آگئے۔ میں ماہنامہ "ساقی" میں ان کی جھلکیاں پڑھ پڑھ

کرار کا عاشق ہو گیا تھا۔ وہ میرٹھ آئے تو چند ہی ملاقاتوں میں ان سے گہرا ذاتی تعلق پیدا ہو گیا جو آج تک میری زندگی کے مقدس ترین رشتوں میں سے ایک ہے۔ عسکری صاحب کٹر مسلم لیگی تھے اور اس زمانے میں جب برصغیر کے سارے ادیب ترقی پسند بنے ہوئے تھے، عسکری صاحب وہ واحد آدمی تھے جو کھل کر مسلم مفاد کی بات کرتے تھے۔ انہیں پاکستان سے عشق اور قائداعظمؒ سے شدید عقیدت تھی اور وہ اسی زمانے میں کئی مضامین پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت میں لکھ کر بدنام ہو چکے تھے۔ انہوں نے مجھے مسلم لیگ کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ اب میرے دل میں کرار حسین اور عسکری کے درمیان ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک طرف کرار حسین اور خاکسار تحریک تھی، دوسری طرف عسکری صاحب اور مسلم لیگ۔ میں عسکری صاحب کی باتوں سے متاثر تو ہونے لگا تھا مگر پلڑا کرار حسین کی طرف زیادہ جھکتا تھا۔ فیصلہ کن بات اس وقت ہوئی جب مولانا شبیر احمد عثمانی مسلم لیگ کی طرف سے میدان میں اترے۔ لیاقت علی خاں کا الیکشن ہونے والا تھا۔ مولانا عثمانی کی تقریر نے مجھے بالکل بدل کر رکھ دیا۔ مولانا عثمانی نے مسلم لیگ کی حمایت میں جو مہم شروع کی تھی اس کا آغاز میرٹھ سے ہوا۔ میرٹھ جمعیت العلمائے ہند کے زیر اثر تھا اور مولانا مدنی کی وہاں بڑی مان دان تھی۔ مولانا عثمانی نے جب اپنے پہلے جلسے کی تقریر کی تو پورا میرٹھ اُمنڈ پڑا اور ایک تقریر نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ اگلی صبح سارا شہر مولانا عثمانی کے گُن گا رہا تھا۔ یہ تقریر میری زندگی میں ایک بنیادی تبدیلی کا سبب ثابت ہوئی۔ مسلم لیگ اور پاکستان کے بارے میں عسکری صاحب نے میرے خیالات کو پہلے ہی متاثر کر دیا تھا۔ اگلی صبح میں کچھ طالب علموں کے ساتھ مولانا عثمانی سے ملنے گیا۔ مولانا عثمانی نے میری بات سن کر صرف ایک بات کہی "تم خلافت اسلامیہ چاہتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ اس کا امکان وہاں زیادہ ہے جہاں ہندو اکثریت میں ہوں یا وہاں زیادہ ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو؟" بس یہ بات سن کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے ذہن کی قلب ماہیت ہو گئی ہے۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ میں ان کے پاس سے لوٹا تو پورا مسلم لیگی بن چکا تھا اور پاکستان میرے نصب العین کا حصہ ہو گیا تھا۔

بات لمبی ہو گئی مگر ایوب خان کے دورِ آخر میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وطنِ عزیز بہت جلد ایسے خطرات سے دوچار ہونے والا ہے جن کے نتائج پوری قوم کے لئے تباہ کن ثابت ہوں گے۔ جب

ایوب خان کی آمریت بر طرف ہوئی اور یحییٰ خان نے انتخابات کا اعلان کیا تو مجھے یقین کی حد تک احساس تھا کہ یہ الیکشن پاکستان کی تاریخ میں فیصلہ کن ثابت ہو گا۔ پاکستان اور اسلام کو میرے نزدیک بڑے خطرات در پیش تھے۔ ان کے پیش نظر یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اس صورت حال میں تماشائی بن کر رہ سکتا۔ میں اس میں اپنی بساط برابر حصہ لینا چاہتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر اس موقع پر میں نے اس میں حصہ نہ لیا تو میری پوری زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں حصہ لینے کی صورت کیا ہو گی۔ میں اسی کشمکش اور سوچ بچار میں تھا کہ الطاف حسن قریشی صاحب نے مجھے پیغام بھیجا کہ وہ کراچی سے جسارت نکال رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ میں اس کے لئے کالم لکھوں۔ جسارت جماعت اسلامی کا اخبار تھا جو ادیبوں اور دانشوروں میں سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور "جماعتیہ" ہونا ایک گالی سمجھا جاتا تھا۔ مگر اپنے اسلامی نصب العین کی وجہ سے مجھے جماعت سے یک گونہ ہمدردی ہمیشہ محسوس ہوتی رہی ہے۔ الطاف حسن صاحب نے مجھے آفر دیا تو میں نے اسے غیب کا ایک اشارہ سمجھا۔ خدا نے مجھے پاکستان کی بقا اور تحفظ کی جنگ میں حصہ لینے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فوراً ہاں کہہ دی۔

اس زمانہ میں مجھ پر دیوانگی سی طاری تھی۔ میں اپنی دانست میں پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف میدان جہاد میں کود پڑا تھا۔ خالد بن ولیدؓ اور ضرار بن ازورؓ کے دستے روانہ ہو چکے تھے، میں ان دستوں کا ایک سپاہی تھا۔ مجھے جان کی بازی لگا کر اپنا فریضہ ادا کرنا تھا۔ میں دن میں چار چار مضامین لکھتا جو "جسارت" اور "زندگی" میں کچھ میرے نام سے اور کچھ فرضی ناموں سے شائع ہوتے۔ میں نے اس زمانے میں سیاسی مسائل پر جتنا لکھا وہ میری زندگی کی یادگار تحریریں ہیں۔ میں انہیں اپنے وجود کی پوری قوت سے لکھ رہا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بچپن سے لے کر آج تک میری پوری زندگی کے شدید ترین جذبات ان تحریروں میں سمٹ آئے ہیں۔

الیکشن کا جو نتیجہ نکلا اور اس کے بعد وطنِ عزیز کو جن بحرانوں سے دوچار ہونا پڑا وہ اب اجتماعی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ الیکشن میں جماعت اسلامی اور دائیں بازو کی تمام جماعتوں کی شرمناک اور المناک شکست نے میرے شعور اور احساس کو دو نیم کر دیا۔ الیکشن کا نتیجہ نکلنے کے بعد میں تین راتوں تک سو نہ سکا۔ خاموش بیٹھا چائے اور سگریٹ پیتا رہا۔ اس عالم میں میری پوری زندگی فلم کی

میرے اندر نہ جانے کیسا دھماکہ ہوا کہ تصویروں کی طرح میری نگاہوں کے سامنے پھرنے لگی، لاشعور کے تاریک نہاں خانوں سے نکل کر بچپن سے لے کر ۷۱ء تک کے تمام واقعات و حالات اس حالت میں نہ جانے کیا ہوا کہ خود بخود شعور میں آ گئے۔ میں خیالوں اور یادوں کی گزر گاہ بن گیا۔ بے خودی "مشرق ہار گیا" کا آغاز ہو گیا۔ ایک طوفان کی طرح یہ نظم میرے پورے وجود پر چھا گئی۔ مجھے اس نظم کی ادبی اور کا ایک عالم تھا، میں روتا جاتا تھا اور لکھتا جاتا تھا، لکھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ شعری اہمیت پر اصرار نہیں ہے ممکن ہے کہ جمالیاتی اعتبار سے یہ ایک بالکل ناقص نظم ہو لیکن شاعری اگر روح کی پکار اور ایک پوری زندگی کا ثمر ہے تو یہ نظم یقیناً ایسی شاعری ہے جو میرے وجود کی پوری معنویت کا اظہار کرتی ہے۔

اس نظم میں اقدار و عقائد کی اس شکست کا بیان ہے جس کی علامت الیکشن میں دائیں بازو کی ہار ہے پھر یہ نظم میری پوری زندگی کو سمیٹتی ہوئی اس دور تک پہنچتی ہے جب ۶۴ء میں، میں ایک شدید اختلال ذہنی کا شکار ہوا تھا۔ اس ذہنی حادثے کے دوران میرا ذہن جس طرح حرکت کرتا تھا میں نے اس کی حرکت کو اسی طرح ریکارڈ کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح وہ میرے ذہن میں پیدا ہوئی تھی، ابھی یہ نظم نا مکمل ہے ارادہ تھا کہ اسے تین حصوں میں لکھوں گا۔ پہلا حصہ مشرق ہار گیا، دوسرا حصہ مغرب، تیسرا حصہ رب المشرقین ورب المغربین۔ جس میں، میں اس پورے دور کے بارے میں اپنے نظریات و خیالات پیش کروں گا۔ لیکن یہ نظم "نیند کی وادی" پر آ کر ختم ہو گئی اور ایسی غائب ہو گئی کہ اب اس کا کوئی سراغ میرے اندر موجود نہیں ہے، اگر کبھی اس کا گمشدہ سرا ہاتھ آیا اور نظم اس تصور کے مطابق مکمل ہوئی جو میرے ذہن میں موجود ہے تو اس پوری نظم کا نام "کشتی نُوح" ہو گا جو ایک عالمگیر سیلاب میں سلامتی اور نئی زندگی کا استعارہ ہے۔ بہر حال نظم اب تک جس صورت میں موجود ہے قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ یہ نظم نہیں میری روح کا ایک رزمیہ ہے۔

سلیم احمد

۲۴ جولائی ۱۹۸۳ء

چند ضروری گزارشات

بھائی صاحب نے اپنی زندگی میں جن سات کتابوں کی فوری اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا، ان میں ''اکائی'' (دوسرا ایڈیشن) ''اقبال ایک شاعر'' (دوسرا ایڈیشن) حاشیوں کے اضافے کے ساتھ) ''نئی نظم پورا آدمی'' (بارہ مضامین کے اضافے کے ساتھ) کے علاوہ چار نئی مطبوعات شامل تھیں۔ ''نئی شاعری نامقبول شاعری'' (مضامین کا مجموعہ) ''اسلامی نظام، مسائل اور تجزیے'' (اس موضوع پر کالموں اور مضامین کا مجموعہ) اور دو شعری مجموعے ''چراغ نیم شب'' اور ''مشرق'' (جلد اول) وہ چاہتے تھے کہ یہ ساتوں کتابیں ۱۹۸۳ء ہی میں ورنہ زیادہ سے زیادہ ۱۹۸۴ء کے وسط تک شائع ہو جائیں۔ اس کے لیے انھوں نے چھ کتابیں اپنے بعض احباب اور اداروں کو دے دی تھیں لیکن اللہ کو یہ کام ان کی زندگی میں منظور نہ تھا۔ چنانچہ ان چھ میں سے تین کتابیں ان کی وفات کے بعد شائع ہو چکی ہیں۔

ان کتابوں میں ''مشرق'' (پہلی جلد) وہ واحد کتاب تھی جس کو وہ خود شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی حیات میں اس کی کتابت کرا لی تھی اور پریس کا مرحلہ باقی تھا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انھوں نے مشرق کا منصوبہ ایک طویل نظم کی صورت میں بنایا تھا۔ اور جیسا کہ انھوں نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ نظم تین حصوں میں منقسم ہوتی۔ مشرق، مغرب اور رب

المشرقین ورب المغربین۔ اس نظم میں ۲۸ سے ۳۰ ہزار مصرعے ہوتے لیکن اپنی معاشی اور گھریلو ذمہ داریوں کے پیش نظر ان کی زیادہ توجہ کمرشل تحریروں پر دینی پڑی اور یہ منصوبہ بروقت تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن انھوں نے اس کا پہلا حصہ یعنی مشرق تقریباً مکمل کر لیا تھا جس میں کم و بیش سات ہزار مصرعے تھے۔ ظاہر ہے کہ صرف مشرق ہی کی اشاعت کوئی آسان اور سہل کام نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے مشرق کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پہلی جلد کی اشاعت کا کام شروع کرا دیا تھا اور دوسری جلد کی اشاعت کو موخر کر دیا تھا۔ ان کی رحلت کے بعد ہم لوگوں نے یہ طے کیا کہ مشرق کی اشاعت اب اکٹھا ہی ہونی چاہیے۔

جب مشرق کے مسودے کو اکٹھا کیا گیا تو یہ انکشاف ہوا کہ انھوں نے مختلف اوقات میں مشرق کی جو نقول تیار کرائی تھیں ان میں سے کوئی بھی مکمل نقل موجود نہیں ہے اور بعض نظر ثانی شدہ نقول موجود نہیں تھیں۔ بہر حال کچھ ان کی لکھی ہوئی ابتدائی کاپیوں اور کچھ نامکمل اور بعض نقول کے الگ الگ حصوں کے ذریعے مشرق کے موجودہ مسودے کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس پورے کام میں عزیزی قرۃ العین سلیم، عزیزی معین الدین احمد اور برادرم جمال پانی پتی نے جس محنت اور دیدہ ریزی سے اس کام کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹایا وہ محبت ہی کرا سکتی تھی۔ بہر حال اس پورے کام پر نظر ڈالتے ہوئے تین باتیں وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں۔ نظم کے ایک حصے اسٹوڈیو نمبر ۹ کی نظر ثانی کے بعد بھائی صاحب نے اس کو بہت بڑھا دیا تھا جو موجودہ مسودے سے ڈیوڑھا تھا، یہی صورت صنم کدہ پروڈکشن کی تھی اس کی مکمل اور آخری شکلیں غائب ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مکالمہ جوانا، تخلیقی انا اور فنکار کے موضوع پر تھا وہ بھی نہیں مل سکا ہے۔ مشرق کے بارے میں بھائی صاحب نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل کچھ ہدایات بھی دی تھیں۔ آخری مسودے کی تیاری میں ان کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس طرح ہمارے پاس جو بھی مواد موجود تھا اس پر مشتمل یہ نظم پیش کی جا رہی ہے۔

مشرق کی اشاعت کے لئے برادرم افتخار عارف نے اپنی کراچی کی "ایک آمد" کے موقع پر مجھ سے زبانی بات کی تھی۔ پھر بعد میں کچھ خط و کتابت بھی رہی۔ بالآخر یہ کتاب ان کی خواہش پر ان کے

حوالے کردی گئی۔ جواب ان کے زیر اہتمام شائع ہو رہی ہے۔ یہ بھائی صاحب سے ان کی محبتوں اور تعلق خاطر کا اظہار ہے۔ چونکہ مشرق پہلی بار سامنے آ رہی ہے اس لیے ایک اشارہ ضروری ہے کہ اس کے مختلف حصے مشرق میں بیسویں صدی کی عالمی انسانی صورت حال کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ یہ نظم بھائی صاحب کی زندگی، ان کے مشاغل اور دوستوں کے حوالے سے ایک شخصی سفر کی روداد بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک تمثیلی اور رمزیہ انداز میں زندگی کے مختلف مظاہر اور رویوں کا اظہار بھی، یہی اس کی وہ معنویت ہے جس کی وجہ سے یہ "سفینۂ نوح" کی علامت میں تکمیل پائی۔ ان متنوع رویوں اور مختلف کرداروں کے ساتھ "مکالموں" کی صورت میں بیسویں صدی میں مشرق کے موجودہ معاشروں بالخصوص برصغیر پاک و ہند کی زندگی کے بعض بنیادی سوالات اور مسائل پر ایک فکری نظر بھی ڈالی گئی ہے۔

شمیم احمد

سخنہائے گفتنی

سلیم بھائی کو گزرے ہوئے چھ برس ہو گئے۔ اب بھی جی نہیں مانتا کہ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ وہ کون تھے؟ کیا تھے؟ انہوں نے کیا کچھ کیا؟ اردو ادب میں ان کا مقام کیا ہے؟ موجودہ نسل سے ان کا کیا رشتہ تھا؟ وہ رجعت پسند تھے یا ترقی پسند؟ کیا ان کی شخصیت پر کوئی لیبل لگایا جا سکتا ہے؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالات ہیں جن کے جوابات اس عہد کے دانشوروں اور ادیبوں پر قرض ہیں۔ غنیمت ہے کہ کچھ نے یہ کام شروع بھی کر دیا ہے۔ قرضہ بڑا ہے، قسط وار بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ کاش قسطوں کی ادائیگی میں ناہمواری اور کمی نہ ہو۔ اس درازنفسی سے سلیم بھائی کے پرستاروں اور محبت کرنے والوں پر خدانخواستہ اعتراض کرنا ہرگز مقصود نہیں اور پھر اس مسئلہ میں بولنے والا میں کون؟

جہاں تک سلیم بھائی سے میری محبتوں، حوالوں اور نسبتوں کا تعلق ہے ان کی نہ مجھے تشہیر کی ضرورت ہے اور نہ یہ اظہار کا کوئی موقع ہے۔ ان امور میں گواہی اور سندِ خوشنودی کا یوں بھی میں قائل نہیں۔ اور یہ ؎

بڑی طویل کہانی ہے پھر کبھی اے دوست

سلیم بھائی کی زندگی میں دراصل ان کے دو شعری مجموعے "بیاض" ۱۹۶۶ء اور "اکائی" ہی

منظرِ عام پر آسکے۔ دونوں مجموعوں کے درمیان پندرہ سال سے زیادہ کا وقفہ تھا۔ "اکائی" (لاہور، ۱۹۸۲ء) گو ان کی زندگی میں شائع ہوئی لیکن اس میں کتابت و طباعت کی غلطیوں کی بھرمار تھی اور سلیم بھائی اس اشاعت سے قطعاً خوش نہیں تھے۔ "اکائی" کا تصحیح شدہ ایڈیشن (فروری ۱۹۸۵ء) ان کی وفات کے بعد تنظیم احباب میرٹھ، کراچی کی جانب سے شائع ہوا۔ تیسرا شعری مجموعہ "چراغِ نیم شب" (۱۹۸۵ء) مکتبہ اسلوب کراچی نے چھاپا۔

سلیم بھائی کا چوتھا شعری مجموعہ "مشرق" آپ کے سامنے ہے۔ "مشرق" کئی اعتبار سے بڑا اہم، توجہ طلب، فکر انگیز اور شاید آخری مجموعۂ منظومات ہے۔ اس میں شامل سارے مواد کی تیاری و ترتیب سلیم بھائی اپنی زندگی میں کر چکے تھے۔ اس کی اکثر نظمیں سلیم بھائی کے بہت سے احباب اور قریب کے لوگ ان سے سن بھی چکے ہیں۔ بعض منظومات ناتمام صورت میں ادھر اُدھر شائع بھی ہو چکی ہیں۔ حلقہ یاراں میں چند نظموں پر خاصی گفت و شنید بھی رہی ہے۔ سلیم بھائی کی خواہش تھی کہ کسی طرح "مشرق ہار گیا"، "البم" اور دیگر متعلقہ منظومات کتابی صورت میں ان کے سامنے چھپ جائیں۔ میرا بھی ان سے اَن کہا وعدہ تھا کہ اس سلسلے میں جو ناچیز سے بن پڑے گا، کرے گا۔ جب سلیم بھائی ہم سے جدا ہو گئے تو میں نے وعدے کا اعلان بھی کر دیا۔ ایفائے عہد میں تاخیر ہوئی۔ دشواریوں کی تفصیل اب بیان کرنا لاحاصل ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ باعثِ تاخیر صرف میں ہوں، بہر حال اللہ کا شکر کہ آخر کار اس نے مجھے سرخرو کیا۔

"مشرق" دو فصلوں اور انیس طویل یا طویل تر نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے جس میں "مشرق ہار گیا" محوری حیثیت رکھتی ہے۔ میرے خیال میں یہ نظم نہ صرف اس مجموعے کی بلکہ ہمارے عہد کی بہترین طویل نظموں میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہاں دورِ حاضر کی طویل نظموں کا جائزہ لینا مقصود نہیں، مقبول رومانوی یا احتجاجی رنگ کے ممتاز و معتبر شعراء کی فہرست نگاری کا بھی محل نہیں۔ بات "مشرق" کی ہے، جس کے بعض حصوں سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے، مجھے بھی ہے، لیکن اثر انگیزی میں کلام نہیں۔ اسی کتاب میں ایک اور معرکہ آراء نظم "مکاشفہ" کے علاوہ انتہائی دلچسپ اور شخصی خاکوں پر مشتمل البم نمبر (۱) البم نمبر (۲) جیسی نظمیں بھی موجود ہیں جن میں سلیم بھائی

نے ایک اچھے مصور کی طرح صرف چند لکیروں کی مدد سے مہارت و چابک دستی کے ساتھ متاثر کن اور زندہ خاکے ابھارے ہیں۔ ایک شاعر کے مشاہدے، ذہانت اور حساسیت سے ان کا خمیر اٹھا ہے۔ یہاں بھی کہیں کہیں نقطۂ نظر اور زاویہ نگاہ کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن نیک نیتی اور اخلاص میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

میں کتاب کے سارے مشمولات پر روشنی نہیں ڈالوں گا۔ صرف یہ عرض کر کے رخصت چاہوں گا کہ "مشرق" میرے لئے تو سلیم بھائی کی ایک یادگار اور اہل شعر و ادب اور دانشوروں کے لئے سوغات ہے۔ وہ لوگ اور قارئین جو اتفاق سے شاعر سلیم احمد سے کبھی ملے اور ان کی شخصیت اور فکر و فن کے ارتقاء اور جہتوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں اور اسی حوالے سے شاید ان کے ذہنوں میں بہت سے سوالات ہوں گے۔ "مشرق" ان ہی تمام سوالات کا جواب ہے۔

افتخار عارف

اردو مرکز، لندن

مشرق ہار گیا

کپلنگ نے کہا تھا:

"مشرق" مشرق ہے

اور مغرب مغرب ہے

اور دونوں کا ملنا ناممکن ہے"

لیکن مغرب، مشرق کے گھر آنگن میں آپہونچا ہے

میرے بچوں کے کپڑے لندن سے آتے ہیں

میرا نوکر بی بی سی سے خبریں سنتا ہے

میں بیدلؔ اور حافظؔ کے بجائے

شیکسپیئر اور رلکے کی باتیں کرتا ہوں

اخباروں میں

مغرب کے چکلوں کی خبریں اور تصویریں چھپتی ہیں

مجھ کو چگی داڑھی والے اکبرؔ کی کھسیانی ہنسی پر

۔۔۔۔رحم آتا ہے
اقبال کی باتیں (گستاخی ہوتی ہے)
۔۔۔۔مجذوب کی بڑ ہیں
وارثؔ شاہ اور بُلھےؔ شاہ اور بابا فریدؔ؟
چلئے جانے دیجئے ان باتوں میں کیا رکھا ہے

مشرق ہار گیا ہے!
یہ بکسرؔ اور پلاسیؔ کی ہار نہیں ہے
ٹیپو اور جھانسی کی رانی کی ہار نہیں ہے
سن ستاون کی جنگ آزادی کی ہار نہیں ہے
ایسی ہار تو جیتی جا سکتی ہے (شاید ہم نے جیت بھی لی ہے)
لیکن مشرق اپنی روح کے اندر ہار گیا ہے

قبلا خاںؔ تم ہار گئے ہو!
اور تمہارے ٹکڑوں پر پلنے والا لالچی مار کو پولوؔ
۔۔۔۔جیت گیا ہے
اکبر اعظم! تم کو مغرب کی جس عیارہ نے تحفے بھیجے تھے
اور بڑا بھائی لکھا تھا
اس کے کتے بھی ان لوگوں سے افضل ہیں
جو تمہیں مہابلی اور ظل اللہ کہا کرتے تھے
مشرق کیا تھا؟
جسم سے اوپر اٹھنے کی اک خواہش تھی
شہوت اور جبلت کی تاریکی میں

مشرق

اک دیا جلانے کی کوشش تھی!
میں سوچ رہا ہوں، سورج مشرق سے نکلا تھا
(مشرق سے جانے کتنے سورج نکلے تھے)
لیکن مغرب ہر سورج کو نگل گیا ہے

"میں ہار گیا ہوں"
___میں نے اپنے گھر کی دیواروں پر لکھا ہے
"میں ہار گیا ہوں"
میں نے اپنے آئینے پر کالک مل دی ہے
اور تصویروں پر تھوکا ہے
ہارنے والے چہرے ایسے ہوتے ہیں
میری روح کے اندر اک ایسا گہرا زخم لگا ہے
جس کے بھرنے کے لیے صدیاں بھی ناکافی ہیں
میں اپنے بچے اور کتے دونوں کو ٹیپو کہتا ہوں

مجھ سے میرا سب کچھ لے لو
اور مجھے اک نفرت دے دو
مجھ سے میرا سب کچھ لے لو
اور مجھے اک غصہ دے دو
ایسی نفرت، ایسا غصہ
جس کی آگ میں سب جل جائیں
___میں بھی!!

میں اور وہ

"ہیلو!"

"ہیلو!"

"شام کو تم کہیں چل رہے ہو؟"

"نہیں آج گھر پر رہوں گا"

"تم کہیں جا رہے ہو؟"

"ارادہ تو ہے"

"کہاں؟"

"میٹروپول میں پرنسز زرینہ کا شو ہے

---- چلو گے؟"

"نہیں یار! ان تین پیسے کی شہزادیوں سے

---- میرا جی بھر چکا ہے"

"وہاں کون ہوگا؟"

"وہی مسخرے جن کی دانشوری سے میں تنگ آ چکا ہوں"

"وہی گنجے افسر جنہیں عورتوں، رشوتوں، دفتری سازشوں کے سوا کوئی موضوع نہیں ہے"

"نہیں یار! میں ان بھری توند والے غبی تاجروں سے بہت بور ہوں"

"تم چلے جاؤ"

"پھر ملاقات ہوگی خدا حافظ"

میں نے ریسیور میز پر رکھا اور ایش ٹرے کو دیکھا

آدھی سگریٹ سلگ رہی تھی

میں نے اس سے دوسری سگریٹ سلگائی

اور صوفے پر بیٹھ گیا

میں کتنا تھکا ہوا ہوں!

بیزاری میری رگ رگ میں اتر گئی ہے

"ننگی تصویریں" دیکھنے میں بھی جی نہیں لگتا

(یہ ایک ادیب کا بتایا ہوا نسخہ تھا جو فیل ہوا)

تنہا رہنے کی خواش واحد خواہش ہے

جو اپنے اندر پاتا ہوں

اور تنہائی سے ڈرتا بھی ہوں!

اکثر لوگوں کا سرمایہ یادیں ہوتی ہیں

مجھ کو کوئی بات یاد نہیں آتی

(خود پسندی یادوں کی دشمن ہوتی ہے)

سورج آہستہ آہستہ اپنے لمبے سفر کو طے کرتا

گھر کی دیواروں پر آپہونچا ہے

سائے لمبے ہونے لگے ہیں

دور افق پر آگ لگی ہے

سورج اس آگ میں جل جائے گا!

میں شام کی ٹھنڈی راکھ کریدوں گا

اور ایش ٹرے میں سگریٹ جلتے بجھتے رہیں گے

رات ہو گئی

بلب کی ملگجی روشنی شب کی میت پہ نوحہ کناں ہے

دور گلیوں میں کتوں کے رونے کی آواز

اک ماتم بے سبب کا پتہ دے رہی ہے

راستے بے دلیل آرزوؤں کی مانند

الجھے ہوئے ایک انجانی منزل کی جانب رواں ہیں

میں تنہا چلا جا رہا ہوں!

میرے قدموں کی آواز میرے تعاقب میں ہے

کبھی میرا سایہ سمٹتا، کبھی پھیلتا ہے

کبھی ایک سائے سے کچھ اور سائے نکلتے ہیں

چاروں طرف بھاگتے ہیں!

میں دہشت زدہ ہوں

سبب کچھ نہیں ہے

مگر میرے اوہام صدیوں کی تاریخ سے

۔۔۔۔ میرے ہمراہ ہیں!

دیوتاؤں کے اسطور،

جوگیوں کی حکایات،

پیروں فقیروں کے قصے

مرے خون میں ہیں

مرے جسم میں آریا اور سامی لہو کا تصادم ہے

مری ذات میں دو سمندر ہیں

جن کی لہریں جدا اور طوفان اک دوسرے سے

۔۔۔۔بہت مختلف ہیں!

(یہ میرے تعاقب میں کون آ رہا ہے؟)

گھٹتے بڑھتے سائے مجھ کو گھیر رہے ہیں

میں ان کے نرغے میں ہوں

خوف اور دہشت سے کانپ رہا ہوں

جیسے طوفان کے جھکڑ میں پودے کانپ اٹھتے ہیں

میں نے ان سایوں میں اک شخص کو دیکھا

جس کی آنکھوں میں وہ وحشت تھی

۔۔۔۔جو ویرانوں میں ہوتی ہے

سر اور پیروں پر گرد جمی تھی

داڑھی الجھی ہوئی تھی

وہ ایک نظر میں وحشی، جینیس اور پاگل لگتا تھا

ایک خیال سا یہ آسا

مجمع کو

(جس میں، میں بھی اک سایہ تھا)

مخاطب کر کے

وہ پاگل چیخ رہا تھا

یہاں آؤ اور میری باتیں سنو

سنو دشتِ ظلمات میں چاند کجلا گیا ہے

ستارے کہن سال زندانیوں کی طرح

جاں کنی میں گرفتار ہیں

اور سورج کو امیدِ فردا نہیں ہے

مرے چار جانب گھٹاٹوپ اندھیرے کی دیوار ہے

اندھیرا کہ جو وسعتوں میں زمیں بن گیا ہے

اندھیرا کہ جو رفعتوں میں فلک ہو گیا ہے

اندھیرا کہ جو ابنِ آدم کا مسکن رہا ہے

مرے دونوں ہاتھوں میں کچھ بھی نہیں

راکھ ہے----

میں اس راکھ کو اپنے چہرے پہ مل کر کھڑا ہوں

----خدا ہے تو فریادرس ہو

----خدا ہے تو فریادرس ہو

----خدا ہے تو فریادرس ہو!

مگر وہ خدائے بزرگاں کہاں ہے

جو "نور السموت والارض" ہے

حیؔ و قیوم ہے

----وہ خدائے بزرگاں کہاں ہے؟

کوئی کہہ رہا ہے "خدا کھو گیا ہے"

مجھے ایک بوڑھے نے سرگوشیوں میں بتایا

---"خدا ایک لمبے سفر پر گیا ہے"

ابھی اک جنونی یہ چلا رہا تھا "خدا مر گیا ہے"

سنو دوستو! میں حقیقت کا، اُس تجربے کا

جو تم اپنی روحوں میں محسوس کرتے ہو

منکر نہیں ہوں

جو تم دیکھتے ہو وہ حق ہے

جو کچھ آئینے میں جھلکتا ہے حق ہے

مگر آدمی آئینے کی طرح، حقیقت کی معکوس تعبیر

---میں مبتلا ہے

حقیقت جو میں دیکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ

---"ہم کھو گئے ہیں"

ہمیں ایک پُر ہول، صبر آزما، سمت و منزل سے عاری

سفر پر روانہ ہوئے ہیں

ہمیں مر چکے ہیں!

سنو دوستو! تم کو معلوم ہے

آدمی کیا ہے؟

وجود اور موجود کے درمیاں رشتۂ دید ہے

مقید سے مطلق کی جانب سفر ہے

اگر صاف کہہ دوں تو مطلق کا گھر ہے

مگر دوستو!

"رشتہ دید گم ہو گیا ہے"
تو جب میں نے تم سے کہا ہے کہ ہم کھو گئے ہیں
تو اس کا فقط اتنا مفہوم ہے
ہمارا سفر اب مقید سے مطلق کی جانب نہیں ہے
مقید مقید میں محصور ہو کر
اسی تنگ زنداں کی حد ناپتا ہے
ہمیں مر چکے ہیں کہ مطلق کا گھر منہدم ہو چکا ہے

میں نے دیکھا اس کی باتوں پر مجمع سے اک شور اٹھا
"پاگل ہے بے پاگل ہے!"
یا "چڑیا گھر سے آیا ہے"
کچھ لڑکوں نے جن کی قلمیں بڑھی ہوئی تھیں
اور بالوں کے گچھے پیشانی پر تھے
زنخوں کی طرح کولہے مٹکا کر شور مچایا

چپ ہو جا بے ماضی کے مردے!
تو شاید قبر سے اٹھ کر آیا ہے
یا تجھ کو امریکی سرکس والوں نے بلوایا ہے
"ہاہاہاہا"
"ہی ہی ہی ہی"
"ہو ہو ہو ہو"
اک لڑکی جس کی چھاتیاں ابلی پڑتی تھیں

اور شاید نقلی تھیں
اپنے بوائے فرینڈ کے سینے سے لپٹی
چیونگم کھاتی تھی
اس نے ہونٹ بنائے
اور بوسہ پھینک کے ٹھینگا دکھلایا
مجمع سے پھر شور اٹھا
"تاک دھنا دھن تاک
تاک دھنا دھن تاک
ناچ جمورے ناچ"
"تو اور تیرا خدا دونوں
جب تک بھنگڑا ناچ نہیں ناچیں گے
ہم تیری بات نہیں سنیں گے
اس کو تو دفنا دیں گے
تجھ کو پاگل خانے پہونچا دیں گے"
"تاک دھنا دھن تاک
ناچ جمورے ناچ"

اس نے مجمع کو ایک گہرے دکھ سے دیکھا
دکھ تو اس کا مقدر تھا
جو عیسیٰ اور سقراط سے اب تک
ہر سچے انسان کے لیے
انعامِ خدا ہے

حق کی گواہی کی (جنت میں نہیں) دنیا میں جزا ہے!
وہ بولا: "میرے بچو، میں ناچوں گا!
تم کہتے ہو تو میں ناچوں گا
میں ناچوں گا تو دھرتی ناچے گی
میں ناچوں گا تو سیارے ناچیں گے
میں ناچوں گا تو آفاق کی تنہا پہنائی میں
خواب و حقیقت کی وہ یکجائی ناچے گی
جو ساکن ہو کر ہی مکاں بنی ہے
اور حرکت میں زماں ہوئی ہے
یہ ناچ اجل کا ناچ بنے گا
اور اس کی نرت پر میرے بچو تم ناچو گے
ناچو!
تھک تھک تھک تھک تھیا تھیا
تھک تھک تھک تھک تھیا تھیا
ناچو! ناچو
ناچو! میرے پیمانے میں زہر کی بوندیں ناچ رہی ہیں
ناچو! میرے آئینے میں موت کے سائے ناچ رہے ہیں
ناچو! میرے سینے میں وہ آخری شعلہ ناچ رہا ہے
جس کو "ہستیِ آدم" کہتے ہیں!"
اور یکایک اس کی آنکھوں سے شعلے نکلے
اس پر ایسا غضب طاری تھا
جو انسانی غصے کی حد سے سوا ہے
بادل کی آواز میں گرجا

جن کے گھوڑوں کے پیروں میں بجلی ہے

دل کی جگہ سنگ ہیں!

جن کی آواز چڑھتے سمندر کی آواز ہے

وہ تری فصل کاٹیں گے

ترے بیل اور گائے اور تیرے گلوں کو کھا جائیں گے

تیرے انگور وانجیر و زیتوں نگل جائیں گے

میں اب دیکھتا ہوں

کہ تیرے بزرگوں کی قبریں اکھاڑی گئی ہیں

مقدس کفن نالیوں میں پڑے ہیں

بدن، ہڈیاں، کاسہ سر لڑھکتے ہوئے پھر رہے ہیں

ٹاٹ اوڑھو اور راکھ میں لیٹو

اپنے اکلوتوں کے ماتم کے لیے تیار رہو

ماتم! گلیوں اور بازاروں میں

ماتم! شہروں اور ویرانوں میں

ماتم! دریاؤں اور میدانوں میں

ماتم! صحراؤں اور پہاڑوں میں

اے کاش کہ میرا سر پانی ہوتا

اور آنکھیں چشمہ ہوتیں

تاکہ میں مرتے دم تک

تیرے اکلوتوں کے غم میں

رو سکتا!

مکاشفہ

اندھیرا

تہ بہ تہ گہرا اندھیرا

اور بے چینی

مری آنکھوں کے ویراں آشیانے

نیند سے خالی

کسی میت کو جیسے

دفن کر کے آئے ہوں

اک ایسی خاموشی

مجھے ایسا لگا جیسے

کہیں اک آگ ہو

جو قطرہ قطرہ بن کے

میری روح کے اندر ٹپکتی ہو

میرا سینہ بھبھک اٹھا

کہ جیسے اک دہکتی آگ کے تنور میں

پانی چھڑکنے سے

کئی شعلے لپکتے ہیں

مرے سینے کے شعلے دور تک پھیلے

فضائیں دور تک روشن ہوئیں

بیاباں، شہر، قریے

عظمتِ رفتہ کے نوحہ خواں کھنڈر

ویراں اور تنہا مساجد کے منارے

جانے کیا کیا تھا

جو میری آنکھ نے دیکھا

وہ سب روشن ہوئے

اور روشنی سے روشنی پھوٹی

مجھے ایسا لگا

جیسے کہ میں اس روشنی میں

سر برہنہ، پا برہنہ، تن برہنہ

یوں کھڑا ہوں

جیسے مردے حشر میں

قبروں سے نکلیں گے

خدا جانے

میں مردہ تھا کہ زندہ تھا

مجھے ایسا لگا

جیسے یہ محشر ہے

یہ محشر ہے
خدا ہے اور میں ہوں
"خداوندا تری نصرت کہاں ہے
فتح کتنی دور ہے"
اور یکایک یوں ہوا
جیسے کہ میری آنکھ نے دیکھا
کہ اک فوج گراں کا کوچ ہے
کوہ و بیاباں میں
اور اس کے پاؤں کی سنگیں دھمک سے
سینہ گیتی میں لرزہ ہے

نام کا سفر

اگرچہ نئی زندگی کی سبک رو ہوائیں
کہ آزاد ہیں
بارِ زنجیر فرسودگی
یعنی ناموں سے بیزار ہیں
نام نسل اور خوں کے
پرانے المناک رشتوں کو
میں بھی فقط اک شناخت
ایک پہچان ہی جانتا تھا
مگر پھر بھی ناموں کا منکر نہیں تھا
کہ ناموں کا جو علم تھا
اک عطائے خدا تھا
(فرشتوں پہ میری فضیلت
اسی علم سے تھی۔۔۔۔)

مگر تین سو سال پہلے کسی نے کہا
"نام میں (یعنی پہچان میں) کیا دھرا ہے؟"
اور اس وقت سے نام اک بار ہیں
جن سے ہم لوگ بیزار ہیں
مگر میں جو اک نام ہوں
ایک پہچان ہوں
چوالیس برس پہلے
یوپی کے اک گاؤں
کھیولی میں پیدا ہوا
یہ اک خطہ ہند ہے
جس سے میں
اور مری نسل کے لوگ
اپنے ناموں کی حرمت بچانے کی خاطر
جدا ہو گئے
اب مری نسل کے لوگ
اک بے زمیں قوم ہیں
جو آفاق کے بے کراں شہر میں
عارضی طور پر خیمہ زن ہیں
ہمارے قدم
اب کسی ٹھوس مٹی کے اوپر نہیں ہیں
کہ ہم نے کہا تھا
ہمیں اپنے ناموں کی تقدیس مٹی سے بڑھ کر ہے

مٹی

فقط تیرگی ہے

یہ مٹی جو انسان کے پیر جکڑے ہوئے ہے

فقط ایک زنداں ہے

زنجیر ہے

ہم نے مٹی کی زنجیر توڑی

کہ مکّہ سے یثرب کی ہجرت

ہمارے لیے

اک مقدس علامت تھی

ہم نے کہا

"ہم مہاجر ہیں"

اور خدائے محمد ﷺ کی بخشی ہوئی سر زمیں

اب ہمارا وطن ہے

ہمارا وطن

خدا اس کو تاحشر آباد رکھے

اور میں

اب نومبر کی اس رات کا تذکرہ کر رہا ہوں

کہ میں

جب فقط اپنی اچکن میں

مغل پورہ جنکشن پہ اترا تھا

اسے بیس اور تین

تمہیں۔۔۔ لمبے برس ہو چکے ہیں
مجھے فوج کے اک سپاہی نے
پانی پلایا
کہ میں اک نئی کربلا کا مسافر تھا
جو شرق سے غرب تک
مرے خوں سے تر تھی!
وہ بوڑھا سپاہی
مجھے یوں لگا
جیسے اک عہد تازہ ہے انصار کا
ہر مہاجر سے جو کہہ رہا ہے
"خدا اور محمد ﷺ کے ادنیٰ غلامو!
یہ یثرب ہے
اور تم بہت دور سے آئے ہو
آؤ۔۔۔ میں تم کو گھر لے چلوں
جہاں میں تمہارے
لہو بستہ چہرے کو دھوؤں گا
زخموں کو پونچھوں گا
اور پھر دونوں
جو کچھ بھی ہم کو میسر ہے
صبر اور شکر سے کھائیں گے
کیونکہ یثرب میں
بھائی بنانے کی رسم کہن ہے"

وہ تاریخ کا کتنا نازک سا لمحہ تھا

جب اک نئی اجنبی سرزمیں

مجھ کو اپنے گلے سے لگا کر

خوشی اور مسرت سے

یوں رو رہی تھی

کہ جیسے کوئی ماں

اپنے بچھڑے ہوئے لاڈلوں سے

ملے اور روئے۔۔۔

"ماں۔۔۔

میں تیرا بچہ ہوں

میں تیری دھرتی کو جوتوں گا

تیرے کھیتوں کو سینچوں گا

میری محنت کا سونا

تیری سنہری فصلیں بن کر چمکے گا

میں شہروں میں مزدور بنوں گا

دفتر میں فائل پہ لکھوں گا

ہل اور پہیہ اور قلم

سب میری محنت سے پھل پائیں گے

ماں۔۔۔

ہم سب تیرے بچے

تیرے لیے

اپنا خون پسینہ ایک کریں گے

تیرے دن پھر جائیں گے"

رات کے دو بجے تھے

پشت اک دوسرے سے لگائے

یخ کی مانند

پتھر کی اک بینچ پر

انتظار[1] اور میں

اپنے جسموں کی گرمی سے

اک دوسرے کو

ٹھٹھرنے سے محفوظ رکھنے کی بے سود کوشش میں

مصروف تھے

تھکن۔۔۔کہر کی طرح

روح اور جسم پر چھا رہی تھی

مگر نیند

اک ایسے بچے کی مانند

جو اپنی ماں سے خفا ہو

ہماری سلگتی ہوئی آنکھ سے دور تھی

مجھے یوں لگا

جیسے ہم دونوں

دنیا کے دو آخری آدمی ہیں

جنہیں

وقت و تاریخ نے
جانے کس مصلحت سے
گزرتی ہوئی ساعتوں کی گزرگاہ پر
جلتے بجھتے دیوں کی طرح رکھ دیا ہے

"وقت کیا چیز ہے؟"
میں نے سوچا
"گذشتہ سے آئندہ کا ربط کیا ہے؟
اور ان دونوں کے درمیاں
ہم کہاں ہیں"
"یہ لمحہ۔۔۔۔
کہ موجود ہے
کیا گذشتہ سے بالکل جدا ہے؟
جدا ہے
تو کیا میرے اکیس برسوں کے لمحات
اس وقت سے میرے اپنے نہیں ہیں؟
یہ اکیس سال۔۔۔۔
اور وہ آٹھ سو سال
جن کا دامن
میرے گمنام آبا کی بوسیدہ قبروں سے
لکھنؤ، آگرہ، سیکری، جونپور اور دکن
کے محلات اور مقبروں تک

سمندر کی لہروں کی مانند پھیلا ہوا ہے

وہ میرے نہیں ہیں؟

اگر ہیں

تو آئندہ لمحات ان کا تسلسل ہیں

یا ان سے بالکل جدا

مختلف قسم کا ایک آغاز ہیں

اگر یہ زماں و مکاں کی جدا سر حدیں ہیں

تو پھر ایک موجود لمحے میں

میں کون ہوں؟"

میں نے سوچا کہ حرفِ مشدّد کے مانند

شاید ــــــ میں ان دونوں کے درمیاں

ایک برزخ ہوں

جو وصل اور فصل

دونوں کی یکساں علامت ہے"

خیالات گویا پتنگے تھے

جو ہمارے سروں پر

چمکتے ہوئے بلب کے گرد

اک رقصِ بے تاب کرتے ہوئے

گر رہے تھے

مجھے نیند سی آ گئی

صبح کی نرم ونازک سی پہلی کرن
شوخ رنگوں کی تتلی کے مانند
اپنے چمکتے ہوئے پر کھول کر
میرے چہرے پہ منڈلا رہی تھی
انتظار اپنی مخصوص آواز میں
جو گلے کی خرابی کے باعث نہیں
ویسے ہی
بیٹھی بیٹھی سی لگتی ہے
یہ کہہ رہا تھا
''اٹھو یار۔۔۔۔
تم تو بہت سو چکے
اب اٹھو۔۔۔۔چائے پی لو
خبر ہے۔۔۔
ہماری ٹرین اب کہاں جائے گی
''کہاں۔۔۔؟''
میں نے آنکھوں کو ملتے ہوئے
چائے کی ایک چسکی لگا کر کہا
''ارے اب یہ سرگودھا جائے گی''
''سرگودھا کیوں؟ مگر ہم تو لاہور جائیں گے
کیوں۔۔۔؟
مگر ہم تو لاہور ہی جائیں گے؟''

"نہیں۔۔۔کچھ خبر ہے؟

غضنفر(۲)علی خان نے

گاڑی کو لاہور میں داخلے کی اجازت نہیں دی"

"اجازت نہیں دی۔۔۔؟"

مجھے چائے کا ذائقہ کچھ کسیلا لگا

"کیوں اجازت نہیں دی"

مگر انتظار اب نہ بولا

سڑپ سر، سڑپ سر، سڑپ سر، سڑپ سر

وہ خاموشی سے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا

اور بہت ہی بُرا لگ رہا تھا

"غضنفر علی کون ہے؟

میں تو اقبال کے شہر آیا ہوں

داتا کی نگری میں آیا ہوں

یہ وہ شہر ہے

جس کی خاطر مجھے

خوں کے سیلاب میں سے گزرنا پڑا ہے

غضنفر علی مجھ کو کیوں روکتا ہے"

"تم تو پاگل ہو"

میرا ساتھی جواب تک مرا دوست تھا

اجنبی بن کے کہنے لگا

"تم تو پاگل ہو"

ارے۔۔۔ہم اب نئی سرحدوں میں ہیں

اور یہاں۔۔۔۔

اک غضنفر علی خاں بھی ہوتا ہے"

میری سگریٹ مری روح کی طرح سلگی

اور اس کا دھواں

فضا میں بکھر کر

نئی طرح کی ایک تصویر

میرے خیالات کے کینوس پہ بنانے لگا

"چائے پی لو

تو پھر دونوں تانگے میں لاہور چلتے ہیں

تانگہ غضنفر علی خاں کے احکام سے اب بھی آزاد ہے"

"نہیں

میں نہیں جاؤں گا"

"تو پھر کیا کرو گے؟"

"میں کراچی چلا جاؤں گا"

تم تو پاگل ہو"

یہاں سے مری یاد کا سلسلہ

بے اماں درد کی ایک زنجیر ہے

جو مری روح سے جانے کتنے دلوں تک

پیچ در پیچ آکاس بیلوں کی مانند پھیلی ہوئی ہے

کراچی ابھی ایک آزردہ دل میزباں کی طرح
آنے والوں سے
بیگانہ آواز میں پوچھتی تھی
"پنہ گیر ہو---؟
یہاں کس لیے آئے ہو
تم کو کس نے بلایا ہے
کیا سوچ کر آئے ہو
تمہیں کیا زمینوں کے رشتوں کی حرمت کا احساس ہے؟
جب سے تم آئے ہو
میرے بچے مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں
کرم چند--- کل ہی گیا ہے
اسے جانتے ہو؟
نہیں جانتے---
تم زمینوں کے رشتوں کی حرمت سے واقف نہیں ہو
پنہ گیر ہو---"

پنہ گیر---
میں اب پنہ گیر تھا
مہاجر نہیں تھا
پنہ گیر اک لفظ ہے
مہاجر بھی اک لفظ ہے
مگر لفظ سے لفظ تک یہ سفر

کیا سفر تھا

کہ جس نے مجھے

ہر سفر سے زیادہ تھکایا

میں رونے کا قائل نہیں ہوں

اگر آپ چاہیں

تو کہیئے کہ قابل نہیں ہوں

کہ بے شک

کدورت کے اس ریگزارِ جہاں میں

کسی آنکھ میں نم نہیں ہے

مگر خشک پلکوں کی اک تھرتھری پر مرا بس نہیں۔

تو میں ایک ناخواندہ مہمان ہوں

دھرتی کا بیٹا نہیں ہوں

یہ سچ ہے

تو وہ رشتہ لفظ کیا ہے؟

جو حجاز و یمن سے

کراں در کراں

ارض در ارض

پھیلا ہوا ہے

وہ اک نخلِ طیب

کہ جس کی گھنی چھاؤں میں

مشرق

کتنی قوموں کا

نسلوں کا

مسکن ہے

جس کی شاخیں

فلک در فلک

عرشِ اعلیٰ کی روشن فضاؤں میں پھیلی ہوئی ہیں

وہ کیا ہے۔۔۔؟

کسی نے کہا

"کلمۂ لاالہٰ ہے"

یہ کس کی زبانِ محبت ہے

یہ کون ہے

یہی ہے مرا میزباں

مری روح کا ترجماں

جو اس رشتہ لفظ سے آشنا ہے

اے مرے میزباں

اے مری روح کے ترجماں

تیرے سائے میں

میں ایک جگی بناؤں گا

اور کشتِ جاں میں

ترے حرفِ زندہ کی وہ کھیتیاں بوؤں گا

جو ابد تا ابد لہلہاتی رہیں گی

ہجوم کوچہ و بازار میں برہنہ پا

ہجوم ہر در و دیوار پر برہنہ سر

ہجوم جیسے رواں کاروانِ کاہکشاں

ہجوم جیسے سمندر میں جوششِ طوفاں

اور اس ہجوم میں، میں

اک ذرّۂ ناچیز

ایک جسم عظیم

جو اپنی لاکھوں کروڑوں ابلتی آنکھوں سے

گریاں

جو اپنے لاکھوں کروڑوں لرزتے ہونٹوں سے

نوحہ کناں

جو اپنے لاکھوں کروڑوں عظیم ہاتھوں سے

سینہ زناں

یہ گیارہ ستمبر تھی۔۔۔۔ گیارہ ستمبر

ہم اک زرد سورج کی میت کو

کاندھوں پر اپنے اٹھائے ہوئے

قوم کے باپ کو الوداع کہہ رہے تھے

الوداع۔۔۔۔ قائد محترم الوداع

الوداع۔۔۔۔ آفتابِ درخشانِ ارضِ عجم الوداع

الوداع۔۔۔۔

اے امیدِ حرم الوداع، الوداع

مرے دل میں کتنی کدورت تھی

لیکن مجھے یوں لگا

جیسے آنسو مری آنکھ کا

روح کا غسل صحت ہیں

کوئی دیکھتا تو میں ایک آنکھ سے رو رہا تھا

دوسری آنکھ سے ہنس رہا تھا

مجھے اپنے قائد پہ خود اپنی ہستی پہ۔۔۔۔

اک نیا اعتبار آ گیا

زمینِ وطن کے گلوں کا تو کیا ذکر

کانٹوں پہ پیار آ گیا

حواشی

(۱) انتظار حسین

(۲) اس وقت کے وزیر آباد کاری و مہاجرین

آیئے کھیولی چلیں

اودھ کے ضلع بارہ بنکی میں

چھوٹا سا اک گاؤں کھیولی ہے

جو ڈھائی سو سال سے میرے آباء کا مسکن ہے

نظر دل جو دادا کے دادا تھے

اس گاؤں میں آئے تھے

یہ بھر قوم کا اک علاقہ ہے

جو بہت جنگ جو اور لڑاکے تھے

(ویسے خود بارہ بنکی بھی

بارہ بانکوں کی بستی رہی ہے)

مہا آتما بدھ کی بیوی،

یعنی راحل کی ماں

اسی بارہ بنکی کی تھی

اور اک روایت تو یہ بھی ہے

کہ یہ اژدھا جواب چین کی علامت ہے

بدھ بھکشوؤں

کے ہمراہ

اسی بارہ بنکی سے

چین پہنچا تھا!

تو بھر قوم میں

ایک راجہ تھا۔۔۔ کھیول

جس کے دو بھائی تھے

یہ کھیول تھا وہ جس نے کھیولی بسائی

دوسرے بھائی دیول نے دیوہ بسایا

جو وارث علی شاہ کے مزار مبارک کے باعث

سارے ہندوستان کی عقیدت کا مرکز رہا ہے

آپ اگر لکھنؤ سے چلیں

تو ملہور جلور کے بعد

فیض آباد سے پہلے

بارہ بنکی کا چھوٹا سا

اسٹیشن ملے گا

یہاں اک زمانے میں

(اب تو کیا جانے کیا ہے)

پوری اچھی ملتی تھی

یہاں آپ اتریں

ذرا فاصلے پر وہ یکے کھڑے ہیں

"میاں آ گئے! میاں آ گئے"

"آؤ بھیا یہاں آؤ

پانی پی لو تو چلتے ہیں"

(پانی پینے کی یہ وہ جگہ ہے

جہاں آمرِ وقت جی.جی غلامِ محمد نے

ہندوستان کے سفر میں

پرانی عقیدت کی یادوں میں

پانی پیا تھا)

یہاں سے چلیں تو کوئی آٹھ نو میل کے بعد دیوہ ملے گا

یہاں رک کے

وارث علی شاہ کے

مزارِ مبارک پہ حاضری دیں گے

اور پھر

فاتحہ پڑھ کے آگے چلیں گے

مرا گاؤں دیوے سے کرسی کی جانب

تین فرسنگ ہے

(جی یہ کرسی وہی ہے جہاں کے۔۔۔۔وہ فلپانا والے

شرؔرا اور احمق برابر کے مشہور ہیں

وہ مرے گاؤں سے پانچ فرسنگ ہے)

یہاں ہندوؤں کا بہت ہی قدیم ایک تیر تھ ہے

کہتے ہیں کہ اس جگہ

مہادیو کا سنگھاسن زمین میں گڑا ہے

اس کے دوپائے باہر ہیں
اور دو مہاکال یعنی قیامت میں نکلیں گے
تو کاتک کے ہندی مہینے میں منگل کے دن
(جس کی اک دوپہر کو

میرے والد،
مرض الموت میں مبتلا ہو کے
تین دن بعد فوت ہو گئے)

یہاں ایک میلہ
لگتا ہے
جس میں شرکت کو ہندوستاں کے ہر اک شہر سے
جوق در جوق اپنے قد سے زمیں ناپتے
ہندو، آتے ہیں
اور دیکھتے ہیں۔۔۔۔ مہاکال میں کتنی مدت رہی ہے
آپ دیوے سے چل کے
کھیولی میں پہنچیں گے تو سب سے پہلے
بڑا۔۔۔۔ بہت ہی بڑا ایک گنجِ شہیداں ملے گا
(یہاں میرے والد نے اک باغ مرنے سے دو سال پہلے لگایا تھا)
آپ کھیولی میں آجائیں
وہ دیکھئے سامنے
اہیروں کے ٹولے سے کچھ فاصلے پر
ایک اتنا بڑا
املی کا کہنہ درخت ہے

کہ اس کے تنے میں جواب کھوکھلا ہو چکا ہے

آٹھ دس آدمی بیٹھ سکتے ہیں

روایت ہے اس پر کبھی

بجلی گری تھی

یہ اک ایسے تالاب کے

سامنے ہے جو دو سمت میں

ایسے پھیلا ہوا ہے کہ سوکھے دنوں میں

ایک رستہ سا بن جاتا ہے

اور برسات میں ڈوب جاتا ہے

یہ تالاب جس سے یہ دل چسپ قصہ بھی منسوب ہے

کہ کسی گھوسنی نے

کہ جس کے دہی میں

کسی طرح

گولر کا پھول آ گیا تھا

اور اس کا دہی ختم ہوتا نہ تھا

آخر اپنا دہی

اس میں پھینکا تھا

اس واسطے اس کا نام

دھیا ہے!

جو کبھی خشک ہوتا نہیں ہے

دہی اور دھیا!

اور اس کے بالکل مقابل

مشرق

یہ جو ایک دو منزلہ گھر ہے

یہ مرے باپ سید شرافت علی کا مکاں ہے

مرے گاؤں کے لوگ

اپنے اس گاؤں کے

اتنے شیدا تھے

کہ بچپن میں، میں

ایسے دوہے کبت

سنتا رہتا تھا

"ہو بھیا۔۔۔۔ ہو بھیا!

ہو راجا۔۔۔۔ ہو راجا!

ہو رانی۔۔۔۔ ہو رانی!

گولر گدیا کھیئبا راجا!

گولر گدیا کھیئبا بھیا!

پیبا دھیا کا پانی!

ہو رانی!

ہائے جوانی!

ہائے جوانی کٹ گئی رانی

پیتے دھیا کا پانی!

پر پیبا دھیا کا پانی

اور گولر گدیا کھیئبا

کھیولی چھوڑ کبھی نہ جیبا!

دھیا!"

کبھی میں نے والد کو بھی موج میں گنگناتے سنا

"ہو۔۔۔۔ کھیولی سہر، البیلا!

چلو گوری دکھائے لاؤں میلا!

کھیولی سہر، البیلا!"

(یہ گاؤں جو اتنا چھیتا تھا اب تو کھنڈر بن چکا ہے)

اور اس گاؤں میں

ایسے کچھ لوگ ہیں جو ناگوں کے کاٹے کا منتر جگاتے ہیں

اور ان کا دعویٰ ہے

اور خود مرا تجربہ ہے

کہ مرنے والے کو زندہ اٹھاتے ہیں

مرا تجربہ یوں

کہ خود مجھ کو بھی ناگ نے ڈس لیا تھا

مگر ان کے منتر نے مجھ کو بچایا

یہ ناگوں کو ہرنے، ہرانے کے ماہر

"ناگ ہر" ہیں!

تو ہاں یہ شرافت علی کا وہ گھر ہے

جو مشرق کی جانب

کسی چشمِ بے خواب کی طرح یوں دیکھتا ہے

کہ کیا جانے کس آفتاب جہاں تاب کا منتظر ہے

نہیں۔۔۔۔ منتظر ہے!

مرے باپ کے پانچ بھائی، سخاوت!

شجاعت، لیاقت، لطافت، رفاقت
سخاوت تھے سب سے بڑے بھائی ان کے
انہیں دیکھنے کی سعادت نہ پائی،
مگر دوسروں سے بڑا فیض پایا!
کہ سب تھے مرے نخلِ طفلی کو سایا
لیاقت علی مردِ کامل، ولی تھے
بڑے پاکباز اور بڑے متقی تھے
وہ کرتے تھے مجھ سے شریعت کی باتیں
میں بچپن میں پڑھتا تھا ان سے کتابیں
کبھی رات کو میں اگر جاگ جاتا
تو ان کو ہمیشہ ہی سجدے میں پاتا
اثر ان کا میری طبیعت میں آیا!
کہ گھٹی میں مذہب انہوں نے پلایا
مگر میرے والد کا رنگِ دگر تھا
کہ دل ان کا رنگیں مزاجی کا گھر تھا
وہ ہولی بھی کھیلیں، دوالی منائیں
کبھی موج میں آکے گائیں بجائیں
انہیں دل ملا تھا تضادات کا گھر
کہ تھا موم کا موم، پتھر کا پتھر!
تبسم پہ غنچے کے آنسو بہائیں
بہاریں لٹیں اور وہ مسکرائیں
مجھے یاد ہیں اب بھی باتیں پرانی

زمینوں سے آتے تھے ان کے اسامی
انہیں یوں بہ غیض و غضب مارتے تھے
کہ میں کانپتا تھا وہ جب مارتے تھے
اور ایسے کہ جب دل کی نرمی پہ آئیں
تو پھر خود ہی ساتھ ان کے آنسو بہائیں
یہ نرمی جو تھی ان کے کردار کی تھی
وہ سختی جو تھی اک زمیندار کی تھی
کبھی عمر بھر مجھ کو گھر کا نہ ڈانٹا
مگر ایک بار ایسا مارا تھا چانٹا
کہ اس کا اثر روح پر آج بھی ہے
بہت بجھ گئی ہے مگر آگ سی ہے
لگایا تھا اک باغ دل کی خوشی سے
اسے سینچتے تھے خلوصِ دلی سے
جو اک بار اس باغ میں بور آیا
خدا نے انہیں مثلِ غنچہ کھلایا
وہ کہتے تھے ہاں بات اب کچھ بنی ہے
کہ محنت جو کی تھی ٹھکانے لگی ہے
میں بچہ تھا، اک روز لڑکوں کو لے کر
گیا باغ میں اور انہیں حکم دے کر
وہ سب بور اور کیریاں توڑ ڈالیں
درختوں کی شاخیں جو تھیں جھور ڈالیں
بس اس بات پر ان کو غصہ جو آیا

مرے گال پر ایک تھپڑ لگایا!

یہی باغ تھا جس میں ایک دن کھڑا تھا

میں پہلے سے اب عمر میں کچھ بڑا تھا

کہ اک آدمی دوڑتا گھر سے آیا!

چلو تم کو گھر میں ہے فوراً بلایا

میں گھبرایا، نوکر کو میں نے جھنجوڑا

کہ ابو کو تھا میں نے غفلت میں چھوڑا

انہیں تین دن سے بخار آ گیا تھا

جمعے کو مگر کچھ قرار آ گیا تھا

وہ کیا وقت تھا آہ کیسے بتاؤں

جگر شق نہ ہو تو یہ قصہ سناؤں

میں پہنچا تو وہ نزع کے حال میں تھے

شرافت علی موت کے جال میں تھے

زباں پر شہادت کا کلمہ تھا جاری

ذرا سانس چلتا تھا پر بھاری بھاری

مجھے دیکھ کر ہاتھ اپنا بڑھایا

مجھے اپنے سینے سے ایسے لگایا

کہ خورشید جب شام کو ڈوبتا ہے

اندھیرے میں جو روشنی کی قضا ہے

تو پہلے افق پر ذرا جھومتی ہے

ستارے کو اپنے کرن چومتی ہے!

وہ وقتِ غروب اور وہ گھپ اندھیرا

افق پر یکایک وہ آندھی کا پھیرا

کہوں کیا قیامت کی کیسی گھڑی تھی

بھرے گھر میں ماتم کی پٹس پڑی تھی

یکایک عجب رنگ آندھی نے بدلے

امنڈ آئے بادل عجب گدلے گدلے

بدلتے تھے جو رنگ ساعت بہ ساعت

ابھی زرد، ابھی سرخ اللہ رے وحشت!

خدائے جہاں کیا مشیت تری ہے

یہ دنیا کی کیا ساعت آخری ہے

شب تار اور ایک تنہا ستارا!

کہ سورج کو ہم نے زمیں میں اتارا!

میں اب سوچتا ہوں وہ کیا آدمی تھا

کہ وقتِ سفر جس نے اتنا نہ سوچا

کہ میرے ابھی چھوٹے چھوٹے ہیں بچے

ثمر شاخ پر ہیں ابھی کچے پکے

نہ سوچا کہ بیوی مری کیا کرے گی

جئے گی انہیں لے کے یا پھر مرے گی

میں کیسے اسے چھوڑ جا رہا ہوں

تعلق کو کیوں توڑ کر جا رہا ہوں

مشرق

وہ اک دشتِ بے آب یعنی جوانی
مری ماں کی وہ بیوگی کی کہانی!
وہ بارِ غم و رنج اللہ اکبر
پہاڑوں کے دل جس سے پھٹ جائیں یکسر
کہ دن رات وہ آتشیں اشک پینا
کہ شق جس سے ہو جائے پتھر کا سینہ
بہت میں بڑا تھا کہ نو سال کا تھا
شمیم ان دنوں گھٹنیوں چل رہا تھا
یہ چھوٹا سا، موٹا سا، جیسے گجیا
مرے کھیل کو ننھا منا سا بھیا
ذرا سا تھا لیکن بہت مسخرا تھا
مرے پیٹ اور پیٹھ پر کودتا تھا
کھلاؤں کبھی اس کو برفی، امرتی
وہ باتیں ہیں اب تک نگاہوں میں پھرتی
خدا ان کو رکھے یہ جانِ محبت
گلِ نو بہارِ جہانِ محبت
کہ ان سے مری آنکھ میں روشنی ہے
یہ موجود ہیں تو مرا دل قوی ہے
ردائے سعادت کو سر سے لپیٹے
یہ بھائی کے بھائی ہیں بیٹے کے بیٹے
کمر میری خدمت کو ہر گام باندھے
یہ میری محبت کا احرام باندھے

اطاعت مری تا حد انتہا کی!!

ہمیشہ نمازِ محبت ادا کی!

مری پشت پر ہوں تو لگتا ہے ایسا

کہ اہلِ زمانہ کا اب خوف کیسا

یہ چھوٹے ہیں مجھ سے یہ مجھ سے بڑے ہیں

شرافت علی جیسے پیچھے کھڑے ہیں

بڑے سخت کٹر، بڑے مرکھنے ہیں

یہ شیرانِ جرأت کے سچے جنے ہیں

شرافت کے بیٹے، شجاعت کے چیلے

ہزاروں سے لڑتے ہیں تنہا، اکیلے

ملی ہے چچا سے مجھے زہد سازی

انہیں باپ سے خوئے رنگیں مزاجی

کوئی شیروانی پہ ان کی نہ جائے

اگر مسمسائیں تو دھوکا نہ کھائے

یہ اندر سے ہیں ایک بانکے سجیلے

بہت شوخ ہیں اور نہایت رنگیلے

میں ایسا کہ جو شکل دل میں بساؤں

تمام عمر پوجوں، عبادت نبھاؤں

یہ ایسے کہ ہر دن نیا بت بنائیں

پرستش کریں، توڑ دیں، بھول جائیں

مجھے صوفیوں کی سی وحدت پرستی

انہیں برہمن کی سی کثرت پرستی

سنا ہے کہیں ایک دشت آہواں ہے
غزالانِ جادو کا مسکن جہاں ہے
بظاہر تو وہ اک طلسمی مکاں ہے
مگر در حقیقت یہی دشت جاں ہے
سفر اس کا دشوار اک مرحلہ ہے
یہ کام ان کا ہے جن کا عالم جدا ہے
کہ سرگرداں رہتے ہیں وہ عمر ساری
غزالِ رمیدہ کے سچے شکاری
لحاظ ان کی آنکھوں کا کرتا ہوں میں بھی
بہت ان کی مونچھوں سے ڈرتا ہوں میں بھی

تو ہاں یہ ابھی گھٹنیوں چل رہا تھا
ذرا سا دیا تھا مگر جل رہا تھا
بہن کا تو کیا ذکر بالکل ہی کچی
مری زاہدہ چھ مہینے کی بچی
مری ماں نے ہم کو پروں میں سمیٹا
کہ اک دن جوان ہو گا آخر کو بیٹا
اندھیرے کہ ظالم ہیں چھٹ جائیں گے یہ
یہ دن ہیں پہاڑ اور کٹ جائیں گے یہ
جمیل ایک تھے اور میرے برادر
سخاوت علی کے وہ فرزند اکبر
انہوں نے کیا ہم پہ رحمت کا سایا

تری ان پہ تا حشر رحمت خدایا

وہ تھے بھائی پر کیسے بھائی کہ یارو

زمینو! کوئی ایسا سورج ابھارو

مرے خون میں ہے حرارت انہی کی

ہے شفقت انہی کی، محبت انہی کی

کہوں کیا کہ کس کے برابر نہ سمجھا

مجھے اپنے بیٹے سے کم تر نہ سمجھا

خدائے جہاں کا جو ہم پر کرم تھا

کٹا وقتِ مشکل مگر رفتہ رفتہ

مجھے میری ماں نے مڈل تک پڑھایا

تو امی نے پھر مجھ کو میرٹھ بلایا!

مگر اس سے پہلے کہ میرٹھ میں جاؤں

ذرا سا یہ قصہ سناؤں

یہاں گاؤں میں کانگرس کا کئی سال سے کام ہو تا رہا تھا

مرے اک چچا کانگریسی تھے جن کا بڑا مرتبہ تھا

زمیندار بھی وہ بڑے تھے

مرے باپ کے وہ چچا کے تھے بیٹے

تو ہلکی سی چشمک کے تیور رہے تھے

نجانے مجھے ایک دن کیسی سوجھی

کہ خود اپنے ہاتھوں سے پرچم بنایا

ہرا ایک کپڑا لیا

اس پہ پنی کا چاند اور ستارہ سجایا
کئی لڑکے ہمراہ لے کر
اسے گاؤں بھر میں پھرایا
بہت کانگریسی تپے
پر مزا خوب آیا

مجھے عربی پڑھنے کا بھی شوق حد سے سوا تھا
مگر میں کبھی
نہ مکتب میں جاتا
کہ جانے وہاں کون سے مردِ جنت رسیدہ سے پالا پڑے گا
پہ اک روز ہمت جو کر کے میں مکتب میں پہنچا
تو اک روکھے پھیکے، سڑے، مڑ چڑے مولوی کے بجائے
وہاں ایک جوانِ حسیں
(خدا معاف رکھے) کہ اک نازنیں
(جن کی چھوٹی سی داڑھی
گورے چہرے پہ یوں سج رہی تھی
کہ دل کھنچ گیا)
کو دیکھا!
وہ لڑکے پڑھانے میں مصروف تھے
پڑھو!
الم!
"الف" تو یہ اللہ ہے

جو "نورالسمٰوات والارض" ہے

"حی وقیوم" ہے

اور محمدؐ یہ "میم"

(بیٹھو سلیم)

یہ اللہ ہے

وہ محمدؐ!

وہ نورِ خدا ہے

کہ جو نور سے اس کے پیدا ہوا ہے

کہ پھر "لام" اک واسطہ ہے

نبوت کا اک راز ہے

نغمہ وحی کا پردۂ ساز ہے

"لام" جبریل ہے!!

اور "الف" گر احد ہے

تو پھر "میم" احمد کا ہے

"لام" جبریل ہے!

احد اور احمد میں کیا فرق ہے

فرق اک "میم" ہے

یہ احمد ہے دیکھو

یہاں "میم" ہے

مگر یہ احد ہے!

یہ "بے میم" ہے

تو پھر احد کیا ہے؟

"بے میم" احد ہے
اور احمد جو "با میم" ہے
وہ احد ہے
پڑھ الم

یہ مولانا عاقل تھے
جو خدا جانے کیسے مجھے جانتے تھے!
مرے نام اور میری صورت کو پہچانتے تھے
انہوں نے مجھے چھ مہینے میں اٹھارہ پارے پڑھائے
کہ اتنے میں امی کے خط
میرے بلانے کو آئے!
میں خود اپنی ماں کو تو کہتا ہوں آپا!
کہ ہیں ان دنوں ضعف کے دن، بڑھاپا
بحقِ رسول گرامی خدایا!!
کہ قائم ابد تک رہے ان کا سایا!
مگر آپا کہہ کر انہیں میں نے ٹالا!
جو امی تھیں میری تو وہ میری خالا
قبائیں مری روح کو کیا سلی تھیں
مجھے میری قسمت سے دو ماں ملی تھیں

جہاں دل کو بیچا، جہاں جاں خریدی

بنوّلی کا بھی تھا وہ کیسا زمانہ
کہ یادوں کا زریں خزانہ!
کبھی بھائی صاحب کے ہمراہ جانا
کبھی اپنے خالو سے زیٹیں اڑانا
کبھی اپنی امی سے گپیں لڑانا
کبھی اپنی بھابی کو اتنا ستانا
کہ ہٹ جائیں سونے کا کر کے بہانا
کبھی رات بھر داستانیں سنانا
عمرو کی وہ عیاریاں او رگھاتیں
وہ ان کی بخیلی کی دلچسپ باتیں
وہ صاحب قراں اور لندھور سعداں
وہ کوکب وہ براں وہ نور افشاں
وہ زنبیل کی سیر اور وہ تماشا

اور جنگیں کہ دل جن سے ہو تولہ ماشا
وہ مہتر قراں جو کہ تھے مردِ زنگی
شرارت کا پشتارا، برقِ فرنگی!
بہار اور مخمور و لعلِ سخن داں
وہ دل جن کی باتوں سے شاداں و فرحاں
کئی ماہ یہ داستانیں سناتے
خیالوں کی دنیا میں بستے بساتے
بہت روح کو اپنی بیتاب دیکھا
حقیقت نہ پائی تو یہ خواب دیکھا
بہار ایک میرے گلِ جاں میں آئی
بہارِ طلسمی کہ نازِ خدائی!
وہ مٹی تھی پر ہائے مٹی تھی کیسی
ابھی جس میں جنت کی خوشبو بسی تھی
خمیر اس کا کوثر کے پانی سے روندھا
خدا نے اسے جیسے کرنوں میں گوندھا
نمودِ سحر کی طرح مسکراتی---
شفق اس کے گالوں سے سرخی چراتی
وہ آنکھیں ابھی جیسے نیند آ رہی ہے
ابھی جیسے دنیا میں جاگر پڑی ہے
وہ دل اس نے پایا کہ اک انجمن تھا
تھا آئینہ جاں کہ اس کا بدن تھا
بہت تندخو تھی بڑی تیغ زن تھی

طبیعت تھی اس کی کہ ہیرے کی کن تھی
مگر میں نے یوں گوشہ جاں سنوارا
پری تھی کہ شیشے میں اس کو اتارا
اگرچہ بہت اس سے اَن بن رہی تھی
ادھر سے بھی حد درجہ تن فن رہی تھی
مئے غم مگر روح میں چھن رہی تھی
میں آدم تھا دنیا ابھی بن رہی تھی

پڑھی ہوں اگر رمزیہ داستانیں!
تو اک سر ہے ایسا بھی باغِ جہاں میں
نہاں مثلِ گل دہر میں جو کہیں ہے
وہ سرِ ازل ہے کہ کھلتا نہیں ہے
وہ کیا دیس تھا کن غزالوں کا رمنا
وہ بارش، وہ میداں میں سبزے کا جمنا
بہاروں کا نقشہ، چمن در چمن تھا
یہ گھر تھا، ستاروں کی یا انجمن تھا

بنوؔلی سے میں پھر پلکھوے میں آیا
کہ میں بھائی صاحب[۱] کا تھا اپنے سایا
مگر بھائی صاحب سے اک بھائی چھوٹے
میاں پاشا خاں[۲] برادر چھوٹے
بڑے ان کے چکر تھے کیا پھاکٹے تھے

یہ مسکین صورت بڑے چھاکٹے تھے
انہوں نے عجیب ایک چکر چلایا
کہ چپکے سے اک موہنی کو رجھایا
میں خط ان کے لکھتا تھا، ہائے مشقت
یہ خود لوٹتے تھے بہارِ محبت!
انہیں مفت بیدام جنت ملی تھی
مجھے روزہ رکھنے کی خدمت ملی تھی
وہ دن زندگی کی بہاروں کے دن تھے
شبِ وصل تھی اور یاروں کے دن تھے
وہ یارانِ صادق سے دن رات جھگڑے
محبت کی باتیں، گلے اور شکوے
کبھی رات کٹتی تھی آنکھوں میں ساری
کہ ہوتی نہ تھیں ختم باتیں ہماری
وہ یاروں کا جھرمٹ کہ کنج چمن تھا
یہاں جو بھی تھا خود ہی اک انجمن تھا
نعیم(۳) اور قدیم(۴) اور قیام(۵) اور قاری(۶)
وہ قاری کہ تنہا زمانے پہ بھاری
رفیقانِ اول ہیں ہمزاد ہیں یہ
فن دلنوازی میں استاد ہیں یہ
امید(۷)، انتظار(۸) اور جمیل(۹) اور اختر(۱۰)
اور ان کے برادر میاں اپنے انور(۱۱)
سعید(۱۲) اور حفیظ(۱۳) اور حزیں(۱۴) اور نجمی(۱۵)

وہ یاروں میں اک بے وفا یار بزمی[16]

مرے ایک استاد رزمی[17] تخلص!

بڑھاتے تھے مجھ میں ادب کا تجسّس

انہوں نے مرے دل میں اک غم ملایا

ادب کی محبت کا شعلہ جلایا

وہاں بھائی قیصر[18] بھی تھے، جینیس تھے

بڑے شعر داں تھے، بڑے نکتہ رس تھے

کبھی مجھ سے کہتے تھے، جاہل ہو بالکل

تعلق نہ رکھنے کے قابل ہو بالکل

مرا بس چلے تو (یہ کیوں راز رکھوں)

تمہیں شعر کہنے سے میں باز رکھوں

خموشی سے چپ چاپ جب دکھ سہو گے

اگر چپ رہو گے تو ملٹن بنو گے

وہ بیگم کا پل یادگارِ زماں ہے

کہ اک زندہ سورج کا مشرق یہاں ہے

وہ سورج کہ جس کے ہزاروں ستارے

(نگاہوں میں پھرتے ہیں سارے کے سارے)

وہ تارے کہ جب اپنا جلوا دکھائیں

شب تیرہ و تار کو دن بنائیں

یہ پل میری اک مستقل رہ گزر ہے

یہاں میرے کرار[19] صاحب کا گھر ہے

طوافِ عقیدت کے پھیرے کیے ہیں

وہ گھر جس کی چوکھٹ کے سجدے کیے ہیں
کہوں کیا ہیں کرار میرے لئے، کیا؟
مرے باپ، استاد، مرشد، مسیحا
کفِ خاک میں ہائے کیا گل کھلا ہے
انہیں عشقِ حق سے یہ رتبہ ملا ہے
کہ دیکھو تو گویا سراپا نظر ہیں
نظر ہیں، بصر ہیں، بصیرت کا گھر ہیں
علی بابِ علم اور یہ عبدِ علی ہیں
غلامی کا محضر نحط جلی ہیں
تو کیا فیض اس درد سے ان کو ملے ہیں
کہ یہ عشق کے رنگ میں بھر گئے ہیں
وہ عشق علیؑ و محمدؐ کہ مومن
اسی عشق سے ہے صداقت کا ضامن
وہ مومن کہ قاری بھی قرآن بھی ہے
کہ بوذرؓ کا ظل نقشِ سلمانؓ بھی ہے

بڑے فیض پہنچے مجھے زندگی سے
یہیں میں ملا تھا حسن عسکری[۲۰] سے
یہ صاحب وہ ہیں جن کی اک ضربِ کاری
قلم کے ہزاروں حریفوں پہ بھاری
غلامی میں ان کی کٹی عمر ساری
وہ میرے صنم ہیں میں ان کا پجاری

وہ گر موقلم ہیں تو تصویر ہوں میں
انہیں کی لکھی ایک تحریر ہوں میں
شروعِ جوانی کا وہ اک زمانہ
کہ جو بن گیا ہے پرانا فسانہ
دیا تھا سرِ راہ میں جل رہا تھا
کہ میرا شعور آنکھ ابھی مل رہا تھا
مجھے راہ سے عسکری نے اٹھایا
چراغِ تہِ دامنِ دل بنایا
میں پتھر تھا اور خاک میں رُل رہا تھا
یہ نادیدہ میزان میں تل رہا تھا
مرے جوہری نے مجھے دیکھا بھالا
تراشا، سنوارا، نکھارا، اجالا

یہاں میں نے کچھ دوست ایسے بھی پائے
جو اس دھوپ میں بن گئے مجھ کو سائے
یہ میرٹھ کے قصے کہاں تک سناؤں
کہاں تک میں چاروں کو رووَں رلاؤں
یہیں سایۂ دامنِ غم ملا تھا
یہیں زخم کھائے تھے مرہم ملا تھا
اندھیرے میں شمع فیروزاں خریدی
یہیں دل کو بیچا، یہیں جاں خریدی

یہاں کا میں قصہ یہیں چھوڑتا ہوں
کراچی سمندِ قلم موڑتا ہوں

حواشی

(فصل اول: جہاں دو بیچا، جہاں جاں خریدی)

(۱) بھائی صاحب تمیز الحسن سلیم احمد کے خالہ زاد بھائی۔(۲) انور عزیز پاشا، سلیم احمد کے چھوٹے خالہ زاد بھائی۔(۳) راجہ نعیم الدین صدیقی۔(۴) عبد القدیم خاں۔(۵) قیام صدیقی۔(۶) قاری محمد یونس۔(۷) امید فاضلی۔(۸) انتظار حسین۔(۹) ڈاکٹر جمیل جالبی۔(۱۰) اختر عالم صدیقی۔(۱۱) انور عالم صدیقی۔(۱۲) سعید اختر۔(۱۳) حفیظ میرٹھی۔(۱۴) حقی حزیں۔(۱۵) حشمت حسین نجمی۔(۱۶) اختر حسین بزمی۔(۱۷) پروفیسر رزمی صدیقی۔(۱۸) قیصر زیدی۔(۱۹) پروفیسر کرار حسین۔(۲۰) پروفیسر محمد حسن عسکری۔

بہار کالونی سے جہانگیر روڈ تک

کراچی میں لیاری ندی کے کنارے
جہاں چمڑے والوں کے گودام ہیں
اور چمڑے کے پانی کی بُو سے
سڑی بُو سے
انسان کا سانس لینا بھی دشوار ہے
ایک مرگھٹ ہے
جہاں بھوت رہ لیں تو رہ لیں
مگر آدمی کا یہاں رہنا ایسی کڑی آزمائش ہے
جس سے جو گزرے وہ جانے

یہاں چھوٹے موٹے بہاری تاجر
جنہیں شہر میں سر چھپانے کا گوشہ نہیں مل سکا ہے
آ کے آباد ہیں!

ذرا دیکھئے---

بس کے اڈے سے کچھ دور پر ایک مسجد ہے

جس پہ اب تک سفیدی نہیں ہو سکی ہے

فقط اک ڈھچر سا کھڑا ہے

اس کے بالکل مقابل

وہ اک ادھ بنے سے مکاں ہیں

کسی مسخرے نے

پرانی سی اک سائیکل ٹانگ دی ہے

کہ لوگ اس کے ذریعے مکانوں کی پہچان کرتے ہیں

---یہ مسخرا میں ہوں

اور یہ کھنڈر میرا گھر ہے

جہاں میں کرائے پہ رہتا ہوں

یہ مکاں دیکھنے میں تو جیسا بھی ہو

پر بڑی چیز ہے

کہ دراصل اک لامکاں ہے!

اس کی دیواریں گویا کہ ہیں اور نہیں ہیں

مگر اس کے دروازے بھی

فیض صاحب کی اک نظم کے استعارے کے مانند

بے خواب ہیں!

اس کی چھت اک پیالہ ہے

اور صحن اک حوض ہے

کہ دونوں میں بارش کے دن مچھلیاں مار لیجئے

یہاں پانی کمروں میں ہو کر گزرتا ہے
اور "لبِ جوئبارے" کے سارے مزے گھر میں آجاتے ہیں
ہوا اس کی دیواروں کے روزنوں
اور چھت کے موکھوں سے
سیٹی بجاتی گزرتی ہے
آپ اس گھر میں آئیں
تو محسوس کر لیں گے
دنیا کے وہ پہلے انسان
کیا کرتے ہوں گے
جنہیں اس زمیں پر
کہیں سر چھپانے کا پہلا ٹھکانہ بنانا پڑا تھا

مگر یہ عجب ایک تاریخی گھر ہے
کہ اک دور میں کیسی کیسی بلاؤں کا مسکن رہا ہے
یہاں دیکھئے وہ بلائے عظیم عسکری
فرش پر لوٹتے ہیں
یہ صاحب کہ جو شال کندھے پہ ڈالے
غزل گا رہے ہیں
یہ عالی ہیں!
وہ صاحب کہ جو اکڑوں بیٹھے ہوئے
بہتے پانی کا نظارہ کرتے ہوئے
پان میں کتھا چونا لگانے میں مصروف ہیں

جا چکی ہیں!

وہ کالے سے زوّار(۱) ہیں

جانِ جاں ہیں

وہ موٹے سے جو ہیں وہ اسمٰعیل خاں(۲) ہیں

نہال(۳) اور ماہر(۴) یہاں آ چکے ہیں

یہاں بھائی راز(۵) اور بخاری(۶) غزل گا چکے ہیں

جناب نشور(۷) اور محبوب(۸) بھی پاؤں پھیلا چکے ہیں

وہ تابش(۹) ہیں، مدنی(۱۰) ہیں، زیبا(۱۱) ہیں

وہ مجتبیٰ(۱۲) ہیں!

یہاں اک طرف شاعری کوٹی جاتی ہے

اور اک طرف تاش کی پھڑ بھی جمتی ہے

جس میں غیور(۱۳) اور سرور(۱۴) اور قدیم(۱۵)

ایک پر ایک پتے لگاتے ہیں

یہاں میں، قدیم اور میرے برابر نعیم(۱۶)

جو کہ میرٹھ سے میرے لنگوٹی بدل بھائی ہیں

رہتے ہیں

دفتر میں نوکر ہیں

پر اپنی ڈیوٹی پہ جانے سے پہلے

مرا ناشتہ اور کھانا پکاتے ہیں

پانی بھرتے ہیں، جھاڑو لگاتے ہیں

یہ وہ دوست ہیں

جن سے اس لفظِ بے معنی و رنگ میں

معنی و رنگ ہیں!

یہاں وضع داری کی یہ رسم ہے

کہ مالک مکاں سے مرا ایک جھگڑا ہوا

کہ نوبت عدالت کی پہنچی

تو ہم دونوں

اک دوسرے کے خلاف

مقدمے میں جاتے تھے

اور عدالت میں جانے سے پہلے

بغل گیر ہوتے تھے

حسن عسکری پیر کالونی آئے

مگر مجھ کو بھی اپنے ہمراہ لائے

یہاں سے اٹھایا قدم میں نے اگلا

کئی ماہ کے بعد گھر اور بدلا!

خدا کی جو رحمت کا تھا مجھ پہ سایا

میں مکرانی مسجد کے سائے میں آیا

قدیم اب بھی تھے ساتھ سائے کی صورت

نگاہوں میں پھرتی ہے ہائے وہ مورت

وہ تھا دوست پر دوست تھا ہائے کیسا

مرے نام پر جان دے دوست ایسا

میں گو خار تھا، پر وہ بلبل وفا کا

مجھے پیار سے مثلِ گل جانتا تھا

سینے پہ میرے جو اپنا لہو دے
جلوں میں کسی بات پر تو وہ لو دے
وہ دکھ سکھ کا ساتھی تھا پر کیسا ساتھی
مری روح تھا وہ جو مجھ سے جدا تھی
وہ ہر بات کا میری غم کھانے والا
وہ ہر حال میں میرے کام آنے والا
خدا اس کو بخشے ستم کر گیا ہے
کہ زندہ ہوں میں اور وہ مر گیا ہے

یہاں میرے ہمراہ رہتے تھے منے (١٧)
محبت کی گڈی کے چیکیلے کنے
میں سدی اگر تھا تو تھے آپ مانجھا
ہر اک شے میں تھا آپ سے آدھا ساجھا
یہ ٹھیلے کو سر سے مرے ٹھیلتے تھے
پرانے فلیشئے "بلف" کھیلتے تھے
یہ فل بورڈ ماریں تماشا دکھائیں
اگر شو کراؤ تو ستاد کھائیں
مکاں یہ جو ہے سامنے، ہے ظفر (١٨) کا
ٹھکانہ مرے یارِ صد معتبر کا
لگائے جو دنیا زمانے کو چر کا
مگر دھوپ میں سایا تھا میرے سر کا
خدا اس کو بخشے کہ وہ بھی نہیں ہے

مگر اب بھی لگتا ہے جیسے یہیں ہے

یہاں بھائی جاں[19] میرے کھیوڑی سے آئے
مرے واسطے یاد طفلی کو لائے

یہ سب ساتھ تھے اور کیا رتجگے تھے
عجب قہقہے تھے، عجب چہچہے تھے

مگر اب کہاں وہ محبت کے سائے
گئے جب، دوبارا پلٹ کر نہ آئے

کہوں کیا کہ حالت ہے کیا زندگی کی
کہ جیسے دیے کی ہو لو پھیکی پھیکی

یہی دور تھا جب یگانہ بھی آئے
نہ بھولیں گے گو لاکھ دنیا بھلائے

زمانے پہ سکہ جما کر گئے ہیں
یہ مہر اپنی دل پر لگا کر گئے ہیں

زمانے کا دل توڑنا ان سے سیکھا
میرے شعر نے بولنا ان سے سیکھا

غزل میں نے بھیجی تھی اور خط لکھا تھا
انہوں نے جواب اس کا فوراً دیا تھا

بڑھایا بہت ہی مرا حوصلہ تھا
میں کیا تھا مگر مجھ کو کیا کیا لکھا تھا

سبق میرا پکا، مجھے یاد ہیں یہ
بڑا فخر یہ ہے کہ استاد ہیں یہ

وہ آئے تُرابی[20] کی کوٹھی میں ٹھہرے

تو اک شام جب سائے تھے گہرے گہرے

ادب گاہِ حسن و صداقت میں پہنچا

میں ڈرتا ہوا ان کی خدمت میں پہنچا

کہ کیا جانے کس قسم کے آدمی ہوں

کہیں برہمی اپنے ہی شعر کی ہوں

جگرؔ کو یہ مصرع لگانا بتائیں

یہ رگھپتؔ سہائے کو ہجے سکھائیں

یہ حسرتؔ کو لکھیں کہ گو جج کیسے ہیں

مگر یہ کہو شعر کتنے کہے ہیں!

بہت جوشؔ خاں پر بھی فقرے لگائیں

انہیں جینیس کہہ کے بوگس بتائیں

جب اقبالؔ پر طنز کرنے پہ آئیں

ممولے کو شہباز سے جا لڑائیں

کہ اس نے خودی کا وہ چکر چلایا

کہ اپنے قلم سے خدا کو ہرایا!

صنم شاعری ہے تو یہ برہمن ہیں

کوئی اور کیا ہے یہ "غالب شکن" ہیں

زمیں کے یہ دشمن حریف آسماں کے

سنا ہے کہ پوتے ہیں چنگیز خاں کے

کروں گا میں کیا گر بگڑ جائیں گے وہ

کہ ہتھے سے بالکل اکھڑ جائیں گے وہ

زمانے سے رہتی ہے کھٹ پٹ بھی ان کی

وہ ہیں، چت بھی ان کی ہے اور پٹ بھی ان کی

میں پہنچا تو صوفے پہ بیٹھے ہوئے تھے

برابر میں اخبار رکھے ہوئے تھے

مجھے دیکھ کر خود بخود مسکرائے

کوئی جیسے کہتا ہو کیا خوب آئے

نہ تلخی نہ غصہ نہ شدت نہ گرمی

مگر بات کرنے میں اک ایسی نرمی

لگائے کوئی زخم پر جیسے مرہم!

برستی ہو آہستہ سے جیسے شبنم

انہیں دیکھ کر دل میں ٹھنڈک سی آئی

مری، روح نے اک حلاوت سی پائی

کہ ان کو سمجھتا ہے کیسا زمانہ

یہ "اللہ ہوتے ہیں ایسے یگانہ؟"

بہت حالِ اردو سے دل گیر تھے وہ

پرانی شرافت کی تصویر تھے وہ

یہاں رہتے بستے میں گھبرا گیا تھا

وہاں سے جہانگیر روڈ آ گیا تھا

یہاں اک کوارٹر ہے ایک سو ستتر

رہا ہوں جہاں چھ برس خوب جم کر

شرف اس کوارٹر نے اک ایسا پایا

جنابِ جگر کا قدم اس میں آیا

جگر کیا تھے اوتار تھے شاعری کے

مجسم اک اظہار تھے شاعری کے

وہ کالے تھے صورت کے اچھے نہیں تھے

مگر ایسے چہرے بھی دیکھے نہیں تھے

یہ لگتا تھا جاں کے حجابوں سے چھن کر

کئی ہلکے ہلکے نقابوں سے چھن کر

اندھیروں میں نورِ نظر ہو رہی ہے

وہ پو پھٹ رہی ہے سحر ہو رہی ہے

اس انسان کو روح کیسی ملی تھی

کہ چہرے پہ اک روشنی بن گئی تھی

انہیں دیکھ کر مجھ کو لگتا تھا ایسا

مری روح نے شعر کو چھو لیا تھا

کہوں کیا کہ تھی ان سے کیسی محبت

وہ ایسے کہ معصوم بچوں کی صورت

رمی کھیلتے میں چراتے تھے پتے

چھپا لیتے تھے شال میں چھکے ستے

ذرا چھیڑیے تو ابھی لڑ پڑیں گے

"نہیں کھیلتے تاش ہم پھینک دیں گے"

بہت لوگ دیکھے کہ شاعر بڑے ہیں

چڑی مار لفظوں کے اکثر پڑے ہیں

انہیں دیکھیے جسم ہی جسم ہیں یہ

یہ انسان نہیں دیو کی قسم ہیں یہ

انہیں دیکھتا ہوں تو لگتے ہیں ایسے

دکاں میں ٹنگا ہو بڑا گوشت جیسے

خدا نے بنایا ہے ان کو بدن میں

مگر روح ڈالی نہیں ان کے تن میں

یہ مانا کہ انساں بھی ہے ایک حیواں

مگر اس میں کیا چیز ہے روحِ انساں

لگاتا ہے حیوان جب خود پہ بندش

تو ہوتی ہے تیرہ تنی میں وہ تابش

کہ شعلہ کوئی جیسے چقماق کا ہے

کہ انسان تو نام اخلاق کا ہے

یقیناً یہ ہوں گے جگر سے بھی بڑھ کر

مگر آدمی ہیں صفر کے برابر!

یہاں میں سناتا ہوں اک اور قصہ

مری روح پر ہے اثر اب بھی جس کا

مرے بھائی بیمار تھے ہاسپٹل میں

میں بیٹھا تھا اک روز ان کی بغل میں

وہ غافل تھے، کچھ نیند سی آ گئی تھی

کئی روز سے ان کو غفلت بڑی تھی

سمجھتا تھا میں لوٹتی ساعتیں ہیں

بڑے بھائی کی آخری خدمتیں ہیں

وہ ابر رواں جس نے کھیتی ہری کی

وہ جس نے مرے باپ کی ہم سری کی

مجھے جس نے آغوشِ الفت میں پالا

بڑا بوجھ کاندھوں پہ اپنے سنبھالا

سفر کا وہ سامان ہیں جا رہے ہیں

کوئی دم کے مہمان ہیں جا رہے ہیں

بہت تیز عمرِ رواں کٹ رہی ہے

چراغِ محبت کی لو گھٹ رہی ہے

مگر جانے کیا میرے دل کو ہوا تھا

کہ کم بخت پتھر کی صورت بنا تھا

یہ سچ ہے کہ سویا نہ جاتا تھا مجھ سے

یہ روؤں تو رویا نہ جاتا تھا مجھ سے

مری آنکھ اشکوں سے تھی ایسی خالی

کہ اڑ جائے طائر تو خالی ہو جالی

مجھے یوں لگا صاحب جاں نہیں ہوں

میں عفریت ہوں کوئی انساں نہیں ہوں

کہ انساں تو ہے نام اک چشمِ تر کا

جو ہو روح میں اس غمِ معتبر کا

مری روح میں آنچ کم ہو گئی تھی

کہ شاید مری روشنی کھو گئی تھی!

اور اس وقت اک راز مجھ پر کھلا یوں

کہ پتھر کا میں ہو گیا ہوں، مگر کیوں؟

یہ کیسا زمانہ ہے؟ یارانِ جانی!

کہ انساں سے رخصت ہے رقت پرانی

کوئی شے ہے انسان کے دل سے چھوٹی

کہ ہر چیز جھوٹی ہے جھوٹی ہے جھوٹی!

محبت بھی جھوٹی ہے، نفرت بھی جھوٹی

عداوت بھی جھوٹی ہے شفقت بھی جھوٹی

نظر جھوٹ، دل جھوٹ، آنکھیں ہیں جھوٹی

خموشی بھی جھوٹی ہے باتیں بھی جھوٹی

یہ دعوے بھی جھوٹے ہیں وعدے بھی جھوٹے

کہ جھوٹے تو جھوٹے ہیں، سچے بھی جھوٹے

غمِ ہجر میں جان کھونا بھی جھوٹا

وفورِ مسرت میں رونا بھی جھوٹا

جو بیوی کو پوجے وہ چاہت بھی جھوٹی

جو بچوں کو پالے وہ محنت بھی جھوٹی

غرض جو بھی جذبات انسان میں ہیں

جو ہیں اور وہ بھی جو امکان میں ہیں

ستم ہے ستم، جھوٹ ہیں جھوٹ ہیں یہ

خدا کی قسم، جھوٹ ہیں جھوٹ ہیں یہ

یہ احساس کیا چیز ہے کیا کہوں میں

بیاں اس کا یہ ہے کہ بس چپ رہوں میں

سو چپ چاپ ان کو لحد میں اتارا

زمیں میں گیا میرا روشن ستارا

زمینِ وطن آج تک اجنبی تھی
پہ اب اس میں مٹی مری مل گئی تھی
کراچی تو کھیولی کی اب سر زمیں ہے
یہ میری امانت ہے اور تو امیں ہے

حواشی

فصل اول (بہار کالونی سے جہانگیر روڈ تک)

ا۔ زوّار احمد حنفی (۲) اسمٰعیل خاں (دوست) (۳) نہال سیوہاروی (۴) ماہر القادری (۵) راز مراد آبادی (۶) ذوالفقار علی بخاری (۷) نشور واحدی (۸) محبوب خزاں (۹) تابش دہلوی (۱۰) عزیز حامد مدنی (۱۱) علی حسنین زیبا (۱۲) مجتبیٰ حسین (۱۳) غیور احمد نقوی (جو بعد میں انکم ٹیکس کمشنر ہوئے) (۱۴) سرور قدوائی (۱۵) عبد القدیم خاں (۱۶) راجہ نعیم الدین صدیقی (دوست) (۱۷) حکیم احمد علوی (دوست) (۱۸) ظفر احمد (دوست) (۱۹) سید جمیل الدین احمد (تایازاد بڑے بھائی) (۲۰) علامہ رشید ترابی

ہم لوگ

البم نمبر ا

سوا سو روپے

مجھ سے اک میٹرک کے لیے

جسے ٹائپنگ بھی نہ آتی تھی

ایسے کم تو نہیں تھے!

(میں اس دور میں جتنا خوش تھا

ہزاروں کما کر گنوا کر بھی اب خوش نہیں ہوں)

مجھے صبح سے شام تک

نوٹ گننے میں بھی

قافیے ڈھونڈنے کی طرح

لطف آتا تھا!

اور ہر روز (ہر شام کو)

شعر کی صحبتیں

یار احباب کے قہقہے، چہچہے

(نعیم اور قدیم اب کہاں ہیں؟)
کبھی اردو مرکز میں جانا
کبھی اہل حلقہ سے الفت کی پینگیں بڑھانا
کبھی اردو مجلس میں یاروں سے لڑنا لڑانا
مگر میں ترقی پسندوں کی
اس انجمن کا
جو اشرف علی کی قیادت میں قائم ہوئی تھی
با قاعدہ رکن تھا!
یہ اشرف علی بھی عجب چیز تھے
یہ جس شہر کے تھے
وہاں ایک اکبرؔ تھے
باقی جو تھے صرف امرود تھے
یہ اکبر نہیں تھے
نہ امرود تھے
صرف اشرف علی تھے!
پرانے فراقی
بڑے انقلابی!
کہ جو مارکسؔ کے کیپٹل کی طرح
خود اپنے بھی سرمائے کو گھول کر پی گئے تھے
کبھی میرے دفتر میں تشریف لاتے
مجھے نوٹ گنتا ہوا دیکھ کر مسکراتے
اور اس مسکراہٹ میں اک دانت ایسا چمکتا

کہ ان کی ذہانت، شرارت

اور اک تیسری چیز

ہم اب جسے

احمقوں کے سوا

کھو چکے ہیں

یعنی معصومیت!

سب کا اک نقش دلکش ابھرتا

یہاں انجمن میں

کبھی خوش دلی سے، کبھی برہمی سے

کبھی دوستی سے، کبھی دشمنی سے

ترقی پسندوں سے لڑنے جھگڑنے

کو جاتے تھے

میں اور عالی!

یہ عالی کہ میرے لیے

دور کی اک صدا

عہد رفتہ کی اک یاد ہے

اردو مرکز کے جلسہ میں مجھ سے ملا

عشقِ صادق کا دعویٰ کیا

اور دَغا دے گیا!

مگر ان دنوں کا وہ عالی

یہ توندل بھندیسل سا عالی نہیں تھا

کہ تھیلے کے مانند خالی نہیں تھا

مرا تجربہ ہے، خیالات انسان کے جسم پر بھی اثر ڈالتے ہیں

اسے زیب دیتی تھی تب کجکلاہی

کہ دل ہو غنی تو یہی بادشاہی

بڑے طرہ بازوں کو دیکھا اکڑتے

مگر بول جاتے جب عالی سے لڑتے

یہ الطاف گوہر کے چھکے چھڑائے

بخاری پہ بھی ایسے فقرے لگائے

کہ روتے ہی بنتا نہ گاتے ہی بنتا

ندامت سے سر کو جھکاتے ہی بنتا

بڑے تھے بڑا پن دکھاتے ہی بنتا

ملا تھا لوہارو سے خونِ امیری

مگر دل میں تھی درد کی سی فقیری

شریف اس کی فطرت، نصیب اس کے علیٰ

کراچی میں میرے لیے تھا اجالا

مگر غیب سے اک ہوا ایسی آئی

کہ جس سے قناعت کی لو جھلملائی

قیامت ہے یہ آدمی آن ہارے

جنہیں ڈانٹتا تھا انہیں "سر" پکارے

جو شیروں پہ رکھتا تھا ترچھی نگاہیں

وہ گیدڑ کی گردن میں ڈالے ہے بانہیں

نثری

کہوں کیا کہ عالیؔ کو کیا ہو گیا ہے

فقط گلڈؔ کے "گلٹ" میں مبتلا ہے

کبھی کوہ تھا اب پرِ کاہ ہے یہ

کبھی شیر تھا آج روباہ ہے یہ

اسے مسکہ بازوں نے ایسا بگاڑا

ہمالہ کو اپنی جگہ سے اکھاڑا

مرے دل پہ افسوس کا داغ کر کے

اسے صحبت زاغ سے زاغ کر کے

بنایا مرے دل کو خوننابِ گریہ

کہ عالیؔ ہے میرے لیے بابِ گریہ

تو ہاں اک جوانِ طرحدار تھا وہ

کسی اہلِ قدرت کی تب "پخ" نہیں تھا

خود اپنے لیے ایک گلزار تھا وہ

بہارِ نظر کا خریدار تھا وہ

اس کے دوہوں میں جو رس ہے

مستی ہے

جو رنگ ہے

اس کی بانکی جوانی کی تصویر ہے!

یہ وہ دادِ سخن ہے

کہ جو مثلِ غنچہ

فضائے ادب میں کھلی ہے

جو ہم جیسے خود ساختہ شعر فہموں سے بڑھ کر

سجیلی کٹیلی مگر شوخ وفیاض ناروں

سے اس کو ملی ہے

مرا ذوق ہر چند

فراقؔ اور جوشؔ اور سقراط سے مختلف ہے

مگر! مجھ کو بھی

اس کی باتوں سے بھی کچھ سوا

اس کی آنکھوں نے بیتاب رکھا

کئی لمبی راتوں میں بے خواب رکھا

کبھی خود مرے پاس آتا

کبھی فون کر کے مجھے اپنے دفتر بلاتا

بہت بور کرتا کہ چائے پلا کر ڈرامہ سناتا

(یہ اس کا ڈرامہ کہ اب تک مکمل نہیں ہے

اس کی تقدیر کی اک علامت ہے

جو رفتہ رفتہ

قضاو قدر کے چھپے دفتروں میں لکھی جارہی ہے)

کبھی بور ہو کر میں کہتا

ارے یار کچھ بات بھی کر!

تو کہتا۔۔۔۔

"تم تو ہو کثردم و خفاش کے پُر ہول وطن

تم سے کیا بات کروں!

چپ رہوں میں تو کبھی خود سے بھی کچھ کہتے ہو

مجھ سے کھلتے نہیں، بقراط بنے رہتے ہو

تم سے کیا بات کروں؟"

میں اب آپ کو کیا بتاؤں

کہ عالی کے خفاش و کثر دم کی تلمیح کیا ہے

مگر چھوڑیئے!

آئیے آپ کو

مدنی و مجتبیٰ سے ملاؤں

مجھے ان سے اشرف علی نے ملایا

ملانے سے پہلے

عقیدت بڑھانے کو

یوں غائبانہ تعارف کرایا

کہ "مدنی ہیں تہذیب کا ایک پیکر

نہ دیکھے کبھی علم کے ایسے تیور

شریفانہ چہرے میں کیا روشنی ہے

پس آئینہ شمع سی جل رہی ہے

خفا سے، گریزاں سے، کچھ بدگماں سے

کہ رہتے ہیں اپنے سے بھی سرگراں سے

مگر مجتبیٰ تو عجب آدمی ہیں

کہ تصویر یوپی کی تہذیب کی ہیں

بڑے نکتہ داں ہیں بڑے خوش بیاں ہیں

سخن فہم ہم میں اب ایسے کہاں ہیں

فدائے سخن ہیں فدائے ادب ہیں

کہ سید ہیں، زیدی ہیں، اعلیٰ نسب ہیں

خود اپنے سے اکثر جھگڑتے رہے ہیں

زمانے سے پیہم بگڑتے رہے ہیں

یہ سیدھی سی باتوں کو بھی "رمز" سمجھیں

سلام ان کو کیجئے تو یہ طنز سمجھیں

محبت میں ہے مسلک گرم جوشی

سیاست میں ہے مسلک نرم کوشی

یہ گو "بنے بھائی" پہ مرتے بہت ہیں

پولیس کے رجسٹر سے ڈرتے بہت ہیں

قدامت کے شیدائی زندگی میں

گھٹنا پہنتے تھے یہ بمبئی میں"

ملے جب سر مو تبدل نہ پایا

وہی نکلے جب تل کو تل سے ملایا

ذرا لڑ جھگڑ کر

مری رجعتی فکر پر کچھ بگڑ کر

نہ جانے کہاں سے، کدھر سے

مرے دل میں اترے

کشادہ جگہ دیکھ کر

پھر وہیں رہ پڑے

تب سے درد جگر، درد سر ہو گئے ہیں

مرے واسطے یہ

عزیزوں سے بھی معتبر ہو گئے ہیں

نہیں میں جمیل آف جالب [1] کو بھولا نہیں ہوں
انہیں بھولنا
اپنے ہی آپ کو بھولنا ہے
یہ اس وقت سے میرے ساتھی ہیں
جب فرسٹ ایئر فول تھا میں
یہ مجھ سے ذرا سینئر تھے
مگر ان کی نظروں میں مقبول تھا میں
یہ انور [2] کو لے کر مرے پاس آتے
کبھی اپنے ہمراہ اختر [3] کو لاتے
وہ سنجیدگی اور متانت جوان کی محبت کی مانند
فطرت ہے ان کی
کوئی مانے نہ مانے، وہ قوت ہے ان کی
کہ جس نے مجھے روزِاول سے ان کا ثنا خوان بنایا
درِ دل کو کھولا، انہیں اپنا مہماں بنایا
ادب کے طویل اور صبر آزما راستے کی کٹھن منزلوں پر
بہت دور کی سوچتے تھے
مجھے کاہلی، چگی بازی، پریشان خیالی کے طعنے سنا کر
بڑی سادگی سے کہ نشتر کی مانند سفاک ہے
میرا دل نوچتے تھے
اگرچہ یہ ہے دور کا ایک قصہ

مگر یہ "نیا دور" ہے ان کے دیرینہ خوابوں کا حصہ

کراچی میں آ کر بہت لوگ بدلے

پہ دل میں مرے اب بھی موجود ہیں یہ

محبت میں سچے، وفا میں کھرے اس قدر ہیں

کہ عالؔی کے محسود ہیں یہ

بڑے نرم خُو، اک غذائے مُلیّن

کہ حلوائے بے دود ہیں یہ

مگر خان صاحب ہیں

غصے میں آ جائیں

تو اک دھماکے کی بارود ہیں یہ

انہیں کچھ کہوں تو فرشتے پہ تہمت لگاؤں

مری زندگی جو بھی باقی ہے

سب ان کو دے دوں

اگر ان کی قیمت لگاؤں

وہ "دو جیم" کیا خوشنما تھے

جنہوں نے مقدر کی خوبی سے اکبر کو اتنا بڑھایا

کہ شاعر کی پستی سے اوپر اٹھا کر

بڑا "جج" بنایا

مجھے بھی جہالت، جراحت، جفائے زمانہ کے ہمراہ

کچھ "جیم" ایسے ملے ہیں

کہ جن میں ججی ہو نہ ہو

کچھ کمال اور بھی ہیں

"جمیلین" سے آپ مل ہی چکے ہیں

مگر اک جمال[۴] اور بھی ہیں

یہ عالی کے پکے چہیتے

محبت کی بازی نہ ہارے نہ جیتے

ترنم سے پہلی غزل جب سنائی

خدا جانے کیوں آنکھ میری بھر آئی

کبھی دل کی حالت کسی سے نہ کہتا

مگر ان سے ملنے کو بیتاب رہتا

ادھر ان کا یہ حال کترا کے چلتے

نہ ملتے، نہ چلتے نہ کچھ بات کرتے

مگر میں نے کچھ ایسے نقشے جمائے

جو میرٹھ میں سیکھے تھے وہ سارے کرتب دکھائے

کہ آخر بڑے سخت لوہے کو موڑا

کئی سال کے بعد عالی سے توڑا

بہت دوست ملتے ہیں جو باوفا ہیں

یہ دل کی صفا سے مرا آئینہ ہیں

کبھی ناصر کاظمی جب کراچی میں آتے

تو ہم جیسے "پسماندگانِ ادب" سے بھی ملتے ملاتے

انہیں عسکری نے نئی نسل کا سب سے اچھا غزل گو لکھا تھا

ہماری نظر میں تو ان کا بڑا مرتبہ تھا

کہ ہم عسکری کو امامِ ادب جانتے تھے

اسی ایک رشتے سے ناصؔر کو پہچانتے تھے

وہ جب اپنی باتوں کا غزلوں کا جادو جگاتے

بڑی شفقتوں سے کھلے دل سے تعریف کر کے

ہماری "گجلیا" بھی سنتے سناتے

سنا ہے یہ میں نے کہ بیمار ہیں وہ

شفا کی دُعا مانگتا ہوں، مگر جانتا ہوں

کہ اپنے لیے جاں کا آزار ہیں وہ

مسرت کو ٹھکرائیں، راحت سے بھاگیں، اداسی کو پالیں

کسی طرح سے دردِ دنیا اجالیں

مگر آہ دنیا، یہ دنیا کہ جو شاعری سے سنورتی نہیں ہے

(امیر احمقوں کی یہ قحبہ جو شاعر کو برداشت کرتی نہیں ہے)

سنو کاظمی! اے بھلے آدمی، روگ کیا تم نے پالا

تمہارے جلے سے نہ ہوگا اجالا

کہاں تک، کہاں تک، کہاں تک جلو گے

کسی روز پیارے یونہی جل بجھو گے

خدا تم کو رکھے ابد تک جیو تم

جیو جب تلک کاش خوش رہ سکو تم

"بہاری" نہیں اک "بہاری" جواں ہیں

مرے مہرباں ہیں

بہاروں کے اک نقشِ معکوس یعنی خزاں (۵) ہیں

محبت کے جویا، طبیعت کے سادہ
بہت ناپ تولے نہ کچھ کم نہ زیادہ
مری زندگانی کو اک ضیق کر کے
ہر چیز کی جمع تفریق کر کے
کسی طرح سے ایسا حاصل نکالیں
کہ نشتر سے جیسے مرا دل نکالیں
کبھی مفلسی کے عواقب بتائیں
کبھی عمر کے خاتمے سے ڈرائیں
کبھی رائگانی کا احساس بیدار کر کے
سمندِ قلم کم رقم کو نئے تازیانے لگائیں
کبھی جلدی سونے کی تاکید کر کے
مگر حفظِ صحت پر خود اپنے لیکچر کی تردید کر کے
مسلسل، برابر سحر تک جگائیں
کبھی سوچتا ہوں کہ اس آدمی نے
مری جیسی مجھ سے محبت نہیں کی
نہیں یہ غلط ہے، محبت تو کی
پر یہ سچ ہے
کہ جھوٹی رعایت نہیں کی

مرے ایک جیم (٦) اور ہیں جانِ محفل
مری خوش نصیبی سے میرے مقابل
سمجھتے ہیں یہ خود کو چھوٹا سا لیڈر
کہ پچھلے دنوں میں رہے ہیں ڈبیٹر

ڈبیٹوں میں اکثر ٹرافی تھی ماری
تو اب بھی ہے تقریر کی مشق جاری
سحر سے سحر تک یہاں تک یہ بولیں
کہ تارے بھی انگڑائی لیں اور سولیں
یہ استاد ہیں اپنے فنِ سخن میں
بہت بول کر کچھ نہ کہنے کے فن میں
یہ انداز ان کے بایں باشعوری
سمجھتے ہیں ہر بات کو لاشعوری
ہر اک بات میں ایسے معنی بتائیں
کہ جو آپ کے خواب میں بھی نہ آئیں
گلِ تر ہیں ایسے کہ پھولے نہیں ہیں
ابھی اپنے بچپن کو بھولے نہیں ہیں
اگر میں مقدر سے "پاور" میں آؤں
انہیں ماتلی کا گورنر بناؤں
یہ بن جائیں ہرچند خوئے کنشتی
خدا نے انہیں دی ہے بوئے بہشتی
ذہانت کے پُتلے ہیں صاحبِ نظر ہیں
مگر اپنی قوت سے خود بے خبر ہیں
یہ اپنے لیے خود سراسر زیاں ہیں
کہ ہیں گوہرِ ناب پر رائگاں ہیں
جو پورا نہیں ہوسکا ہے وہ رن ہیں
سیاست میں چھوٹے سے نپولین ہیں

حریفوں سے ہر حال میں ہیں یہ بہتر
سمجھتا ہوں میں آپ کو پٹ دی ینگر
کبھی مجھ میں ایسے فضائل نکالیں
جلیں لوگ، منفی دلائل نکالیں
کبھی جب وہ جوشِ خطابت میں آئیں
تو مجھ میں دکھائیں خود اپنی خطائیں
کبھی یہ فرائڈ پہ لیکچر پلائیں
کبھی یونگ کے ٹسٹ کو آزمائیں
غرض صرف اتنی کہ مجھ کو ستائیں
کسی طرح سے غیر شاعر بنائیں
ستانا، جلانا، مسلسل کڑھانا
یہ دل میں سمانے کا طرفہ بہانا
کہوں کیا کہ دل میں میرے ہائے ہائے
بہت گہرے پنجے انہوں نے گڑائے
میرے دل میں کیا ہے سوائے محبت
کہ نازل ہے مجھ پر بلائے محبت
سمجھتا تھا میں ان کو ہمراز ہیں یہ
یہ کہتے ہیں مجھ کو ”گروپ باز“ ہیں یہ
مجھے دشمنِ جانِ یک سوئی ہیں یہ
مری آنکھ کی آخری سوئی ہیں یہ
میں باندھوں انہیں گھر کے باہر کہ بھیتر
مرے واسطے ہیں یہ اوچھے کے تیتر

جو ہے شہر میں میری "شہرت" کا قصہ
تو اس میں ہے سو فیصدی ان کا حصہ

یہاں ذکرِ سید(۷) بھی لازم ہے مجھ پر
یہ سید بڑی شے ہیں یعنی مظفر
مجھے کم ہی آتا ہے مرعوب ہونا
مگر ان کی ہر بات پر "خوب" کہنا
انہیں لوگ کہتے ہیں بقراط ہیں یہ
پہ مری نظر میں تو سقراط ہیں یہ
نہ ناسخ، نہ آتش نہ یہ مصحفی ہیں
یہ پنجاب کے ہیں مگر لکھنوی ہیں
اگر اپنی ہندی نویسی پہ آئیں
تو عالی کو بھی دوہے لکھنے سکھائیں
جھلک لیلیٰ فن کی ہے آرسی میں
یہ اردو کا دیوان ہیں فارسی میں
جو پچھلے جنم میں نہیں چھپ سکا تھا
محبت کا ہیں ایسا نایاب نسخہ
یہ ممکن نہیں ہے کراچی میں آئیں
اور اپنی محبت کا تحفہ نہ لائیں
نہ کام آئیں ہرگز کہ بیکار جائیں
زبانِ خموشی کی سب التجائیں
میں سنتا رہوں اور یہ گھنٹوں سنائیں
مری طاقتِ صبر یوں آزمائیں

محبت میں سچے طبیعت میں طاہر
شرافت میں ایسی کہ چہرے سے ظاہر
بظاہر ہے طرزِ تخاطب میں نرمی
پہ شامل ہے ہر بات میں دل کی گرمی
وہ گرمی کہ نرمی سے دل میں سمائے
گداز ان کے ہاتھوں کا دل کو گھلائے
خلوص ان کا زندہ محبت جواں ہے
مگر ان سے ملنے میں جاں کا زیاں ہے

مجھے اردو مرکز میں جن اہلِ دانش نے چاہا
بڑھایا، ابھارا، نوازا، سراہا
مری سرکشی کو
خلوص و محبت کی وہ مار ماری
کہ جب تک جیوں گا
زبان اور دل پر رہیں گے
حمیدِ نسیمؔ و حفیظؔ و بخاریؔ

حواشی

(ہم لوگ، البم نمبر۱)

(۱)ڈاکٹر جمیل جالبی (۲) انور عالم (۳) اختر عالم (پروفیسر رزمی صدیقی کے صاحبزادگان اور سلیم احمد کے دوست)(۴) جمال پانی پتی (۵) محبوب خزاں (۶) قمر جمیل (۷) مظفر علی سید۔

اسٹوڈیو نمبر ۹

وہ دن تھے کہ جنسِ ہنر تُل رہی تھی
نئی ریڈیو میں دکاں کھل رہی تھی
بخاری[1] نے اک روز مجھ کو بلایا
باندازِ فرماں یہ مژدہ سنایا
کہ جا نوٹ گننے سے تجھ کو چھڑایا
ڈرامہ نویسی کے اوپر لگایا
کہاں میں کہاں فن تمثیل سازی
پہ اپنی روایت ہے اک مرغ بازی
تو میں نے بھی دو چار مرغے لڑائے
الٹ پھیر کے چند کرتب دکھائے
یہاں سے وہاں سے خیالات اڑائے
پلاٹ اور کردار بھی کچھ چرائے
کچھ اپنی طرف سے پھر اس میں ملایا

ڈرامہ نویسی کا چکر چلایا
ڈرامے شرامے کہ تقریر و فیچر
وہ سب جن سے ہے سستی شہرت کا چکر
لکھے میں نے اتنے کہ شہرت سمیٹی
وہ شہرت کہ ہے شہرت "دھر گھسیٹی"
اب اس کے سوا کیا کہے اور بندہ
مچھندر کو روٹی کمانے کا دھندہ
مگر یہ بھی یاروں کو میرے گراں تھا
خفا تھا کوئی اور کوئی بدگماں تھا
"کہ لیجئے اِدھر سے اُدھر ہوگئے ہیں
غزل گو بِلے رائٹر ہوگئے ہیں
کہاں حشؔر اور تاجؔ کا فنِ اعلیٰ
یہ حضرت لگائیں گے اس کو بھی تالا
ہمیں تھی یہ امید کچھ کام ہوگا
یہ فنِ شریف ان سے بدنام ہوگا
یہ رجعت پسندوں کے حامی بڑے ہیں
ترقی پسندوں پہ حملے کیے ہیں
یہ ان کا تقرر اسی کا صلا ہے
انہیں ان کا یہ حقِ خدمت ملا ہے
بڑے ان کے تیور تھے بڑھ کر رہیں گے
تو یہ اب گئے، صرف تیور رہیں گے
مگر خیر اچھی ہوا چل گئی ہے

ادب کے تو سر سے بلا ٹل گئی ہے"

یہ ہے سامنے نشرگاہِ کراچی!
یہاں میں نے دیکھا ہے ماہِ کراچی
بظاہر تو اک ملک سرکار تھی یہ
شہنشاہ اکبرؔ کا دربار تھی یہ!
بخاریؔ کی اللہ رے شان و شوکت
وہ جاہ و جلال اور وہ ان کی عظمت
بخاری کے نقشے چمن در چمن تھے
کہ دربار میں ان کے بھی نورتن تھے
حفیظ[۲] ان کے فیضیؔ، قطبؔ[۳]، بوالفضلؔ تھے
میاں شوکتؔ تھانوی بیربل تھے
نہال[۴] ان کے بیجو تھے (شاہد ہوں عینی)
تو شاہد[۵] کو تھی خدمت تان سینی
بدایوں کے علامہ کا اک خلا تھا
تو حسرت[۶] کا آخر تقرر کیا تھا
سلیم[۷] ان کے شیخو، بڑے لاڈلے تھے
(یہ ہر بات پر ان سے ملتے گلے تھے)
حمیدؔ نسیم ان کے یارِ موافق
تو طاہر[۸] بھی خدمت گزاری میں صادق
(اور ان کے سوا جو بھی ہمراہ ہو لے)
کمربستہ حاضر خواصوں کے ٹولے

یہاں کب کسی کو مجالِ سخن تھی
کہ مانندِ تصویر یہ انجمن تھی!
یہاں بولتے تھے تو بے شک بخاری
سنے جائیں دن بھر یہ قسمت ہماری

بخاریؔ کا کیا حسن ہے الا ماشا
کہ آذر نے جیسے صنم ہو تراشا
وہ چہرہ ہے کہ ہے جمع جس پر بکثرت
شرافت، ذہانت، شرارت، خباثت
وہ چہرہ کہ سب رازِ دل ان کے کھولے
وہ چہرہ کہ یہ چپ اگر ہوں تو بولے
نہ گو لب یہ کھولیں مگر وہ صدا دے
کسی کو ہنسا دے کسی کو رلا دے
ہر احساس آتا ہے اس پر سمٹ کر
یہ چہرہ ہے جذبات کا بیرومیٹر
ملا ہے انہیں کن بلاؤں کا چہرہ
یہ یونان کے دیوتاؤں کا چہرہ
وہ سانچہ خدا نے انہیں جس میں ڈھالا
انہیں ڈھال کر پھر اُسے توڑ ڈالا
یہ ہیں خاک، پر آگ سے یہ بنے ہیں
یہاں آدمی اور جن مل گئے ہیں
خدا نے ملا کر اندھیرا اجالا

یہ صنعت کا اپنی نمونہ نکالا!
ابھی حاتمِ وقت، ابھی شوم ہیں یہ
ابھی سنگ ہیں یہ، ابھی موم ہیں یہ
ابھی بحر کی طرح پُرجوش ہیں یہ
ابھی کوہ کی طرح خاموش ہیں یہ
گہے پُر سکوں گاہ بے تاب ہیں یہ
ابھی آگ ہیں یہ، ابھی آب ہیں یہ
مجھے تو بصیرت کا اک آئینہ ہیں
یہ انسانی فطرت کا اک آئینہ ہیں
وہ گل ہیں جہاں چاہے ان کو سجادو
وہ مصرع جسے ہر غزل میں لگادو
بہت ان کے پیکر، پہ اک روح ہیں یہ
روایت کا اک عطر مجموع ہیں یہ
بہت میں نے دیکھا ہے ایسا تماشا
کہ ہیں پل میں تولہ، تو ہیں پل میں ماشا
ابھی روئے خنداں، ابھی چشم تر ہیں
ابھی فلسفی ہیں، ابھی ایکٹر ہیں
ابھی دیکھئے تو یہ شاعر ہیں بالکل!
ذرا دم میں بدلیں تو افسر ہیں بالکل
ابھی ساتھ گردن میں ڈالے ہیں بانہیں
ابھی مار کر لات باہر نکالیں!
تلون طبیعت کا ہے راس ان کو

مگر اہلِ عزت کا ہے پاس ان کو
یہاں حد سے اپنی گزرتے نہیں ہیں
بڑے ہیں، سُبک بات کرتے نہیں ہیں

اور اک خوبی ایسی ہے ان میں کہ حضرت
بہت لوٹ ہے جس پہ میری طبیعت
یہ ناکارہ لوگوں کو اکثر سراہیں
نکمے جو بالکل ہوں ان کو بھی چاہیں
مگر ایک بازی یہ ہرتے نہیں ہیں
کہ احمق کو برداشت کرتے نہیں ہیں

یہ دنیا ہے کیا کوئی کیوں اس پہ پھولے
برائی رکھے یاد، خوبی کو بھولے!
انہیں چاہے اہلِ جہاں بھول جائیں
مجھے یاد ہیں ان کی اک اک ادائیں
اُس عالم میں ان کے بڑے کروفر تھے
ہمارا تو کیا ذکر ہم تو صفر تھے
بڑے لوگ دیکھے کہ بھرتے تھے چلمیں
ذرا یہ جو بولیں تو گھس جائیں بل میں
خوشامد میں اس طرح مکھن لگائیں
بخاریؔ بھی شرما کے گردن جھکائیں
بخاریؔ سنائیں غزل جب جما کے

تو اڑ جائے چھت شور سے واہ وا کے

بہت سوں کو جوتے اٹھاتے بھی دیکھا

بہت سوں کو ٹانگیں دباتے بھی دیکھا

مرے دل کو ان سے عجب سلسلہ تھا

انہیں دل نوازی کا اک فن ملا تھا

اگر ریڈیو پر ہے کچھ میری عزت

اگر لوگ کرتے ہیں مجھ سے محبت

تو یہ سب بخاریؔ کی بخشش ہوئی ہے

کہ یہ گونج اب تک اُسی دور کی ہے

وہ گنبد کے نیچے جو کمرہ بنا ہے

بڑے اونچے لوگوں کا مسکن رہا ہے

فرید(۹) اس میں بیٹھے، قطب(۱۰) اس میں آئے

میاں ناصری(۱۱) نے بھی ڈیرے جمائے

حفیظ(۱۲) اور اقبال(۱۳) پر اس کا سایا

نسیم(۱۴) اور ظفر(۱۵) کے بھی یہ کام آیا

کہوں مختصر آر۔ڈی بیٹھتے ہیں

یہاں آج کل شاہ جی(۱۶) بیٹھے ہیں

اگرچہ یہ اک خاک ہیں ریڈیو کی

خدا کی قسم ناک ہیں ریڈیو کی

بڑے صاف باطن، بڑے نیک دل ہیں

کرم فرما میرے ہیں اور مستقل ہیں

اگرچہ بہت ریڈیو گھٹ گیا ہے
کہ اچھا جو تھا مال سب چھٹ گیا ہے
وہ انداز اب ریڈیو کے کہاں ہیں
مگر یہ گئی عظمتوں کے نشاں ہیں
وہ رونق جو تھی بزم کی سب گئی ہے
یہ اک شمعِ آخر ہیں جو جل رہی ہے
غنیمت ہے یہ وقت جو بھی بہم ہیں
خدا جانے کس وقت یہ ہیں نہ ہم ہیں
یہاں ناصری(۱۷) بھی کبھی آر۔ڈی تھے
یہ دلی کے روڑے، بڑے آدمی تھے
یہ ناصر علی دہلوی کے تھے پوتے
کبھی بات کرتے تو موتی پروتے
عروسِ سخن کا یہ جوڑا بناتے
کہ باتوں میں بھی لچکا گوٹا لگاتے
ہر اک شخص کو اپنی گڈ بک میں رکھتے
ہر اک چیز کو اپنی کابک میں رکھتے
انہیں جب بھی دیکھو نئے ان کے تیور
اڑانوں پہ رہتے ہیں ان کے کبوتر
مجھے حکم تھا ان کا یہ، روز آؤ!
رجسٹر میں پھر حاضری بھی لگاؤ
یہ بہتر ہے اک ڈائری بھی بناؤ
کیا کام جتنا ہے سارا دکھاؤ

بڑی ان دنوں جاں مری ضیق میں تھی
کہ کاہے کو یہ نوکری میں نے کی تھی
میں اک دن بہت دیر سے گھر سے آیا
تو حضرت نے چپراسی بھیجا بلایا
کہا "آپ پھر دیر سے آرہے ہیں
بڑی آپ گڑبڑ یہ پھیلا رہے ہیں"
کہا میں نے "حضرت کبوتر تو ہوں میں
بڑے آپ افسر ہیں، نوکر تو ہوں میں
مگر یہ سمجھئے کہ اب مڑ گیا ہے
کبوتر جو تھا آپ کا، اڑ گیا ہے"
خدا جانتا ہے کہ بالکل نہ بگڑے
ہنسے اور پھر ہنس کے مجھ سے یہ بولے
"یہاں جو بھی ہے لا ابالی رہے گا
میں سمجھا کہ کابک یہ خالی رہے گا"

سمجھتا تھا میں آپ کو صرف شاعر
پہ دفتر میں آیا تو دیکھا ہیں افسر
ہمارے لیے اک خوشی بن کے آئے
یہ اک دور میں آر ڈی بن کے آئے
بڑے تھے تو بے شک بڑا پن دکھایا
کہ اکثر مجھے اردو لکھنا سکھایا
کبھی میرے فیچر کی اصلاح کرتے

تو فقروں میں جملوں میں اک رنگ بھرتے
متاعِ ہنر اتنی تقسیم کردی
کہ مطلع میں بھی میرے ترمیم کردی
کتابوں کے شیدا، نوادر کے جویا
نزاکت کو دیکھو تو ہیں مرزا پویا
اگر علم و فن کا کوئی مسئلہ ہو
جو تحقیق لفظی کا کچھ سلسلہ ہو
تو بس آیئے اتنی تکلیف کیجئے
حفیظؔ اب بھی موجود ہیں پوچھ لیجئے
پرانی کتابوں میں یوں نال گاڑی
کہ خود بن گئے ہیں یہ حضرت کباڑی

مری آنکھ میں یادِ حسرت (۱۹) سے نم ہے
کہ ایسوں کی تو یاد بھی محترم ہے
بجا ہے کہ فرزندِ کشمیر تھے وہ!
پہ تہذیبِ یوپی کی تصویر تھے وہ!
کبھی یہ نہ سمجھا کہ استاد ہوں میں!
وہ کہتے تھے شاگردِ آزاد ہوں میں
انہیں بھول جائے اگرچہ زمانہ
وہ تھے عالم و دانش کا زندہ خزانہ
بڑا علم لکھا تھا دل کے "صفے" میں
کتب خانے محفوظ تھے حافظے میں

وہ ان کی شگفتہ بیانی کا عالم
وہ خوش گوئی اور خوش زبانی کا عالم
وہ سادہ سے فقرے کہ بجلی کے پارے
وہ الفاظ جیسے چمکتے ستارے
پرانے ادیب اور پرانے صحافی
کہ جاہل کو تھی ان کی صحبت ہی کافی
جو فقرے لگائیں کبھی دل لگی کو
تو الٹا دیں وہ شوکتِ تھانوی کو
یہ دیکھا لحاظ ان کا کرتے بہت تھے
بخاری بھی فقروں سے ڈرتے بہت تھے
کہا ایک دن نظم مدنی[۲۰] کو سن کر
کہ خفاش و کثر دم کے ڈکشن سے بھن کر
"جناب آپ اردو میں رہتے نہیں ہیں
ڈراتے تو ہیں شعر کہتے نہیں ہیں!"
وہ گل ہیں کہ تا حشر تازہ رہیں گے
ہمیشہ مرے دل میں زندہ رہیں گے
جہانِ گراں کی یہ جنسِ گراں تھے
کہ سلمان ارشد[۲۱] کے بھی اباجاں تھے
بڑے بذلہ سنج اور بڑے خوش بیاں تھے
کہ یہ بھائی شوکت[۲۲] کے بھی بھائی جاں تھے
وہ پیری میں ان کی جوانی کا عالم
مرے واسطے ایسے جیسے کہ شبنم

کبھی پیار سے مجھ کو لونڈا کہیں وہ
کہ سلمان ارشد کا چاچا کہیں وہ
کبھی پیار سے مجھ کو جاؔمی کہا ہے
کبھی داد دے کر حرامی کہا ہے
وہ میرے بزرگ اور وہ یار میرے
ہر اک حال میں تھے وہ غم خوار میرے
خدا ان کو بخشے بہ راحت رہیں وہ
گلِ تازۂ باغِ جنت رہیں وہ

نسیم (۲۳) آپ ہیں مثلِ باد بہاری
انہیں میں سمجھتا ہوں چھوٹا بخاریؔ
وہی تمکنت ہے وہی ناز ان میں
بخاری کے ہیں سارے انداز ان میں
شرافت وہی ہے، ذہانت وہی ہے
مرے دل میں ان کی محبت وہی ہے
یہ ماہر غزل کے ہیں اور تال سر کے
کہ ہیں رہنے والے یہ گرداسپور کے
بڑا ان کا رتبہ ہے پر کم رہے ہیں
نبوت کا دعویٰ نہیں کرسکے ہیں
جو خوش ہوں تو ذرے کو سورج بنائیں
خفا ہوں تو سورج کو ذرہ دکھائیں
یہ بازی محبت کی ہرگز نہ ہاریں

ابھی سر چڑھائیں ابھی مار اتاریں

یہ دیکھا کہ ویسے تو خاموش ہیں یہ

مگر بحث کرنے میں پرجوش ہیں یہ

دکھائیں جب اپنی زباں کی اڑانیں

فراقؔ اور جگرؔ کو بھی شاعر نہ مانیں

یہ گو دونوں سے کان پر ہاتھ رکھیں

حفیظؔ اور ہاں جوشؔ کو ساتھ رکھیں

بڑھائیں اگر جوشؔ کو التزاماً

کہیں ان کو اردو کا استاد دامن

یہ کس اور شاعر کو پہچانتے ہیں

یگانہؔ کو البتہ کچھ مانتے ہیں

اجاڑی ہے گو شعر کی ساری بستی

پہ کرتے ہیں غالبؔ کی کچھ سرپرستی

بہت ان سے سیکھے ہیں گُر شاعری کے

یہ استاد ہیں ناصرِ کاظمی کے

ہمیشہ عنایت پہ مائل ہیں اتنے

خلوص و محبت کے قائل ہیں اتنے

کبھی بھول کر خود کو افسر نہ سمجھا

ہمیشہ کہا ''بھائی'' کمتر نہ سمجھا

بلا میری خود اپنے سر لے چکے ہیں

یہ استعفیٰ میرے لیے دے چکے ہیں

خدائے جہاں یہ دعا ہے ہماری

پلٹ آئے اک دن یہ یہ باد بہاری
حمیدِ نسیم اپنا کمرہ سجائے
بلاتے تھے ہم کو، پلاتے تھے چائے
یہاں ایک دن میں ضیاء(۲۴) سے ملا تھا
وہ باتیں ہوئیں غنچۂ دل کھلا تھا
تخیل نے ان کی شبیہیں بُنی تھیں
بہت ان کے بارے میں باتیں سنی تھیں
بہت اہل یوپی سے رہتے ہیں برہم
کہ حضرت ہیں پنجابیت میں مجسم
تعصب کے پُتلے ہیں یہ بس بھرے ہیں
بہت جوش صاحب پہ فقرے کسے ہیں
مہاجر کو کہتے ہیں یہ ننگے بھوکے
کہ جلتے ہیں یہ نام سے لکھنؤ کے
اسی طرح کے اور کتنے ہی قصے
سنائے تھے یاروں نے حضرت ضیاء کے
مگر اب جو دیکھا تو کچھ بھی نہ پایا
"ارے کیا یہ صاحب، وہی ہیں خدایا"
(بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا!
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا)
نہ شعلہ ہیں کوئی نہ کوئی شرر ہیں
ضیاء چاند کی ہیں، بہت بے ضرر ہیں
جلے ہیں تو برحق ہے ان کا جلایا

کہ کھلتا ہے خود مجھ کو بھی "یو پیاپا"
یہ رس کے بھرے ہیں کہ بس کے بھرے ہیں
ضیاء کچھ بھی ہوں، جو بھی ہیں یہ کھرے ہیں
مگر ان میں، میں نے بھی اک لاگ پائی
ادب کے لیے دل میں ہے آگ پائی

مری آنکھ میں آج آنسو بھر آئے
مجھے بھائی شاہد بہت یاد آئے
مرے ہاتھ میں تھی بہت شبھ جو ریکھا
انہیں میں نے دیکھا تو دلی کو دیکھا
یہ ساقی کے مالک، یہ ڈپٹی کے پوتے
کراچی میں کیا داغِ افلاس دھوتے
وہ غیرت نہ احساں کسی کا اٹھائیں
مگر گھر چلانے کو گائیں بجائیں
بہت لوگ قلاش کہتے تھے ان کو
کہ عالی سٹری لاش کہتے تھے ان کو
میں آخر دنوں میں کچھ ان سے خفا تھا
کوئی بات تھی جس کا دکھ ہوگیا تھا
مگر زخم ان سے جو پایا ہے میں نے
اسے دل کا مرہم بنایا ہے میں نے
خدا ان کو بخشے عجیب آدمی تھے
اندھیرے میں تہذیب کی روشنی تھے

یہاں اور ہیں اک محبت کے تاجر
کہ اب تک چلے آرہے ہیں مہاجرؔ (۲۶)
سنا ہے کہ پہلے ڈبیٹر رہے ہیں
اسی واسطے اب یہ کم بولتے ہیں
بڑی روشنی ہو مگر گھپ رہیں یہ
کوئی کچھ بکے جائے بس چپ رہیں یہ
خدا جانے کس راز کو پالیا ہے
کہ اتنی خموشی کو اپنالیا ہے
خموشی سخن میں ہے معنی سموتی
کبھی بولتے ہیں تو جھڑتے ہیں موتی

ملے ریڈیو میں مجھے کیسے سائے
ارمؔ (۲۷) اور تابشؔ (۲۸) یہیں میں نے پائے
برادر زبیریؔ (۲۹) نے مطلع کہا ہے
کہ نور صداقت سے چمکا ہوا ہے
"نہ تم لکھنوی ہو، نہ ہم لکھنوی ہیں
ارمؔ لکھنوی تھے، ارم لکھنوی ہیں"
تو تابشؔ بھی اک پرتو روشنی ہیں
ارمؔ لکھنوی ہیں تو یہ دھلوی ہیں
یہ فانیؔ کے شیدا ہیں، وہ آرزوؔ کے
غزل! کیا ہیں ساماں تری آبرو کے

وہ ایسے کہ دوڑائیں ریسوں میں گھوڑا
یہ ایسے کہ سب کچھ کریں تھوڑا تھوڑا
مئے شوق تھوڑی سی دونوں پیئے ہیں
یہ پامسٹ ہیں اور وہ ریسیئے ہیں
انہیں دیکھئے بند کھولے ہوئے ہیں
انہیں دیکھئے شیروانی کسے ہیں
وہ جوش طبیعت سے ہیں لاابالی
یہ تنظیم کے ایک مردِ مثالی
زمانے نے پائے ہیں پھل پھیکے سیٹھے
مجھے میری قسمت سے دونوں ہی میٹھے

اب ان سے بھی ملئے یہ قیّوم بھائی
سمجھئے گا بھائی کا مفہوم "بھائی"
محبت میں اس درجہ سرشار ہیں یہ
کہ مجھ سے بڑے ہیں مگر یار ہیں یہ
یہ میری خطاؤں پہ بھی مسکرائیں
مرا ناز بیجا بھی ہنس کر اٹھائیں
میں انسان کے ایسے ٹائپ کے صدقے
بلا ٹال دیتے ہیں پائپ کے صدقے
شعیبؔ حزیں! آپ کو دیکھئے گا
انہیں کیا مرے باپ کو دیکھئے گا
مری ان کی عمروں میں کس درجہ بل ہے

سنی تھی جو بچپن میں ان کی غزل ہے
بایں ریش یہ یار میرے بنے ہیں
کہ سینگیں کٹا کر یہ بچھڑے بنے ہیں
تو میں نے بھی ان کو کچھ ایسا سمیٹا
کہ کہتا ہوں میں پیار سے ان کو "بیٹا"
مری روح میں کیسا رس گھولتے ہیں
میں بیٹا پکاروں تو یہ بولتے ہیں
مرے غم کے ساتھی، مسرت کے ساتھی
ہمیشہ ہر اک رنج و راحت کے ساتھی
بڑے اک زمانے میں کس بل رہے ہیں
سو اب بجھ گئے ہیں مگر چل رہے ہیں
مرے دل سے ان کی ہے جو راہ، رکھے
خدا ان کو تاحشر ہمراہ رکھے
یہاں کابلی (۳۱) اور بشیر (۳۲) بھی ملے تھے
کہوں کیا کہ دونوں کے کیا مرتبے تھے
وہ دن حشر جب انڈین شیکسپیئر تھے
یہ دونوں بھی تب ان کے شمس و قمر تھے
خدا نے یہ رتبہ دیا تھا، جہاں میں
بڑی دھوم تھی سارے ہندوستاں میں
بخاری کے دم سے لگے تھے کنارے
کسی آسماں کے یہ ٹوٹے ستارے
کہا میں نے اک دن کہ کس حال میں ہیں

کہا "شیر لوہے کے اب جال میں ہیں"

بزرگوں کو چھوڑوں میں یاروں میں آؤں
کہ ذرہ ہوں آخر، ستاروں میں آؤں
زمانہ ہے واقف کہ کتنے بڑے ہیں
یہ فن کار جو ریڈیو میں پڑے ہیں
یہ لالہ نصیر اور ظفر(۳۳) اور رفعت(۳۴)
خزانے یہ آواز کے، فن کی دولت
امیر(۳۵) اپنے جو خان صاحب بڑے ہیں
کہ جو پیشوائی کو میری کھڑے ہیں
انہیں کم نہ سمجھو کہ یہ ہیں زیادہ
یہ "فرزیں" ہیں رہتے ہیں گو پا پیادہ
ہر اک ان میں تنہا، ہزاروں پہ بھاری
انہیں کھینچ لائے فلک سے بخاری

مگر میرے یاروں میں ماجد(۳۶) جدا تھا
مرا اس کا کچھ اور ہی معاملہ تھا
کہوں کیا کہ کیا تھا مرا یار ماجد
وہ میرے ڈراموں کا کردار ماجد
وہ کہتا تھا مجھ سے "اگر میں نہ ہونگا
برا مان جاؤ پہ سچ ہی کہوں گا
جو لکھتے ہو کردار، کیسے لکھو گے

میں دیکھوں گا کتنے ڈرامے لکھو گے
تمہارے ڈراموں کو میں پالتا ہوں
یہ مردے ہیں اور جان میں ڈالتا ہوں
تو یارو! وہ جس دن سے رخصت ہوا ہے
قلم میرا خالی ہے، اب کیا رہا ہے
ہر اک میرا کردار حیران سا ہے
میں جو لفظ لکھتا ہوں بے جان سا ہے
ڈرامہ تو لکھتا ہوں، روٹی ہے کھانی
مگر اب کہاں وہ روانی پرانی
سکوں میرے دل کو جو آتا نہیں ہے
خدا کی قسم لکھا جاتا نہیں ہے
مرے یار تو نے کیا کیا ڈرامہ؟
کہ لے کر گیا ساتھ تو جانِ خامہ
پلٹ کر مری سمت دیکھا نہیں ہے
گیا اور پھر خط بھی بھیجا نہیں ہے
مرا دوست تھا پر وہ کتنا بڑا تھا
کہ گنجا شہنشاہ آواز کا تھا

یہ خانم (۳۷) گلِ تازۂ ریڈیو ہیں
ازل سے یہ آوازۂ ریڈیو ہیں
انہیں میں نے دیکھا تو اک شمع سی تھی
ذرا جل چکی تھی پہ کیا روشنی تھی

یہ دیکھی ہوئی ہے، نہیں ہے قیاسی
کہ ہے ختم خانم پہ زیبا لباسی
میں آنکھوں میں کچھ رنگ بھرتا تھا ان سے
کہ موسم کا اندازہ کرتا تھا ان سے

یہ "عرشے" (۳۸) ہیں مدت سے گو فرش پر ہیں
مگر فن کی پوچھو تو یہ عرش پر ہیں
یہ جب بولتی ہیں تو دل ڈولتا ہے
کہ آواز میں لکھنؤ بولتا ہے
اگر بات میں کچھ گلے کو گھمادیں
تو ہر لفظ میں پھول پتی لگادیں
وہ رستے میں ہوں تو نکل جایئے گا
دبے پاؤں چپکے سے ٹل جایئے گا
بگڑ جائیں گی یہ تو رگڑا کریں گی
ابھی مفت کا ایک جھگڑا کریں گی
یہ ہیں میرے ہم نام اور مجھ سے بہتر
انہیں میں سمجھتا ہوں اپنا برادر
ستم ہے کہ مجھ سے یہ مشہور تر ہیں
مرے واسطے مستقل درد سر ہیں
کسی سے اگر ربط اپنا بڑھاؤں
کبھی انکساراً تعارف کراؤں
تو کہتا ہے میں آپ کو جانتا ہوں

"ہیں ایس ایم سلیم آپ پہچانتا ہوں"
کہیں لوگ بیوی سے میری یہ اکثر
ملے آپ کو ہیں بڑے اونچے شوہر
کہ شاعر ہیں، نقاد ہیں، رائٹر ہیں
اور اس کے سوا اک بڑے ایکٹر ہیں
دھرا کچھ نہیں ہے اگر شاعری میں
کما کھاتے ہوں گے مگر ایکٹری میں
کبھی پورے سو ہیں کبھی ہیں یہ زیرو
"جہانِ صدا" کے یہ اکلوتے ہیرو

یہ صاحب (۳۹) کہ جو سامنے آرہے ہیں
بلاوجہ نروس ہیں شرما رہے ہیں
یہ ماجد کے بعد اپنے فن میں ہیں اول
فضائے صدا پر جو چھائے وہ بادل
گراں فن میں ہیں ویسے سستے بہت ہیں
گرجتے تو کم ہیں، برستے بہت ہیں
بہت کم کسی سے خفا دیکھئے گا
مگر بات یہ ہے ذرا دیکھئے گا
سنا ہے کبھی اک پری پر مرے ہیں
پری اڑ گئی، بھوت یہ بن گئے ہیں
ملائی گئی، رس یہ ٹپکا رہے ہیں
گزر اب جلیبی پہ فرما رہے ہیں

وہ دیکھو جو اک دبلے پتلے جواں ہیں
سبھی جانتے ہیں کہ یہ پھرتے خاں (۴۰) ہیں
یہ یاروں سے اپنے بہت بڑھ گئے ہیں
کہ شہرت کے اب بانس پر چڑھ گئے ہیں
چلے ریڈیو سے تو فلموں میں پہنچے
ڈرامے بھی چمکائے ٹیلی وژن کے
یہ اسٹیج پر مرکز ہر نظر ہیں
غرض ہر طرح سے بڑے ایکٹر ہیں
بڑے ہیں یہ چھوٹے و بچلے نہیں ہیں
مرے دستِ شفقت سے نکلے نہیں ہیں

اور ان کو ذرا دیکھئے یہ ظفر (۴۱) ہیں
بڑے ہیں پہ اندر سے کچھ مختصر ہیں
اسی واسطے مجھ کو کہتے ہیں بھائی
کہ ہے دل میں ان کے ہر اک کی سمائی
طبیعت میں ہے انکسار ایسا پایا
بڑا بول ان کی زباں پر نہ آیا
میں اکثر انہیں کہتا ہوں بھائی موٹے
بڑے فن میں اور عمر میں مجھ سے چھوٹے
اب ان سے بھی ملئے یہ ہیں منی باجی
یہ اپنی جگہ مسئلہ ہیں سماجی

ابھی عمر کیا ہے کہ ٹھنی ہیں کچی
مری عمر کی ہیں مگر ننھی بچی
نہ بیٹھا سمجھئے انہیں یہ کھڑی ہیں
یہ ہیں قد میں چھوٹی پہ فن میں بڑی ہیں

کبھی آپ چکر میں میرے پھنسے تھے
مرے ایک ڈرامے میں بنیئے بنے تھے
تو یوسف زئی ہیں نسب میں ہیں اعلیٰ
مگر میں نے ان کو بنایا ہے لالہ (۴۲)
اسی نام سے آج مشہور ہیں یہ
مگر یار صادق بدستور ہیں یہ

مرے اک پرانے رفیق آپ ہی ہیں
شفیق آپ ہی ہیں خلیق (۴۳) آپ ہی ہیں
کہ مے ہیں سبو سے یہ نکلے نہیں ہیں
ابھی لکھنؤ سے یہ نکلے نہیں ہیں
مگر مے کی تلخی بھی ہے ان میں بو بھی
لگاتی ہے اک آگ سی گفتگو بھی
یہاں تک اذیت میں یہ لطف اٹھائیں
کہ خود اپنے "دستخط" میں بچھو بنائیں
دل و جان کو دوست پر وارتے ہیں
سبب ہو نہ ہو ڈنک یہ مارتے ہیں

کسی کا وہ کب جان کر دکھ اٹھائیں

مگر ہیں پیاز آنکھ میں، آنسو لائیں

اگر دوستی ان سے چاہو نبھانی

تو نسخہ بتاتا ہوں اے یار جانی

اسے باندھ لو اور دل میں جمالو!

علاج ان کا یہ ہے کہ سرکے میں ڈالو

انہیں دیکھئے آپ "اف" ہیں نہ "بٹ"(۴۴) ہیں

بہت سیدھے فقرے کی مانند "بٹ" ہیں

ہر اک چیز میں ان کو نمبر ملے سو

کبھی نام تھا ان کا سٹوڈیو نو

مجھے دیوتا کہہ کے رتبہ بڑھاتے

مگر ساتھ میں اس کے جھوٹا لگاتے

کبھی کہتے دشمن مجھے "پے" گئے ہیں

اکڑتے بہت تھے کہ اب ڈھے گئے ہیں

بہت پی پی آئے یہاں پھول چننے

یہ سب بٹ کے ہیں جانشیں ننھے منے

مرے دل میں ہیں گو بہت دور ہیں وہ

کہ گو شمس ہیں آنکھ کا نور ہیں وہ

حمیدؔ زماں یار میرے ہیں کامل

یہ عالم میں عالم ہیں جاہل میں جاہل

سمجھ میں نہ آنا ہی معیار ہے گر

تو ہیں پینٹنگ میں پکاسو کے ہمسر
کبھی شاعری کی بھی ہے ٹانگ توڑی
کوئی بات دنیائے فن کی نہ چھوڑی
کوئی یہ نہ پوچھے کہ "وچکاک" ہیں یہ
جو فلم آئے گی اس کے ہچکاک ہیں یہ
بظاہر جو دیکھو بڑے معتبر ہیں
پہ یہ دور امن و اماں میں "غدر" ہیں
یہ خوشبوئے صدق و صفا میں بسے ہیں
کمر دوستوں سے وفا پر کسے ہیں
بہت دوست دیکھے پہ ایسے کہاں ہیں
حمید زماں تو حمید زماں ہیں
گئی عمر میں بیسیوں لونڈے پالے
بڑے دکھ سمیٹے بڑے غم سنبھالے
مگر کھل گیا مجھ پہ یہ باری باری
کہ ڈھیلے کی سن سن ہے لونڈے کی یاری
مگر ایک دل مجھ کو ایسا ملا ہے
کہ انساں کے ہر روپ پر جو فدا ہے
نہیں شرط ہو کوئی ادنیٰ کہ اعلیٰ
سفیدا کہ کبرا کہ بھورا کہ کالا
نجس ہو کہ عاقل ہو عالم کہ جاہل
گٹر ہو کہ موری سمندر کہ ساحل
کھلے باغ میں شاخ طوبیٰ پہ جھولے

کہ میرے محلے کے گھورے پہ پھولے
کہیں ہو وہ انساں برا ہو بھلا ہو
سموچا ہو آدھا ہو یا دُم گلا ہو
میں اپنے کلیجے سے اس کو لگاؤں
ہنسے جاؤں گو زخم کتنے ہی کھاؤں
یہ راہ کرم[(۴۵)] ہیں مگر پھیر کی ہیں
یہ شبنم ہیں لیکن ذرا دیر کی ہیں
ملیں گے تو دل میں اتر آئیں گے یہ
ابھی دیکھئے پُھر سے اڑ جائیں گے یہ
بڑے آدمی ہیں انہیں کیا کہوں میں
یہی مصلحت ہے کہ اب چپ رہوں میں

مرے یار سب جانتے ہیں یہ قصہ
کہ بچپن میں اک ناگ نے ڈس لیا تھا
مگر یہ کراچی میں قسمت نے سانٹھا
یہاں آ کے دوبارہ کالے نے کاٹا
ادھر سے نہ گزرو کہ للکارتا ہے
یہ کالا کہ زہری ہے پھن مارتا ہے
ریاض[(۴۶)] اپنے زہری علی گڑھ کے پاپی
یہ آئیں تو مچ جائے اک آپا دھاپی
یہ آئیں تو افسر سے افسر لڑادیں
کہ آپس میں بھائی برادر لڑادیں

اگرچہ کبھی نرم چارا نہ کھائیں
جسے مار لیں پھر دوبارا نہ کھائیں
ہر اک روز رشتہ نیا جوڑتے ہیں
یہ انساں کو چکھتے ہیں اور چھوڑتے ہیں
اگر کھیل میں کوئی مہرہ بڑھادیں
تو افضل(۴۷) بچارے کو سولی چڑھادیں
اگر کچھ نمونہ یہ اپنا دکھادیں
حمید زماں کی بھی قرقی کرادیں
مگر میرے عاشق ہیں، مرتے ہیں مجھ پر
بڑا ایک احسان کرتے ہیں مجھ پر
کہ کرتے ہیں حملہ ذرا کن لگاکر
میں بگڑوں تو رہ جاتے ہیں پھنپھناکر

یہ اصلی بھی شاعر(۴۸) ہیں اور نام کے بھی
پہ حیرت کہ ہیں آدمی کام کے بھی
ترقی پسندی پہ منڈلا رہے تھے
یہ بنگال سے کوریا جارہے تھے
کہ رستے میں اک پھیر ایسا بھی آیا
کہ امریکیوں کا پڑا ان پہ سایا
بظاہر تو ہیں انقلابی جواں سے
پہ پیسہ وصولا ہے ایوب خاں سے
نظریوں میں ہے میری ان کی لڑائی

یہ ان کو سمجھتا ہوں سوتیلا بھائی
یہ گانے بھی لکھیں فسانے بھی لکھیں
ڈرامے بھی لکھیں ترانے بھی لکھیں
ٹھکانہ نہیں ہے کوئی آدمی کا
یہ خود ایک کردار ہیں زندگی کا
بہرحال شہرت کے جنگلے میں پہونچے
سڑک سے چلے اور بنگلے میں پہونچے
لگائی تھی شاید یہ حضرت نے بازی
سو پیشہ ہے اب آپ کا فلم سازی

زبیریؔ (۴۹) کہ ہیں ہم وطن مصحفی کے
یہ ہم زاد ہیں شاہدِ دہلوی کے
کہاں تمکنت شاہد دہلوی کی
کہاں ان کے ہاتھوں یہ گت مولوی کی
کہ جب اپنے امروہہ پن پر یہ آئیں
تو شاہد کو بھی چھپّھٹی پر بٹھائیں
عروضی یہ ایسے کہ جو مجھ سے بولے
غزل پر مری گر لبِ طنز کھولے
تو بولوں نہ چالوں نہ کچھ میں خبر دوں
حوالے اسے شمس بھائی کے کردوں
کہ بس لیجئے ان سے کرلیجئے چن من
کہ اپنے تو بس یہ ہیں فعلن فعولن

یہ شاعر ہیں اور صاحبِ ذوق ہیں یہ
اب ان سے بھی ملئے مرے شوق[50] ہیں یہ
انہیں میں سمجھتا ہوں مدنی کا سایا
کہ حضرت نے تھوڑا سا رنگ ان کا پایا
سبب ہو نہ ہو کچھ نہ کچھ سرگراں سے
زمانے سے رہتے ہیں کچھ بدگماں سے
کہیں سے اگر کنکری بھی یہ کھائیں
تو نام ان کو یاروں کے سب یاد آئیں
یہاں تک ہیں شکی کہ خود جانتے ہیں
یہ تعریف کا بھی بُرا مانتے ہیں
بہت خون میرا کبھی پی چکے ہیں
مگر تھوڑے دن دودھ بھی پی چکے ہیں
محبت کے گو ان کے قاضی بہت ہیں
رضی ہیں مرے دل سے راضی بہت ہیں
جو فن ان کا ہے اس میں کیا طاق ہیں یہ
انہیں دیکھئے "صوتی رزاق[51]" ہیں یہ
ڈرامے میں آتی ہیں کتنی صدائیں
وہ طوفاں وہ جھکڑ وہ چلتی ہوائیں
وہ آیا کوئی اس نے وہ کھڑکی کھولی
ابھی کتا بھونکا ابھی بلی بولی
وہ انجن کی سیٹی وہ موٹر کا چلنا
ذرا سے اشارے پہ منظر بدلنا

یہ سارے مناظر دکھاتے یہی ہیں
کہ طوفان سارے اٹھاتے یہی ہیں

اور ان کے سوا اور بھی یار میرے
بنام محبت خریدار میرے
سعید (۵۲) اور کلیم (۵۳) اور زماں (۵۴) اور یارو (۵۵)
انعام (۵۶) اپنے پیارے کہ انعام داور
مرے بدر عالم (۵۷) شجیع (۵۸) اور نجمی (۵۹)
کہ جن سے محبت کی ہے قسما قسمی
خدا سے دعا ہے انہیں شاد رکھے
جہاں ان چراغوں سے آباد رکھے

یہاں آیئے ان ستاروں سے ملئے
رفیقانِ دیرینہ، یاروں سے ملئے
یہ رحمان (۶۰) ہیں اور مخدوم (۶۱) ہیں وہ
یہ شیطان ہیں اور معصوم ہیں وہ
یہ لڑنے میں وہ صلح کرنے میں حاتم
یہ کرنے میں اور وہ ہیں بھرنے میں حاتم
بلائیں جو ان کی ہوں وہ سب سمیٹیں
یہ ایسے کہ ان کے غموں کو لپیٹیں
مجھے ان سے ملنے میں راحت بہت ہے
انہیں بھی خدا رکھے الفت بہت ہے

یہاں آکے یارانِ آخر سے ملئے
فضل[۶۲] اور سعید[۶۳] اور مدثر[۶۴] سے ملئے
یہاں مصطفیٰ[۶۵] جیسے انساں کو دیکھا
شرافت کے کیسے گلستاں کو دیکھا
شرافت اسیرِ ریاست نہیں ہے
یہ جاگیر اہلِ سیاست نہیں ہے
نہ کرسی سے آئے نہ مسند سے آئے
لہو میں اگر ہو تو جلوہ دکھائے

حواشی

(ہم لوگ، اسٹوڈیو نمبر ۹)

(۱)ذوالفقار علی بخاری (۲) حفیظ ہوشیارپوری (۳)اشنین قطب (اسٹیشن ڈائریکٹر)(۴) نہال عبداللہ (۵) شاہداحمد دہلوی (۶) چراغ حسن حسرت (۷) ایس ایم سلیم (۸) ایس ایم طاہر (اسٹیشن ڈائریکٹر) (۹) غلام قادر فرید (اسٹیشن ڈائریکٹر) (۱۰) اشنین قطب (اسٹیشن ڈائریکٹر) (۱۱) انصار ناصری (۱۲) حفیظ ہوشیارپوری (۱۳) چوہدری محمد اقبال (۱۴) حمید نسیم (۱۵) ظفر حسین (۱۶) طاہر شاہ (۹ تا ۱۶، یہ سب حضرات کراچی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں) (۱۷) انصار ناصری (۱۸) حفیظ ہوشیارپوری (۱۹) چراغ حسن حسرت (۲۰) عزیز حامد مدنی (۲۱) ارشد تھانوی (۲۲) شوکت تھانوی (۲۳) حمید نسیم (۲۴) ضیاء جالندھری (۲۵) شاہداحمد

دہلوی (۲۶) عمر مہاجر (۲۷) ارم لکھنوی (۲۸) تابش دہلوی (۲۹) شمس زبیری (۳۰) احمد عبدالقیوم، قیوم عارف (ڈرامہ پروڈیوسر) (۳۱) عبدالرحمٰن کابلی (۳۲) مغل بشر (۳۳) ظفر صدیقی (۳۴) رفعت قدیر ندوی (۳۵) امیر خاں (۳۶) عبدالماجد (۳۷) فاطمہ خانم (۳۸) عرش منیر (۳۹) رفعت قدیر ندوی (۴۰) محمود علی (۴۱) ظفر صدیقی (۴۲) لالہ نصیر (۴۳) ایس ایم خلیق (۴۴) شمس الدین بٹ (اسٹیشن ڈائریکٹر) (۴۵) آغا ناصر (۴۶) ریاض فرشوری (۴۷) افضل صدیقی (۴۸) حمایت علی شاعر (۴۹) شمس زبیری (۵۰) رضی اختر شوق (۵۱) ایم اے رزاق (۵۲) سعید (۵۳) کلیم (۵۴) ایم زماں (۵۵) یاور مہدی (۵۶) انعام صدیقی (۵۷) بدر عالم (۵۸) عبدالرب شجیع (۵۹) نجم الحسنین (۶۰) رحمان (۶۱) مخدوم (خوشنویس) (۶۲) فضل (۶۳) سعید (۶۴) مدثر (۶۵) مصطفیٰ (یہ حضرات ریڈیو پاکستان میں چپڑاسی تھے)

صنم کدہ پروڈکشنز

اب سے پندرہ برس پہلے کی بات ہے
مرے پاس اک دن خلیق[1] آئے
اور ایک صاحب کو ہمراہ لائے
کہا۔۔۔"آپ ہیں اک رسالے کے مالک
جواب تک بہت سے مدیروں کا بھرتا بنا کر
"ہضم" کر چکا ہے!
مگر اب کسی اور چٹنی کے طالب ہیں
سو میں چاہتا ہوں
کہ یہ اک تتیّا مرچ کا مزا بھی چکھیں
اس لیے آپ کے پاس لے آیا ہوں"
وہ صاحب مجھے یوں لگے
جیسے اک تازہ شلجم کے مونچھیں لگی ہوں
میں نے کہا۔۔۔"مرچ مہنگی ہے

کیادام ہوں گے ؟"

"دام منہ مانگے لیکن مزا چاہیے!"

"ٹھیک ہے ورنہ پھر دام واپس"

لیجئے بیٹھے بیٹھے انہوں نے مرے دام آنکے

بیعانہ دیا اور بک کر لیا!

یہ میرے "ٹکی"

آپ تو جانتے ہیں

وہ رسوائے آفاق، بدنام عالم، فراڈِ زمانہ

نذیرِ الہٰ آبادی ہیں

جنہیں آپ اب "صوفی" کے نام سے جانتے ہیں

مجھے ان کے دفتر میں ہفتہ گزرنا بھی مشکل ہوا

کیونکہ اس ایک ہفتے میں

کیا جانے کتنے، کہاں سے کدھر سے۔۔۔

مرے اتنے ہمدرد پیدا ہوئے

کہ "یوسف" کے بھائی بھی اتنے نہ ہوں گے!

وہ کہتے۔۔۔ کہاں پھنس گئے ہو!

بڑا چلتا پرزہ ہے یہ شخص۔۔۔

پیسے نہ دے گا

کسی طرح سے اس سے پیچھا چھڑاؤ

یہ بہتر ہے تم کل سے دفتر نہ جاؤ

تمہیں کچھ خبر ہے؟ یہ ممتاز[۲] کو کس چکا ہے

اور ان سے بھی پہلے کئی اور لوگوں کو بھی ڈس چکا ہے

مگرمچھ کو ڈسنے ڈسانے میں کچھ لطف آتا ہے

سو میں نے کہا "دیکھئے، دیکھئے!

میں بھی ناگوں کے منتر جگانے کے ماہر قبیلوں کا

----ہمدلیس ہوں!

دیکھئے!"

سو کچھ دن میں ایسا ہوا

کہ میں اور ناگ

ایک ہی پیالے میں دودھ پینے لگے!

یہ صاحب کہ بھائی بھی ہیں دوست بھی ہیں

بڑے نادہندوں کے افسر ہیں

لیکن مرا "بینک" ہیں

کہ جب چاہوں چوبیس گھنٹے "کھلا لوں"

میں کہتا ہوں ان سے

"چلے تم تو تھے چار سو بیس بننے

فراڈوں کا ایک ماسٹر پیس بننے

مگر جانے کیوں آدمی بن گئے ہو

پھٹے دودھ تھے اور دہی بن گئے ہو"

مگرمچھ پر اک ظلم صوفی نے ایسا کیا ہے

کہ جب تک جیوں گا اسے کوستا ہی رہوں گا

یہ شخص اک جنونی ہے----

یہ سوچ لیتا ہے پھر اس سے ٹلتا نہیں ہے

تو اک روز حضرت نے اسٹنٹ مارا

کہ میں فلم سازی کروں گا

''بجا ہے! چلیں آپ یہ جھک بھی ماریں''

''نہیں جھک تو دونوں ہی ماریں گے پیارے''

''میں بھی''

''ہاں''

''میں کیا کروں گا؟''

''کہانی لکھو گے''

''کیا۔۔۔؟ کہانی! کون لکھے گا۔۔۔؟''

میں لکھوں گا؟

کہانی تو کیا میں کہانی کی دم سے بھی واقف نہیں ہوں!''

''تو کیا فکر، میں دم سے دم باندھ دوں گا''

نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ دن کے بعد

میں سچ مچ کہانی کی دم میں بندھا تھا

یہ دم اتنی پھیلی کہ دس سال میں

تیس فلموں کی ناکامیاں بن گئی

مگر یہ الگ سلسلہ ہے

ابھی تو میں فلمی کہانی نویسی کے آزار میں مبتلا ہوں

مرے سامنے ایک کالے سے کھترے سے

ایک پیکداں قسم کے آدمی بیٹھے ہیں

''چلیں! پہلے ''کٹ'' اور ''ڈزالو'' آپ سیکھیں''

کہانی شروع ہو تو ''فیڈان'' کریں گے

مگر ''کٹ'' ۔۔۔(آپ نے پیک تھوکی)

ہم اس وقت "انسان" کا اسکرپٹ لکھ رہے تھے

مرے یار کو فلم سازی بھی سوجھی

تو آغاز انسان سے کر دیا

جو ویسے ہی ناکام سا تجربہ ہے

جس کو اقبالؔ نے نقش باطل لکھا ہے

اور اس سے پہلے بہت لوگ اسے

خالق کل کی دلچسپ مسٹیک کہہ کر

رد و مسترد کر چکے ہیں

یہ انسان جو دیوتا اور کیڑے کی

دو انتہاؤں میں

اک مضحکہ خیز مخلوق ہے!

مگر "کٹ"۔۔۔۔

مجھے "کٹ" "ڈزالو" اور "فیڈ آؤٹ"

سکھانے کے استاد

یزدانی (۳) تھے

(خدا بخشے جو مر گئے)

مر گئے اور زندہ ہیں

کیونکہ جو دل میں زندہ ہو مرتا نہیں ہے

تیس پینتیس دن کام کرنے کے بعد

جب کہانی مکمل ہوئی

اور میں ڈائیلاگوں پہ بیٹھا

تو اک صبح دفتر پہنچ کر یہ دیکھا

کہ یزدانی غائب ہیں

"آؤ جیلانی صاحب سے تم کو ملاؤں"

"کون جیلانی صاحب؟"

"تم آؤ تو"

میں اندر گیا

تو دیکھا کہ کرسی پر

اک نرم، سادہ، مہذب

مگر کچھ "کجامی نمائی کجامی زنی" قسم کے آدمی بیٹھے ہیں

مجھے دیکھ کر اٹھ گئے

اور بہت گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا

جس کی تاثیر ہاتھوں سے دل تک گئی

یہ جیلانی صاحب ہمارے نئے

ڈائریکٹر تھے

کٹ، ڈزالو اور فیڈ آؤٹ

کی مشقیں دوبارا چلیں

غرض چھ مہینے میں چھ سات سوشیٹ کالے کیے

مگر گھوم پھر کر وہیں لوٹ آئے جہاں سے چلے تھے

یعنی "انسان" پر

تلوّن، تلوّن، تلوّن

یہ صوفی تلون کا پتلا ہے

اور اس کا ذہن

ایک دیوانی ہنڈیا ہے

جس میں بیک وقت

چھ سات دالیں ابلتی ہیں

اور کوئی پکتی نہیں ہے!

محمد حسن المنطقی سے

میں پہلے بھی واقف تھا

لیکن یہاں آ کے ہم دوست بھی ہو گئے

محمد حسن، صوفی کی دیگ کے

ایک ادھ کچرے چاول تھے

جس میں دو ایک کن رہ گئے ہوں

ہماری ذہانت کا اک ایسا جارح نمونہ ہیں

جو اک ایسے لونڈے میں ملتی ہے۔۔۔۔

جو چانٹے کے ڈر سے اکڑ جائے

اور پہلے خود مار بیٹھے

یہ فن کار ہیں، فلم "فنکار" میں پٹ چکے ہیں

مگر میرا بس ہو تو میں فلم سے توبہ کرا کے

انہیں کار دلوا دوں

جس میں ہم دونوں دو چار سو میل چلتے رہیں

بحث کرتے رہیں!

وہ کہتے ہیں "تلیر" تجھے کچھ خبر بھی ہے

میں وہ محمد حسنؔ ہوں

کہ جو جوشؔ کو اردو لکھنا سکھائے

اور تُو، تو ان جاہلوں میں ہے

جو کچھ سیکھنے کے بھی قابل نہیں ہیں

ان کا اردو سے مطلب

وہ "بولی" ہے

جو بے چارے کے گاؤں میں بولی جاتی ہے

محمد حسن منطقی! آپ بے شک ذہانت کی اک توپ ہیں

مگر اس میں قدرت نے بارود کو چھوڑ کر

باجرہ بھر دیا ہے!

مگر مجھ کو جیلانی صاحب سے ملنے کی ایسی خوشی تھی

کہ جیسے مجھے کوئی دولت ملی ہو

یہ عربی کے ماہر تھے

ایم اے تھے جغرافیہ میں

اور اقبالؔ کے اتنے عاشق

کہ بانگِ درا، بالِ جبریل، جاوید نامہ وغیرہ

انہیں حفظ تھا

خدا جانے کیسے تہجد ادا کرتے کرتے

ستاروں کی انگیا میں ٹانکے لگانے

وہ اس فلم میں آ گئے تھے

مگر فلمی دنیا میں جیلانی صاحب

"پھنساؤ" کے اسمِ گرامی سے مشہور تھے

بڑی بات یہ ہے کہ جب جال اپنا لگاتے

تو اکثر بڑی کامیابی سے ہاتھی پھنساتے

جسے مار کر گوشت اور کھال تو بیچ دیتے

مگر اس کے دانت اپنے منہ میں لگاتے

تو جیلانی صاحب نے ہاتھی پھنسایا
کہانی نویسی پہ مجھ کو بٹھایا
مگر ظلم جائز کیا
کہ اصلاح کرنے کے منصب پہ احسان بی اے کو فائز کیا
آپ کیا جانیں کس طرح بی اے ہوئے تھے
کہ اس سانحے کو ابھی تک یہ بھولے نہیں تھے
غلط تو نہیں، بر محل یاد آئی
انہیں دیکھ کر مجھ کو "گُل طویل" کی ضرب المثل یاد آئی
یہ ست منزلہ ایک بلڈنگ ہیں
جو دست بردِ زمانہ سے کچھ جا بجا جھڑ گئی ہے
یا وہ لوکی ہیں
جو دونوں کونوں پہ کچھ سڑ گئی ہے
پٹانے مجھے آئے تھے، پٹ گئے یہ
مجھے کاٹنے آئے تھے، کٹ گئے یہ
طواف محبت مرے گرد کر کے
بالآخر مجھے اپنا شاگرد کر کے
خود اپنی نظر کا نمونہ بنایا
انہوں نے مجھے فلم لکھنا سکھایا
بہت لوگ کم ہیں جنھیں مانتا ہوں
پہ احسان کو فلم ٹیکنیک میں اپنا استاد میں جانتا ہوں

یہ کڑوے کسیلے، بہت نک چڑھے، سخت خود دار ہیں
مگر احمقوں کی حماقت سے اس درجہ بیزار ہیں
کہ خود قدِ بالا پہ گویا سردار ہیں
خدا نے ظرافت کے کچھ شوخ رنگوں سے کردار کو آپ کے بھر دیا ہے
یہ کہتے ہیں اک فلم ہوں میں جسے دستِ قدرت نے ایڈٹ کیے بن ریلیز کر دیا ہے۔۔۔۔

انہیں دیکھئے آپ مرزائے ہاں ہوں
محبّ گرامی، جناب ہمایوں (۵)
جمالی (۶) نے حضرت سے مجھ کو ملایا
پڑا میرے سر پر ہما کا وہ سایا
گداؤں کو جو چترِ شاہی دلاوے
مقدر پہ اپنے گواہی دلاوے
سو اک فیضِ قسمت سے میں نے بھی پایا
کہ ایوارڈ حضرت نے مجھ کو دلایا
کوئی ان کو کہتا ہے نازِ مجسم!
کوئی ان کو کہتا ہے "مرزائے ہم ہم"
کوئی لطف لیتا ہے نایاب کہہ کے
کوئی طنز کرتا ہے نواب کہہ کے
مگر یہ نکل جاتے ہیں پھنس پھنسا کر
بلا ٹال دیتے ہیں کچھ ہنس ہنسا کر
تو پھر "راز" کے بعد چکر چلایا
کہ کچھ اپنے یاروں کا حلقہ بنایا

یہ حلقہ تھا اور اس کے مرکز تھے حامدؔ (۷)
یہ تیئیس برسوں کے اک مرد جامد
کہ ان کی جوانی میں ہے رنگ پیری
مگر مچھ تو ہیں یہ مگر "منگھو پیری"
صلا کوئی محنت کا پاتے نہیں ہیں
کہ منہ مارتے ہیں پہ کھاتے نہیں ہیں
خلوص و وفا کے یہ سچے ترازو
ہر اک حال میں ہیں مرے دست و بازو

بلا اک مرے ساتھ میرٹھ سے آئی
سعید (۸) آپ ہیں میرے منہ بولے بھائی
لقب ان کا "زنبی" ہے مشہور ہیں یہ
کہ میرٹھ میں جو تھے، بدستور ہیں یہ
مگر فلم لکھنے کا کیا ڈھب ملا ہے
کہ سرپیٹ لے جو انہیں دیکھتا ہے
یہ کہتے ہیں، ہیرو نے تو کچھ کہا ہے
جواب اس کا میں نے مگر لکھ لیا ہے
کٹی عمر لونڈے پڑھانے میں ساری
انہیں چوم لیجئے کہ پتھر ہیں بھاری
یہی دور تھا جب کہ ذاکر (۹) بھی آیا
یہاں میں نے مقبولؔ (۱۰) کو بھی بلایا
یہ مقبولؔ صاحب کہ چلتی رقم ہیں

بڑے خوش بیاں ہیں بڑے خوش قلم ہیں
قلم کا لٹھ ہیں، اس کو گھمادیں
تو رستم قلم کو ٹھکانے لگادیں
یہ فلمی ستاروں کے ناکام سوٹر
انہیں بھائی احسان کہتے تھے ہوٹر

یہ موٹا(11) کہ سنتے ہیں کچھ بن گیا ہے
بنا تو ذرا کم ہے پر تن گیا ہے
اگر دن میں ہوتے ہیں چوبیس گھنٹے
مرے پاس رہتا تھا بائیس گھنٹے
کہوں کیا یہ اس وقت بھولا تھا جتنا
میں گال اس کے کھینچوں تو شرمائے کتنا
مگر اب بڑی شے ہیں آتے نہیں ہیں
کبھی بھول کر منہ دکھاتے نہیں ہیں
خلیل(۱۲) آپ ہیں ان کو پہچان لیجئے
یہ اندر سے کیا ہیں انہیں جان لیجئے
یہ تھے ریڈیو پر، مرے یار تھے یہ
ہر اک حال میں میرے غم خوار تھے یہ
مگر چلتے چلتے کہیں مڑ گئے ہیں
مرح شاخ سے پھر سے یہ اڑ گئے ہیں
انہیں راس آئیں "خلیلی ادائیں"
اڑاتے ہیں میوزک میں بھی فاختائیں

تو صحبت ہے باقی کہ ہے یار زندہ
مگر ہیں یہ موسم کا وقتی پرندہ

یہ موٹے قمر (۱۳) بھی اسی دور کے ہیں
بڑے آم چھوٹے سے اک بور کے ہیں
مگر اب یہ ہیں میری نظروں میں کیری
سنا ہے کہ ہیں جان کے میری بیری
اگر اب بھی مل جائیں تو ان کو کھاؤں
قمر سے انہیں پھر میں ذرہ بناؤ
مرے پاس آئیں تو چھٹ جائیں گے یہ
غبارہ ہیں اک روز پھٹ جائیں گے یہ

یہ زہری نہیں ہیں نہ ہیں یہ زبیری
مرے دوست پیارے ہیں یہ این کے زیری
یہ جب پہلے پہلے مرے پاس آئے
لڑے مجھ سے اتنے کہ پستول لائے
بھریں گولیاں اور نشانہ لگایا
ادا کیا دکھائی کہ مجھ کو رجھایا
کہ اب دوست ہیں میرے اور اتنے پکے
کہ اکے ہیں یہ اور سب پنجے چھکے
انہیں دیکھئے آپ جاوید ہیں یہ
کھلے جو نہ دنیا پہ وہ بھید ہیں یہ

نکلتے ہیں گھر سے تو ہے قول ان کا

دکھاتے ہیں جلوہ دلِ مطمئن کا

بھلا غم کسی کا یہ کب پالتے ہیں

کہ آنکھوں میں دو دو سور ڈالتے ہیں

یہ فلمی جزیرے کے دیرینہ ٹاپو

زمانے میں مشہور ہیں آپ باپو

بڑا تجربہ ہے یہ کیا بن گئے ہیں

کہ خود اک بڑا تجربا بن گئے ہیں

بنائی تھی اک فلم بیداری جب سے

چلے آرہے ہیں یہ بیدار تب سے

کراچی میں "فلمی صنعت" کے ہراول

پرانے ہیں فلمی پلاؤ کے چاول

اب ان سے بھی ملئے کہ یہ ہیں ترنم

ترنّم، تبسّم، مجسّم تکلّم!

انہیں خان صاحب تو کہتے ہیں ٹمی

میں کہتا ہوں ان کو کراچی کی نمی

جواں ہیں، حسیں ہیں طرحدار ہیں یہ

بڑے اونچے درجے کی فنکار ہیں یہ

یہ احمد ہیں، چھوٹے نہیں ہیں بڑے ہیں

مرے دل میں بیٹھے نہیں ہیں کھڑے ہیں

عجب کھیل ان کے کہ ہاریں نہ جیتیں

بلائنڈ کے کھیلوں میں دن رات بیتیں
بڑی ان کی مشکل ہے کھاتے نہیں ہیں
بلائنڈ میں پتا اُٹھاتے نہیں ہیں
بنائی جو اک فلم تو چوٹ کر دی
بنا کر فقط بند ڈبوں میں بھر دی
انہیں دیکھئے آپ بھی یار جی ہیں
مرے دوست دیبو بھٹا چار جی ہیں
بہن تھی جو سوزی (۱۵) کی وہ اک ڈبورا (۱۶)
پلا کر گئی ہے انہیں غم کا شورا
سو میوزک میں اب شور کرتے بہت ہیں
بڑے ہیں مگر بور کرتے بہت ہیں

انہیں دیکھئے آپ ہیں شمس حنفی
یہ تصویر ہیں اک خلوصِ دلی کی
محبت سے یہ گوشت بھی، پوست بھی ہیں
کہ شاگرد بھی میرے اور دوست بھی ہیں
یہ فلمی سیاست میں ہیں مثل گاندھی
فضا پر جو چھا جائے اک ایسی آندھی
خدا ان کو رکھے سعیدِ ازل ہیں
کہ یہ فلم سازی میں میری غزل ہیں

یہ طارق عزیز آئے ہیں میرے گھر میں

اتر آیا ہے چاند میرے نگر میں
مگر چاند ایسا کہ گہنا گیا ہے
مجھے طوق اک غم کا پہنا گیا ہے
یہ تھے ایکٹر اور لیڈر بنے ہیں
سیاست کی کیچڑ میں اتنے پھنسے ہیں
کہ دھل کر بھی دھبے نہ جائیں گے اس کے
پلٹ آئیں گے ایک دن کونے گھس کے
سر قوم پر بوجھ اک دھر رہے ہیں
وہ اب بھی بری ایکٹنگ کر رہے ہیں

حواشی

(صنم کدہ پروڈکشنز)

(۱) خلیق احمد (اس وقت ریڈیو پاکستان کے اسسٹنٹ ڈائیریکٹر) (۲) ممتاز حسین (۳) فدا یزدانی (۴) مرتضٰی جیلانی (۵) ہمایوں مرزا (۶) طفیل احمد جمالی (۷) حامد خمار (۸) سعید احمد صدیقی مرحوم (۹) ذاکر حسین (۱۰) مقبول جلیس (۱۱) ابراہیم نفیس (۱۲) خلیل احمد میوزک ڈائریکٹر (۱۳) قمر زیدی (۱۴) فدا یزدانی (۱۵) سوزی ڈینئیل (فلمی اداکارہ) (۱۶) ڈیورا ڈینئیل (ریڈیو کی فنکارہ، سوزی کی بہن)

البم نمبر ۲

زمانہ اگرچہ بہت کج رہا تھا
مگر رفتہ رفتہ
کراچی کے صحرا میں میرا چمن سج رہا تھا
نئے پھول تھے اور نئی تھیں فضائیں
بہت ناز کرتی تھیں اٹھلا کے چلتی ہوائیں
مگر میری آنکھوں میں اب بھی نمی تھی
قرارِ محبت میسر نہیں تھا
اک ایسی کمی تھی
مگر اتفاقاً کسی صبح، شاخِ وفا پر گلِ تر کو پایا
خدا کا کرم ہی کہوں گا کہ مثلِ شمیم اپنے اطہر[1] کو پایا
سنا ہے کہ کچھ پھول ایسے بھی ہوتے ہیں باغ جہاں میں
جنہیں دیکھ کر آسماں پر دھنک پھولتی ہے
انہیں سونگھ لیجیے تو کھانے کی پینے کی سدھ بھولتی ہے

مرا تجربہ ہے کہ یہ پھول ہوتے تو ہیں پر بہت کم

کہ رہتے ہیں اکثر ہوائے زمانہ سے برہم

تو یار ونگار[۲] واسد[۳] کو بلاؤ

علیم[۴] اور جون ایلیا کو بھی بلاؤ

خلیل[۵] اعظمی شہریار اور ترقی پسندوں کے سالار

بنے میاں[۶] کو بھی تار دو

اور شہادت منگاؤ

اگر میں غلط ہوں تو مجھ کو بتاؤ

نہیں ہے اگر ایسا کردارِ اطہر

تو یہ سب بھی کیوں ہیں گرفتارِ اطہر

مگر اب کہاں ہے وہ جھوٹا کمینہ

جسے میں سمجھتا تھا سچا نگینہ

کوئی اس سے پوچھے کہ ساقی[۷] کے بچے

زمانے سے کیا اڑ گئے لوگ سچے

تجھے مجھ سے الفت کے دعوے تھے کیا کیا

زبانی محبت کے دعوے تھے کیا کیا

یہ ظالم کہاں جا کے تو بس گیا ہے

کہ دل تیری صورت کو ترسا ہوا ہے

تجھے مجھ کو یوں ہی اگر چھوڑنا تھا

تو کم بخت کیوں دل کا ٹکڑا بنا تھا

تجھے کچھ خبر بھی ہے اے میرے ساقی

کہ اب جام میں کچھ نہیں میرے باقی
ذرا سی کہیں تہہ میں تلچھٹ رہی ہے
کہوں کیا کہ تھوڑی سی ہے کٹ رہی ہے
کہاں تک زمانے کے غم کھاؤں گا میں
خبر کیا کہ کس روز بجھ جاؤں گا میں

مرے باغ میں اک گلِ ہاشمی (۸) ہیں
انہیں لوگ کہتے ہیں "دہر فستنی" ہیں
وہ فقرے کہ بارہ مسالے کی چاٹ
اور ان کا چٹاخہ
ہر اک بات پر چھوڑتے ہیں پٹاخہ
یہ ایسے کہ گر اپنی کرنی پہ آئیں
تو ممتاز (۹) کو بھی ظرافت سکھائیں
کبھی جوش میں جب لطیفہ سنایا
تو پیروں سے میرے مصافحہ ملایا
سعید (۱۰) ان کو ایک روز ہمراہ لائے
کہ جیسے کوئی عید کے دن کسی کو کھلونا دلائے
انہیں میری کیا جانے کیا بات بھائی
کہ فقرے لطیفے ہر ایک چیز بھولے
نہ ہوٹنگ ہی سوجھی
کہ میری پہیلی نہ بوجھی
غرض ہار جھک مار کر

رفتہ رفتہ مرے خانہ دل میں بیٹھک جمائی
مرے واسطے ایک مصیبت ہی آئی
مگر میں بھی جب اپنی کرنی پہ آیا
تو حضرت کو چپکے سے ٹھینگا دکھایا
کہ آخر بہن دے کے پیچھا چھڑایا

انہیں دیکھئے یہ مرے یار صادق
میں کشتی ہوں اور یہ ہوائے موافق
نظیر (11) ان کو کہہ کر تہی دل نہ رہئے
انہیں بے نظیر اور بے مثل کہئے
انہوں نے بھی میرا بہت دل جلایا
نظیری نظر کا تماشا دکھایا
مری شاعری کا تمسخر بنایا
یگانہ کا بھونڈا سا چربہ بتایا
کبھی فقرے بازی پہ شدت سے ٹوکا
کبھی پیار سے شعر کہنے سے روکا
کہوں کیا کہ مشہور نقاد ہیں یہ
اور اس پر ستم ہے کہ استاد ہیں یہ
نہ دوزخ سے ڈر کر نہ جنت کی خاطر
بہت غم اٹھائے ہیں شہرت کی خاطر
چلایا ہے اپنے خیالوں کا چکر
بڑی شاعری کے سوالوں کا چکر

کہ اک تو میں یاری پہ مرتا ہوں ان کی
قلم کی بھی تیزی سے ڈرتا ہوں ان کی
بگڑ جائیں تو کون ان کو سنبھالے
کوئی بوجھوں مارے، یہ ماریں حوالے
تو میں خون کے گھونٹ پیتا تھا، چپ تھا
کسی طرح مر مر کے جیتا تھا، چپ تھا
یہ دو چار خط لکھ کے چکر چلایا
کہ مجھ سادہ دل کو دوانہ بنایا
انہوں نے بھی میرے بڑے ناز اٹھائے
یہاں تک کہ حضرت کراچی میں آئے
کبھی دل گرفتہ اگر ہوں تو آئیں
اندھیرے میں گویا دیا سا جلائیں
محبت سے اتنا مرا دل بڑھائیں
مجھے عسکری سے ذرا کم بتائیں
قیامت ہے کیا حوصلے آپ کے ہیں
کہ جوتے پہن کر یہ دل میں گھسے ہیں
مجھے آپ سٹوڈیو میں ملے تھے
خدا جانے کیوں بے تکلف ہوئے تھے
تعلق کا اک سلسلہ یہ نکالا
کہ ہر چند میں نے انہیں سر سے ٹالا
مگر مجھ کو میری غزل جب سنائی
تو میں بھی تو ہوں آدمی میرے بھائی

میں کیا بے نیازی کا اظہار کرتا
کہاں تک میں ملنے سے انکار کرتا
سپر ڈال دی اور گھر میں بلایا
تو حضرت تو ثابت ہوئے ایک سایا
مرلیا پہ گاتے بجاتے ہوئے کچھ
نئی دھن میں اک گنگناتے ہوئے کچھ
نہ موٹر میں آئے نہ ٹھیلے میں آئے
بدل میرے دل کے میرے میں آئے
سمجھ میں نہ آیا سرا، جستجو کا
کہ چہرہ ہے پنکج (۱۳) کا یا آرزو (۱۴) کا
بہت سیدھے سادھے بہت بے خطا ہیں
یہ مسکین صورت جناب عطا ہیں
یہ فن کار تو ہیں مگر "شوقیوں" میں
پھنسے تھے کبھی جا کے یہ "ذوقیوں (۱۶)" میں
سنا ہے کہ لکھتے ہیں اچھے فسانے
مگر واہ رے میرے الٹے زمانے
وہ افسانہ بازی کا چکر چھڑایا
کہ بے چارے کو صرف شوہر بنایا
جناب ضیاؔ کے ثناخوان بہت تھے
مگر ان میں پھنسنے کے امکاں بہت تھے
تو آخر کو میں نے انہیں ان سے توڑا
کہ پر باندھ کر اپنے کابک میں چھوڑا

نہیں یہ نہ کہئے کہ اب یہ عطا ہیں
سراپا محبت سراپا وفا ہیں
بسے ہیں اسی واسطے چشمِ نم میں
بچارے سجے ہیں مرے میوزیم میں
یہ ہمدان کے ہیں، ہمہ داں (۱۷) نہیں ہیں
بڑا فخر یہ ہے مسلماں نہیں ہیں
بڑے سخت سر ہیں پکے اٹل ہیں
مگر شاخِ وہابیت کا یہ پھل ہیں
کہوں کیسے سنی مسلمان ہیں یہ
کھڑے ہیں دوراہے پہ حیران ہیں یہ
نہ تربوز ہیں یہ نہ ہیں یہ پپیتے
مگر پھر بھی ممتاز (۱۸) کے ہیں چہیتے
یہ احساس میں لاکھ ہوں اپنے صادق
کئی لوگ کہتے ہیں ان کو منافق
غلط چال کوئی یہ ایسی چلے ہیں
سمجھتے ہیں کچھ لوگ یہ دوغلے ہیں
مجھے تو یہ سچے، بہ نقشِ جلی ہیں
بظاہر تو کافر ہیں خفیہ ولی ہیں
ملی ہے محبت کو نرمی وہ سچی
ہیں شبنم میں بھیگی ہوئی مٹی کچی
سمجھئے نہ ہرگز نحیف آدمی ہیں
جھگڑتے نہیں ہیں، شریف آدمی ہیں

زمانے میں کیا انقلاب آ رہے ہیں
یہ جیسے چلے تھے چلے جا رہے ہیں
بہت ان سے بیزاریاں سی رہی ہیں
انہوں نے بھی کچھ ایسی باتیں کہی ہیں
یہ کیا کیجئے یہ ہیں پرانے براتی
بہر حال ہیں مرنے جینے کے ساتھی
مرے گھر میں دعوت ہو سودا یہ لائیں
میں بیمار ہوں تو دوائیں پلائیں
خلوص دلی سے یہاں تک یہ چاہیں
کہ تکلیف مجھ کو ہو اور یہ کراہیں
مخالف مرے روح کے جبر تک ہیں
یہ آخر کو ساتھی مرے، قبر تک ہیں
سلامت رہیں دوستی کے سفینے
کہاں دشمنی کے اب ایسے قرینے
یہ سستوں (۱۹) میں سستے گراں ہیں گراں میں
ملیں گے مگر بھائیوں کی دکاں میں
انہیں میں کھلاؤں چنے، مرچ، دھنیا
یہ ہاتھی تو بے شک ہیں لیکن مکھنیا
سمجھتے ہیں چھوٹے سے ایک جوش ہیں یہ
یہ سچ ہے کہ بے شک تن و توش ہیں یہ
غزل یا رباعی قطعہ ہو کہ دوہا
ہر اک کھیت میں آپ نے ہل چلایا

مگر کچھ نہ اگنے سے مایوس ہو کر
گئے ہیں یہ مکے مگر روس ہو کر
سمجھئے نہ ہرگز کہ یہ سو رہے ہیں
کہ اب فلم میں اروِیاں بو رہے ہیں
کبھی ان کو ہرگز نہ کہئے گا بودا
کہ ہیں صبر وضبط و تحمل کا تودا
کراچی میں پائے بہت دوست سچے
کئی تھے کہ جو دے گئے مجھ کو غچے
مگر ان کو دل سے عجب سلسلہ ہے
مجھے جیسے اک ربط صادق ملا ہے
وفا ان کی گیتا ہے خود اوم ہیں یہ
کہ ظاہر میں پتھر ہیں پر موم ہیں یہ
مرے دل پہ ظاہر ہے صہبا کی فطرت
محبت، محبت، محبت، محبت
خدا ان کو رکھے یہ سچے قلندر
رہے جام میں میرے صہبائے اختر

اب ان سے بھی ملئے یہ مجذوب اصلی
مری روح آوارہ کے جسم وصلی
سراپا محبت سراپا صداقت
سراپا خلوص اور سراپا شرافت
مگر دوستوں پر قیامت یہ ڈھائیں

اگر بھول کر صاف گوئی پہ آئیں
عموماً بہت مختصر بولتے ہیں
خصوصاً کفن پھاڑ کر بولتے ہیں
بگڑتے ہیں غصے میں جب احمقوں سے
الجھتا ہوں میں سابقوں لاحقوں سے
یہ ہر بات میں یوں بریکٹ لگائیں
کہ لڑکے بھی لنگڑی کسر بھول جائیں
کسر کو اگر ہم کریں حل تو ہائے
صفر کے سوا کوئی حاصل نہ آئے
مگر یہ صفر ایک کے پیش و پس ہے
اگر ایک مل جائے اس کو تو دس ہے
صفر میں صفر کو یہاں تک ملائیں
تعین کو بھی لاتعین بنائیں
عقیدت کے پکے مسلمان سچے
عمل کی جو پوچھو تو مجھ سے بھی کچے
کبھی جب جنونِ صداقت میں آئیں
تو مدنی[۲۰] کے اوپر بھی چھکے لگائیں
کبھی دردِ اسلام میں یوں کراہیں
کہ میں بھی بھروں ان کے ہمراہ آہیں
انہوں نے عجیب ایک چکر چلایا
سیاست کے پھڈے میں مجھ کو پھنسایا
مجھے جذب کا یہ کرشمہ دکھایا

کہ چپکے ہی چپکے مرا دل چرایا
ہر اک اشتراکی سے بیزار ہیں یہ
مگر روسیوں کے نمک خوار ہیں یہ
مرے خواب کی ہیں یہ تعبیر الٹی
بلاٹنگ پہ ہیں میری تحریر الٹی
بشارت سکون طبیعت کی لے کر
درست آئے گو دیر میں آئے قیصر [۲۱]

ضمیر [۲۲] آکے مجھ سے ملے میرے کافر
مگر ہیں گلِ تازۂ دورِ آخر
انہیں یوں اگایا ہے فطرت کی رت نے
کہ یہ جتنے اوپر ہیں نیچے ہیں اتنے
بڑے نابغہ ہیں، بڑے فلسفی ہیں
پڑھے تک نہ جائیں یہ اتنے خفی ہیں
انہیں فن اخفا بہت کام آیا
کہ اب ہائی جیکنگ کا انعام پایا
انہیں مانتے ہیں جو اہل نظر ہیں
یہ ننھے سے ہیں گو، مگر ہیڈ گر ہیں
کہوں کیا کہ ظاہر ہے جو بن کہے ہیں
میرے دل میں آنے سے ڈرتے رہے ہیں
یہ آئے تو جان چھیننے پہ اڑے ہیں
اسی ضد میں بیٹھے نہیں ہیں کھڑے ہیں

مگر میں تو کم بخت ذاکر [۲۳] کو بھولا

یہ گپی، نڈر، چنچنا، بے اصولا

کبھی کلفتیں دور جملوں سے اس کے

کبھی دل میں ناسور فقروں سے اس کے

یہ ایسا کہ جب اپنی شیخی پہ آئے

تو او نیل اور شا کو دھتا بتائے

کبھی ڈینگ مارے کہ صاحب نظر ہوں

کبھی دون کی لے کہ میں شیکسپیئر ہوں

اگرچہ بہت نک چڑھا چڑچڑا تھا

مگر مجتبیٰ کا یہ اصلی چڑا تھا

اسے میں نے جب جال میں اپنے پھانسا

بڑے زور سے دل کی چولوں میں دھانسا

سمجھتا تھا میں قبر تک ساتھ دے گا

یہ دنیا ہے کیا حشر تک ساتھ دے گا

مگر روح میں میری پنجے گڑا کر

مرے ہاتھ سے اڑ گیا پھڑ پھڑا کر

مجھے شوق میٹھے کا ہرچند کم ہے

کہ ڈرتا ہوں تہ میں کہیں اس کے سم ہے

منافق سے پرہیز کرتا بہت ہوں

کہ میٹھی چھری سے میں ڈرتا بہت ہوں

مجھے دشمنی سے بہت کم ضرر ہے

محبت کا حربہ مگر بے سپر ہے
مگر مجھ کو عارف (۲۴) نے اپنا بنایا
کہ میٹھا د کھایا تو میٹھا کھلایا
کہاں تک مری روح انکار کرتی
مجھے ہیں یہ شیرے میں ڈوبی امرتی
ملی ان کو نرمی ہے بادِ صبا کی
ہیں سچی کسوٹی خلوص و وفا کی
بنے بیٹھے ہیں آپ ہر فلسفی کو
پڑھائیں یہ ویدانت مسٹر تقی کو
زمانے کی نظروں میں گو محترم ہیں
مگر میرے چھوٹوں کے چھوٹوں سے کم ہیں
یہی ہے سعادت کی ان میں بڑائی
بڑی ہے شرافت کی ان میں بڑائی
یہ چہرہ مری آنکھ میں کھب گیا ہے
کہ آنکھوں میں ان کی عجب اک حیا ہے

زمانے کا الزام مجھ پر ہے ظاہر
کہ میں ہوں خلوص و محبت کا تاجر
چمت کاریوں کا وہ استاد ہوں میں
کہ سب ہیں چڑے اور صیاد ہوں میں
بڑے ہوں کہ چھوٹے منجھولے کہ بچلے
مرے بھٹ میں آئے تو باہر نہ نکلے

خدا جانے کیسے پولس سے بچا ہوں
شکاگو کے گینگسٹروں کا چچا ہوں
وہ ہتھکنڈے میرے کہ بچ کر نہ جائیں
ادب کی فضا میں جو ٹیلنٹ آئیں
انہیں سے ہے قائم مری ٹھیکیداری
میں معصوم ذہنوں کا ظالم شکاری
بڑا زعم ہے مجھ کو میں مستند ہوں
سند بانٹتا ہوں کہ خود بے سند ہوں
کسی کو گھٹاؤں کسی کو بڑھاؤں
غرض ہر طرف اپنے مہرے جماؤں
میں ایسا کہ جب اپنی ڈوری ہلاؤں
کسی کو تو کیا عسکری کو نچاؤں

حواشی

(ہم لوگ، البم نمبر ۲)

(۱) اطہر نفیس (۲) نگار صہبائی (۳) اسد محمد خاں (۴) عبید اللہ علیم (۵) خلیل الرحمٰن اعظمی (۶) سید سجاد ظہیر (۷) ساقی فاروقی (۸) عزیز ہاشمی (۹) ممتاز حسین (۱۰) سعید احمد صدیقی (۱۱) نظیر صدیقی (۱۲) نگار صہبائی (۱۳) پنکج ملک (۱۴) آرزو لکھنوی (۱۵) عطا صدیقی (۱۶) حلقہ ارباب ذوق (۱۷) احمد ہمدانی (۱۸) ممتاز حسین (۱۹) صہبا اختر (۲۰) عزیز حامد مدنی (۲۱) قیصر حسنی (۲۲) ضمیر علی بدایونی (۲۳) ذاکر حسین (۲۴) افتخار عارف۔

فصل دوم

کافی ہاؤس

(الف)

مقام: کافی ہاؤس

وقت: شام

کردار: عبید اللہ علیم، جمال پانی پتی، ضمیر علی بدایونی، مظفر علی سید، سالک، قمر جمیل اور رئیس فروغ

(علیم کچھ لکھ رہا ہے۔ جمال بے خیالی میں ٹانگیں ہلا رہا ہے، دونوں چائے پی رہے ہیں اور ایک دوسرے سے بور ہیں۔ سالک آتا ہے)

سالک: معذرت خواہ ہوں

مرا نام سالک ہے!

میں......(علیم اسے دیکھتا ہے)

علیم: جی ہاں! آپ جو کچھ کہیں گے

وہ معلوم ہے...... بیٹھیے!

سالک: مجھے شاعروں اور ادیبوں سے ملنے کا کچھ شوق سا ہے......

علیم: ارے چھوڑیئے! اور کچھ کام کیجئے (علیم پھر لکھنے لگتا ہے)

جمال: آپ کچھ لکھتے ہیں؟

سالک: جی ہاں

جمال: شاعری؟

سالک: جی نہیں۔ میں نے کچھ الٹے سیدھے سے افسانے لکھے ہیں اور ان کی خاطر...... (جھجکتے ہوئے) معذرت خواہ ہوں...... باپ سے لڑ کے گھر سے نکل آیا ہوں اور اب آپ کے شہر میں دربدر پھر رہا ہوں۔

جمال: آپ کے باپ کیا کرتے ہیں؟

سالک: تاجر ہیں

جو چاہتے ہیں کہ میں ان کی مانند تاجر بنوں
کہ ہر باپ کا اولیں مسئلہ "آئینہ" ہے
جس میں وہ اپنے ہی عکس کو دیکھنا چاہتا ہے
پر مجھے لکھنے پڑھنے کا اک خبط سا ہے
سو میں چاہتا ہوں...... معلم بنوں!
تا کہ لکھ پڑھ سکوں۔ یہی ایک پیشہ ہے جو لکھنے پڑھنے میں حارج نہیں۔

علیم: انہیں کچھ کراچی کے استاد دکھلایئے!

جمال: یہ خود دیکھ لیں گے

سالک: میں سمجھا نہیں؟

علیم: سمجھ جایئے گا، ابھی جلدی کیا ہے؟

سالک: معذرت خواہ ہوں

نہ جانے مرا کومپلکس ہے
کہ کچھ اور ہے
مجھے آپ لوگوں کی باتوں میں اک طنز محسوس ہوتا ہے
جس کے رخ کو سمجھنا بھی دشوار ہے

جمال: نہیں...... آپ الجھن میں بالکل نہ پڑیئے
ہماری ہر اک بات کا رخ ہماری طرف ہے
کہ ہم سب کبھی آپ کی طرح گھر چھوڑ کر
وادیٔ شعر میں آئے تھے!
کوچۂ زلف کے پھیر میں آئے تھے
مگر اب غریب الوطن رفتہ رفتہ
خزاں کے پرندوں کے مانند
گھر لوٹتے ہیں
کہ گھر پھر بھی گھر ہے!

(قمر جمیل، ضمیر علی اور رئیس فروغ داخل ہوتے ہیں)

جمال: آیئے! خوب آئے

قمر: نہیں تو......

فروغ: (مسکرا کر) پریشان ہیں

علیم: نوکری سے؟

ضمیر: نہیں وقت پر حاضری سے

علیم: نوکری حاضری ہی کو کہتے ہیں

ضمیر: مگر یہ نہیں مانتے!

جمال: یا نہیں جانتے؟

قمر: جی نہیں! جانتا ہوں

جمال: یقیناً...... وہ کیا چیز ہے
کون سی شے ہے جو تم نہیں جانتے

علیم: یہ سب جانتے ہیں
مگر گھنٹوں تقریر کرنے کے باوصف
گاڑی جہاں ہے
وہاں سے کھسکتی نہیں ہے
بیرا چائے......
قمر بھائی یہ مسئلہ سخت ہے
میں خود بھی اسی مسئلے میں گرفتار ہوں
کہ انسان شاعر بنے؟
یا کہ نوکر بنے!

جمال: یا کہ شوہر بنے!

قمر: فروغ آپ بتلایئے
آپ یہ سب ہیں

فروغ: آپ بھی سب ہیں!

علیم: ہم یہ سب ہیں
مگر مسئلے میں گرفتار ہیں
جسے آپ حل کر چکے ہیں!

فروغ: اگر میرا چپ رہنا "حل" ہے
تو چپ رہیے
خود حل نکل آئے گا

مگر میں تو وہ ہوں

کہ جس نے کہا تھا

کہ ہے عشق کارِ مسلسل

وہ کارِ مسلسل

کہ جس سے کبھی ایک لمحہ پس انداز کر لینا ممکن نہیں ہے

یہاں یا تو سب ہے!

اگر سب نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے!

قمر: خزاںؔ بھی یہی کہتے ہیں

"شاعری زندگی بھر کا آزار ہے

ایک کل وقتی بیگار ہے

جس کو "جزوقتیِ شوق" سے ٹال دینا

فقط لمحہ مرگ آثار ہے!"

سو وہ شعر سے جا چکے ہیں......

(مظفر علی سید ایک کتاب بغل میں دبائے داخل ہوتے ہیں اور ادھر اُدھر دیکھتے ہیں)

جمال: وہ سید چلے آ رہے ہیں!

قمر: خدا ان کی بقراطیت سے بچائے

علیم: آیئے آیئے

آپ کب آئے؟

سید: آج ہی آیا ہوں......

ان کی تعریف؟

علیم: یہ سالک ہیں

نو واردِ شہرِ شعر و ادب ہیں

خود اپنے لیے ایک آزارِ جاں کا سبب ہیں
ہماری طرح باپ سے لڑ کے گھر چھوڑ بیٹھے ہیں
اور طالب داد ہیں!
مختصر یہ کہ اک صبحِ فردا کی فریاد ہیں!

سید: تم نے تو نظم کہہ دی!

علیم: نظم اب کہاں؟
آپ کیوں بھولتے ہیں
کہ میں نے بھی اب شادی کر لی ہے
اور شاعری چھوڑ کر شوہری کر رہا ہوں!

جمال: شوہری......اور پھر نوکری؟

علیم: شاعری، نوکری، شوہری
ہمیں تو اسی پھیر نے مار ڈالا
مگر آپ نوکر بھی، شاعر بھی، شوہر بھی ہیں
آپ تینوں سے کیسے نمٹتے ہیں؟

سید: تین؟
میاں میرے مذہب میں تو چار جائز ہیں
پر عدل کی شرط ہے
عدل کیجیے تو دنیا کا ہر بوجھ
میزان کی کیل پر اک توازن بنے گا
توازن کہ میزانِ آفاق کی روح ہے!

قمر: (مسکرا کر) فلسفہ!
ضمیر آپ سنیے......

ضمیر: سن رہا ہوں

جمال: مسئلہ شاعری، نوکری، شوہری کا تصادم ہے

قمر: نوکری شوہری کا تقاضا ہے
اسی واسطے مسئلہ
شاعری، نوکری
شاعری، شوہری
کی مساوات کے درمیاں ہے

علیم: ٹھیک ہے!
قمر بھائی! کچھ شاعری، نوکری کے مسائل پہ کہیے

قمر: شاعری نغمہ روح ہے
رقص جاں ہے
تخیل کی پرواز ہے
نوکری ٹائپنگ کی کھٹا کھٹ کی آواز ہے
شاعری برگِ گل ہے
نمِ شب ہے
رفتارِ سیارگاں ہے
نوکری لمحہ رائیگاں ہے
شاعری موجِ کوثر ہے
شہدِ تمنا ہے
ماہِ عسل ہے
نوکری اک مشینی عمل ہے
شاعری نو بنو

تازہ تر، ضو بہ ضو

پرتو نورِ تخلیق ہے

زندہ رہنے کی توفیق ہے

نوکری ضیق ہے

شاعری روح بے تاب ہے

خوابِ بیدار و بیداریٔ خواب ہے

چشمِ پر آب ہے

کلکِ اظہار ہے

نوکری ایک لمحے کی تکرار ہے

ایک بیگار ہے!

جس سے میں اور مری روح بیزار ہے

میں شاعر ہوں!

اور فطرتِ شاعری "فطرتِ نوکری" کی وہ تردید ہے

جو مری زندگی بن گئی ہے!

علیم: واہ وا۔ واہ وا۔ کیا امیجز ہیں!

جمال: قمر کی ہر اک بات میں اک امیج ہوتی ہے

ضمیر: یہ خود شاعری کا امیج ہیں

سید: بجا ہے! مگر پھر بھی نوکر ہیں

جمال: قمر نوکری چھوڑ دو!

قمر: نوکری کامنر کے لیے ایک جنت ہے

جس کی نہروں میں سب کامنر مچھلیوں کی طرح تیرتے ہیں

مگر جینئس کے لیے نوکری زہر ہے

علیم: زہر ساز ہر!
میں شیو کی طرح ہر روز
اس نوکری کا سمندر رلبو تا ہوں
اور زہر پیتا ہوں
میرا گلا جل گیا ہے

سید: تو پھر نوکری چھوڑ دو

علیم: ہائے مجبوریاں!
اگر میری مجبوریاں!
خواہش اور فیصلے کی گزرگاہ میں
ایک دیوار کی طرح حائل نہ ہوتیں
تو میں نوکری کے بیابانِ بے آب سے
جانے کب کا نکل جاتا......
مگر میری مجبوریاں!
آہ مجبوریاں

جمال: یہ مجبوریاں ہی تو سب کچھ کراتی ہیں

ضمیر: زندگی احتیاجات کا جبر ہے

سید: میں اگر آپ کی طرح محسوس کرتا تو پھر نوکری چھوڑ دیتا کہ یہ میری مرضی سے ہے
کوئی جبری تقاضا نہیں ہے!

قمر: وہ کیسے؟

سید: وہ ایسے کہ میں چھوڑنے اور کرنے میں آزاد ہوں

قمر: مگر آپ بھی وقت، ماحول اور لاشعوری محرک کے
پابند ہیں!

سید: کون کہتا ہے؟

قمر: ظاہر ہے، ہر شخص مجبور ہے

سید: ہو گا لیکن مجھے وہم سا ہے

کہ میں اپنی پابندیوں میں بھی آزاد ہوں

وقت، ماحول یا لاشعوری محرک

کوئی میرا آقا نہیں ہے!

قمر: وقت بھی؟

سید: وقت میری انا کا تغیر ہے

ماحول میری وہ ہستی ہے جو

پھیل کر ایک سائے کی مانند مجھ سے جدا ہو گئی ہے

رہا لاشعوری محرک!

تو وہ خود مری ذات کا اندروں ہے

میں ان سب کا مجموعہ ہوں

اور آزاد ہوں!

ضمیر: یعنی "پابند آزاد" ہیں؟

جمال: "پابندِ آزاد" اچھا کہا

سید: یہ کم بولتے ہیں

مگر ان کا کم بھی بہت ہے

ہاں...... میں "پابند آزاد" ہوں!

جمال: مگر اس کے معنی ذرا کھولیے!

کیونکہ ماحول، وقت اور یہ لاشعوری محرک

جسے آپ نے "ذات کا اندروں" کہہ دیا ہے

یہی تو وہ پابندیاں ہیں
کہ جو مجھ کو "میں" بننے دیتی نہیں ہیں

سید: نہیں لفظ کا فصل ہے
جو مرے آپ کے درمیاں ہے
ورنہ معنی میں ہم ایک ہیں!

جمال: وہ کیسے؟

سید: یہ گملے میں پودا لگا ہے
اسے دیکھئے
یہ پودا اگر بڑھ کے وہ چیز بن جائے
جو اس پودے کی آخری شکل ہے
تو یہ اس کی پابندی ہو گی کہ آزادی ہو گی؟
میں جو کچھ بھی ہوں
وہ بننے کا پابند ہوں
اور بننے میں آزاد ہوں!

جمال: یہ منطق تو اچھی ہے
لیکن مجھے دیکھئے!
میں کیا ہوں!
ایک چھوٹا سا شاعر
کہ جو اپنی مرضی کے بالکل خلاف
اور جبراً
کلرکی کی لعنت میں یوں پھنس گیا
جیسے تتلی جو کیچڑ میں گر جائے

کیا میں آزاد ہوں؟

سید: تو کیا آپ کو یہ کلرکی کی لعنت کسی نے زبردستی دی ہے؟
ذرا سوچئے آپ نے اس کی درخواست دی
اور دفتر کے چکر لگائے
یہ ممکن ہے دو چار لوگوں کو پیسے کھلائے ہوں
یا پھر سفارش کرائی ہو
اور اب جبکہ خود آپ کی خواہشوں، کوششوں
کے مطابق یہ لعنت میسر ہوئی ہے
تو اب آپ کو پھر شکایت ہے!

جمال: ٹھیک ہے...... میں نے بھی دوسروں کی طرح
اس کی کوشش تو کی تھی
مگر پھر بھی یہ میری خواہش نہیں تھی

سید: عجب بات ہے!
اگر آپ کو نوکری کی یہ لعنت نہ ملتی
تو کیا آپ کو غم نہ ہوتا؟ شکایت نہ ہوتی؟

جمال: وہ میری ضرورت تھی، خواہش نہیں تھی

ضمیر: ضرورت تو صرف ایک ہے "زندہ رہنا"

جمال: بجا ہے! اسی زندہ رہنے کی خاطر تو ہم جانے کیا کیا
ستم سہہ رہے ہیں

سید: اور کیا زندہ رہنا کوئی جبر ہے؟
اگر آپ مانیں تو یہ زندہ رہنا وہ "خواہش" ہے
جو آپ کو اور سب خواہشوں سے زیادہ عزیز اک

متاعِ گراں ہے......

اور کلرکی کا مطلب یہ ہے

آپ نے زندہ رہنے کی خواہش کو

ہر اور خواہش پہ ترجیح دی ہے!

جمال: یہ منطق ہے!

قمر: منطق و فلسفہ اور "بقراطیت"

میں تنگ آچکا ہوں

میرا مسئلہ نفسیاتی ہے

جمال: ٹھیک ہے...... مسئلہ نفسیاتی ہے لیکن

جنابِ مکرم! مجھے تو یہ لگتا ہے

جیسے کہ دو اجنبی بلکہ اک دوسرے کے مخالف

وہ افراد ہیں جو مری ذات میں بند ہیں

ایک شاعر ہے

اور دوسرا صرف شوہر ہے

جو اپنی بیوی کے کچھ ننھے منے سے بچوں کی

خاطر کلرکی پہ مجبور ہے!

جس سے شاعر کو نفرت ہے

ضمیر: اور شوہر کو شاعر سے نفرت نہیں ہے؟

جمال: یقیناً

یہ دونوں

بہت دن سے اک جنگ میں مبتلا ہیں

جو شاعر ہے

وہ چاہتا ہے کہ تتلی کی مانند اڑتا پھرے

رنگ، رس اور خوشبو پہ منڈلائے

پھولوں کو چومے

ہواؤں میں جھولے

دھنک کے رنگوں کو چرائے

یہاں تک کہ خود اک دھنک بن کے لہرائے

مگر اس کے پر بھیگ کر بچ گئے ہیں

سید: اور شوہر؟

جمال: انہیں صرف تیل اور نمک چاہیے

سید: آپ کچھ زیادتی کر رہے ہیں

کہ شوہر کے کچھ اپنے رنگ، اپنے رس

اپنی خوشبو کے سامان ہیں!

ایک بیوی کی سچی خوشی

جو کسی چھوٹے موٹے سے تحفے کے وقت اس کے گالوں پہ

......رنگ شفق بن گئی ہے

اور بچوں کی آنکھوں کی وہ جھلملاتی ہوئی روشنی

جو ستاروں کی تابندگی کی طرح

صرف ابو سے مخصوص ہے

کیا یہ کچھ بھی نہیں ہے؟

کیا یہ کچھ بھی ہے؟

جمال: مگر......

سید: ذرا ٹھہریے......

اور کیا یہ کلرک اور شوہر
کہ جو ایک معمولی سا آدمی ہے
اس کے ان تجربوں کو جدا کر کے
وہ آپ کے شاعر محترم شعر کہہ سکتے ہیں؟
اگر شاعری ان سے کٹ کر کوئی اور شے ہے
تو وہ صرف لفظوں کا کرتب ہے

ضمیر: گو خوب صورت بھی ہو!

جمال: مگر میں یہ کہتا ہوں دونوں میں جھگڑا ہے

سید: جھگڑا تو ہے!
مگر ایسا جھگڑا کہ جو میرؔ کی شاعری ہے
جہاں دل کے جانے کا وہ سانحہ
جو مری آپ کی چوما چاٹی ہے
ایسے مصائب سے گھل مل گیا ہے
کہ جو زندگی ہیں

علیم: مگر میں تو غالبؔ کا قائل ہوں

سید: غالبؔ کے اندر بھی جھگڑا تھا
مگر اس کے اندر کا وہ آدمی
جس کو ہم استعارے میں شوہر سے تعبیر کرتے ہیں
خود اس کے شاعر سے کچھ کم نہیں تھا!
وہ دونوں بڑے قد کے ہمزاد تھے
جن کی پیکار غالب کی "وٹ" بن گئی ہے
اگرچہ یہ سچ ہے کہ غالب میں شوہر کی تحقیر بھی تھی

مگر پاؤں کی بیڑیوں سے جھگڑنے میں تھک ہار کے

اس نے ہنسنا بھی سیکھا

اگر اس کو پڑھیے تو یوں لگتا ہے

جیسے دیوار سے سر کو ٹکرا کے زخمی ہے

اور مسکراتا ہے

یہ غالب کی وہ مسکراہٹ ہے

جس میں اس کا کوئی اور ہمسر نہیں ہے!

ضمیر: اگرچہ کہیں مسکراہٹ میں دل کے سلگنے سے
تلخی بھی کچھ آ گئی ہے

سید: بجا ہے!

علیم: آیئے اب پلٹ آیئے

مسئلہ اور تھا

میں یہ کہہ رہا تھا

کہ میں جو بھی ہوں

اور جیسا بھی ہوں

کیا مری ذات خود میرا حاصل نہیں ہے؟

سید: آپ کی ذات

خود آپ کی ذات کے

مختلف

اور تضادات میں منقسم

دائروں کی وہ وحدت ہے

جو ساعتوں کی گزرگاہ پر

اک لرزتی ہوئی ضو کی مانند روشن ہے

علیم: اور مری روشنی میری آزادی ہے!

سید: ٹھیک ہے

علیم: میں آزاد ہوں

وقت وماحول کی تیرگی میں

"چراغ انا"

کہ جو جلتا بجھتا ہوا

"ہست" اور "بود" کی دائمی کشمکش میں

ازل سے ابد تک سفر کر رہا ہوں!

سید: بجا ہے!

علیم: اسی واسطے مجھ کو سوسائٹی کے تقاضوں سے انکار ہے

جمال: دیکھیے یہ نتیجہ ہوا!

سید: (مسکرا کر) میری بکواس کا!

ٹھیک ہے!

اس میں کیا حرج ہے؟

ویسے سوسائٹی ایک سازش تو ہے

فرد کی فردیت کے خلاف!

جمال: کیا یہ قول آپ کا ہے؟

سید: ایمرسن کا ہے

علیم: زندہ باد

توسوسائٹی فرد کی فردیت کے خلاف ایک سازش ہے

سید: صرف سوسائٹی ہی نہیں "عالم خارجی" بھی!

جس کو غالبؔ نے یہ کہہ کے رد کر دیا
کہ دنیا سے عبرت بھی حاصل نہ کر
کہ دنیا سے کوئی تاثر پذیری زبوں ہمتی ہے
وہ کہتا ہے "غفلت ہو یا آگہی
جو بھی ہو اپنی ہستی سے ہو!"

علیم: یہی تو مرا مسئلہ ہے
اگرچہ میں اب تک اسے
صرف سوسائٹی یعنی خود سے جدا
دوسروں کی حد ذات تک دیکھتا تھا

ضمیر: دوسرے تو جہنم ہیں!

سید: مگر یہ جہنم تو دراصل کل عالم خارجی ہے
کبھی سوچتا ہوں کہ جنت سے آدم کا باہر نکلنا
کہیں ذات سے عالم خارجی کا سفر تو نہیں ہے؟
خوب ہے...... مگر ہم جہنم میں اب ہیں......
تو پھر کیا کریں؟

علیم: جہنم کو تسلیم کرنے سے انکار کریں

سید: نہیں، اس جہنم کو گلزار کر دیں!

علیم: وہ کیسے؟

سید: وہ ایسے
کہ ہم اس جہنم میں ہونے کا اقرار کر لیں
یہ اقرار ہو چشم تر سے تو وہ میرؔ ہے
طنز سے ہو تو غالبؔ ہے!

عزم پیکار سے ہو تو اقبال ہے
قمر! آپ بھی کچھ کہیں

قمر: کیا کہوں
لوگ تو آؤٹ ڈیٹڈ خیالات کا ایک گودام ہیں
مرا مسئلہ نفسیاتی ہے
میں نوکری چھوڑ دوں گا

سید: تو یہ آپ کا فیصلہ ہے

قمر: یقیناً

سید: (مسکرا کر) تو میں بھی یہی کہہ رہا تھا کہ انسان اک فیصلہ ہے
جو آزاد ہے

سالک: معذرت خواہوں
ابھی آپ میں سے کسی نے کہا تھا
جہنم جو ہے "دوسرے" ہیں

ضمیر: جی ہاں میں نے!
مگر یہ کسی اور کا قول ہے

سالک: کس کا؟

ضمیر: سارتر کا

سالک: مگر اس کا مفہوم کیا ہے؟

ضمیر: جہنم انا کا تصادم ہے!

سالک: اس کو کچھ اور واضح کریں

قمر: دیکھئے میں اسے ایک امیج میں بتا دوں
ایک کمرے میں کچھ بلیاں ہیں

کہ جو یہ سمجھتی ہیں کمرے میں صرف ایک بلی ہے
اور دوسری صرف سایہ ہیں، بلی نہیں ہیں
مگر سائے سائے نہیں، بلیاں ہیں
جو آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں
اور میاؤں کرتی ہیں
تو یہ سائے جو بلیاں ہیں
تصور کی تاریکیوں سے
حقیقت میں تبدیل ہو کر انا کا جہنم بناتے ہیں
جو بلیوں کے تصادم کا اک نام ہے

سید: آپ لکھتے ہیں
لکھنے سے کیا چاہتے ہیں

سالک: فرض کیجئے کہ شہرت

سید: شہرتِ عارضی؟

سالک: میں سمجھا نہیں

سید: آپ یہ چاہتے ہیں
کہ اس طرح مشہور ہو جائیں
جس طرح
ہر روزنامے کے کالم نویسوں کی شہرت ہے
اور کل شام تک
ریڑھی والوں کی پڑیوں میں بک جائیں
یا میرؔ و غالبؔ کے دیوان کی طرح سے
ان ابد رنگ الماریوں میں سجیں

جن کو اک عسکری
یا فراق اور کلیم
کھولتے بند کرتے رہیں گے
تو ہاں، شہرتِ عارضی یا کہ پھر شہرتِ دائمی؟

سالک: شہرتِ دائمی!

سید: شہرتِ دائمی، دولتِ دائمی، عشرتِ دائمی
یعنی انسان یہ چاہتا ہے
کہ وہ خیر پر
دائمی طور سے قبضہ کر لے
بلکہ خود خیر دائم بنے

سالک: ٹھیک ہے
اس کا ملنا نہ ملنا الگ بات ہے
لیکن انسان
کی اصل منزل یہی ہے

سید: مگر خیرِ دائم خدا ہے
تو انسان کا مسئلہ کیا ہے؟
خدا بننا؟

علیم: چلو بلیوں سے خدا تک تو پہنچے

سید: مجھے بلیوں کی وکالت کا حق تو نہیں ہے
مگر کیا خبر؟ بلیاں بھی یہی چاہتی ہوں

ضمیر: (مسکرا کر) یقیناً
مگر فرق یہ ہے کہ نٹشے خدا کو سپرمین کہتا ہے

اور بابیوں کا خدا اک سپر کیٹ ہے

سید: تو پھر آپ بھی اک خدا ہیں
آپ کے والد محترم بھی خدا ہیں
یہاں سب خدا ہیں

سالک: کیا مصیبت ہے!

سید: مصیبت تو یہ ہے
کہ جب سب خدا ہیں تو کوئی نہیں ہے

ضمیر: یعنی ہم مہملیت کے گرداب میں پھنس چکے ہیں

سید: اور میری خدائی فقط میری اپنی انا تک ہے
اور زندگی، یعنی انسان کی زندگی
کچھ اناؤں کی ایک دائمی کشمکش ہے
یہی کشمکش وہ جہنم ہے
جو "دوسرے" ہیں
......(علیم پیالی بڑھاتا ہے)

علیم: خدا چائے پیتا ہے؟

سالک: (مسکرا کر) پیتا ہے

(قہقہے۔ سید زور سے سگریٹ کا کش لگاتے ہیں جس کا دھواں منظر کو دھندلا دیتا ہے)

کافی ہاؤس

(ب)

منظر: کافی ہاؤس

کردار: حمید نسیم، سالک اور کافی ہاؤس کے بیرے

حمید نسیم ایک میز پر بیٹھے ڈانٹے اور رومی کا تقابلی مطالعہ کر رہے ہیں۔ منظوم خاکوں کا البم ان کے قریب رکھا ہوا ہے۔ سالک داخل ہوتا ہے اور حمید نسیم کے پاس آجاتا ہے۔

سالک: معذرت خواہ ہوں

مرا نام سالک ہے

یہاں آپ کو دیکھ کر آ گیا ہوں

اگر آپ کو کوئی زحمت نہ ہو

تو میں تھوڑی دیر

آپ کے پاس ہی بیٹھ جاؤں

اجازت ہے؟

حمید نسیم: بیٹھئے! آپ سالک ہیں؟

سالک: کاش ہوتا!

مگر یہ مرا نام ہے

حمید نسیم: بھلا نام ہے......

بیٹھئے بیٹھئے (سالک بیٹھ جاتا ہے)

آپ کیا کرتے ہیں؟

سالک: کچھ نہیں، صرف آوارہ گردی!

حمید نسیم: بہت خوب!

آوارگی روح کی زندگی ہے

سالک: عجب بات ہے

آپ وہ پہلے انسان ہیں

جنہوں نے مجھے

میری آوارہ گردی کے اعلان پر

ٹوکنے کے بجائے مجھے داد دی ہے!

(حمید نسیم آہستہ سے مسکراتے ہیں، سالک کی نظر البم پر پڑتی ہے)

سالک: یہ کیا چیز ہے؟

حمید نسیم: ایک البم ہے (سالک البم اٹھا کر دیکھتا ہے)

سالک: اوہ منظوم خاکوں کا البم!

جسے ایک گمنام شاعر نے شائع کیا ہے

حمید نسیم: ہاں! وہ گمنام شاعر مرے دوست ہیں

دوست بھی کیا...... مرے بھائی ہیں

بلکہ بچے......
انہوں نے یہ بچپن دکھایا
کہ میرا بھی خاکہ اڑایا
انہوں نے مجھے طنزیا مسخرے پن سے
چھوٹا بخاری[۱] لکھا ہے
اور میں سوچتا ہوں
کہ کیا میں بخاری کا نقال ہوں؟
اور کیا ان کو معلوم ہے......
نقل کیا ہے؟

سالک: نقل کیا ہے؟
نقل تو نقل ہے
ایک "ایپنگ" ہے
کہ جو آدمی کے بجائے
بندروں کا عمل ہے!

حمید نسیم: نہیں!
نقل تو روح کا اک سفر ہے!
بخاری سے سقراط تک
میں سفر کر چکا ہوں
مری روحِ آوارہ
ہر روح کو
پیرہن کی طرح سے پہنتی ہے
اور پھر اسے چاک کر کے

نئے پیرہن کی نئی جستجو میں نکل جاتی ہے

کوئی ایسا کامل نمونہ

کوئی ایسا سانچہ

کوئی پیرہن

جو مری روح کا جسم بن جائے

میں ڈھونڈ تا ہوں

وہ کیا جسم ہے؟

ایک انسانِ کامل!

جو ہر روح کا جسم ہے

سالک: ایک انسان کامل جو ہر روح کا جسم ہے!

حمید نسیم: ہاں!

جو ہر روح کا جسم ہے

جو ہر جسم کی روح ہے

روح اور جسم کیا ہیں؟

کیا یہ اک دوسرے سے جدا ہیں؟

نہیں! صرف دو مختلف زاویئے ہیں نظر کے

یہ دو مرحلے ہیں مگر اک سفر کے!

"حقیقت" کو اندر سے دیکھوں تو میں "روح" ہوں

حقیقت کو باہر سے دیکھوں تو میں "جسم" ہوں!

اور میں کیا ہوں؟

"میں" سے "میں" تک سفر ہوں!

بخاریؔ ہوں، غالبؔ ہوں، سقراطؔ ہوں

کوئی ہو......

سب مرے اس سفر کے مقامات ہیں

بلکہ گستاخی ہوتی ہے گردِ سفر ہیں!

سالک: بجا ہے!

مگر میں نے اکثر سنا

اور خود میرا بھی تجربہ ہے

کہ ہر نقل اک خود کشی ہے!

یہ ''میں'' یا ''انا'' جو بھی ہے

نقل کو خود کشی جان کر اس سے بیزار ہے

نقل کیوں......؟

میں اگر ''میں'' ہوں

تو پھر مجھے نقل کی کیا ضرورت!

حمید نسیم: میں؟ مگر ''میں'' کہاں ہے؟

''میں'' تو صرف ایک امکان ہے

کیا تمہیں اس کی پہچان ہے؟

نقل تو ''میں'' کی پہچان کا، اس کی دریافت کا اک عمل ہے

ایک تکمیلِ امکان ہے!

سالک: جس کی تکمیل انسان ہے؟

حمید نسیم: ہاں وہ انسانِ کامل کہ جو ہر ''انا'' کا مقام جمع ہے

سالک: آپ کچھ بھی کہیں

میرے نزدیک تو نقل اک خود کشی ہے

یہ اقبال کے لفظ میں بت گری ہے

حمید نسیم: مگر بت وہ کیا ہے؟

کیا وہ انسان کامل نہیں ہے؟

جو خود فکر اقبال کا نقطہ ماسکہ ہے

اگر یہ نہیں ہے تو مذہب میں تقلیدِ کامل کا کیا مسئلہ ہے؟

وہ ہو شیخ کی یا بنی کی......

یہ تقلید کیا نقل کامل نہیں ہے؟

سالک: جناب آپ نے اب یہ کامل کی شرط اور اچھی لگائی!

حمید نسیم: یہ شرط اس لیے ہے کہ تقلید جزوی بھی ہوتی ہے

بہت لوگ تقلید ظاہر پہ رک جاتے ہیں

اور باطن کی تقلید تک......

وہ پہنچتے نہیں ہیں!

یہ تقلیدِ کامل وہ ہے

جو بیک وقت

روح اور جسم دونوں کی تقلید ہے!

سالک: کبھی میں نے اس طرح سوچا نہ تھا!

پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ میری انا اک بہت منفرد چیز ہے!

یہ وہ شمع ہے

جو خود اپنی ہی ذات کے موم سے جل رہی ہے!

اور پھر اپنی ہی روشنی ہے!

حمید نسیم چلو ٹھیک ہے!

مگر روشنی کتنے رنگوں سے مل کر بنی ہے!

مری ذات میں کتنے "میں" ہیں کہ لحہ بہ لحہ بدلتے چلے جا رہے ہیں

وہ ''میں ''جو محبت کرے وہ بھی میں ہوں!
وہ ''میں ''جو کہ نفرت کرے، وہ بھی میں ہوں
وہ ''میں ''جو محبت پہ خوش ہو، وہ میں ہوں
وہ ''میں ''کہ جو نفرت سے آزردہ ہو، وہ بھی میں ہوں!
پھر اک اور ''میں'' ہے......
کہ جو میری ہر اک خوشی اور آزردگی کو
تماشائی کی آنکھ سے دیکھتا ہے
سو یہ ''میں'' بھی میں ہوں!
اور اس کے سوا
جو تماشا
تماشے کے افراد،
اور پھر تماشائی
ان سب کو تم سے بیاں کر رہا ہے وہ ''میں'' بھی تو میں ہوں!

سالک: بہت خوب! اچھا تماشا جمایا
تو میری انا ایک اسٹیج ہے
جس پہ میں خود ہزاروں لباسوں میں
یوں جلوہ گر ہوں
کہ میں خود تماشا،
تماشے کے افراد،
اور خود تماشائی ہوں!
اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں ''میں'' نہیں ہوں!
''میں ''جو ہے وہ کوئی اور ہے!

حمید نسیم: کوئی اور ہے؟ اور وہ کون ہے؟

وہ بھی "میں" ہوں!

سنا آپ نے

میں بخاریؔ بنا

اور پھر بقول سلیمؔ

میں نے غالبؔ کو بھی سرپرستی میں اپنی لیا

پھر وہاں سے چلا اور غالبؔ سے سقراطؔ تک

کتنے بہروپ بدلے!

اور اب گھوم پھر کے فقط "میں" ہوں

کہ جو آپ کے ساتھ کافی بنانے میں مصروف ہے!

سالک: اگر وہ جو میرے سوا "اور" ہے

اور وہ "میں" نہیں ہے

مگر آپ کا قول ہے وہ بھی "میں" ہے!

تو پھر مجھ میں اور اس میں کیا فرق ہے؟

حمید نسیم: فرق وہ ہے جو "امکان" میں اور "تکمیلِ امکان" میں ہے!

آپ نے چاند دیکھا ہے؟

پہلی کا چاند!

اگر غور سے دیکھئے تو وہاں

نور کا دائرہ سا نظر آئے گا

یہ وہ دائرہ ہے

جو کچھ دن کے بعد

بدرِ کامل بنے گا!

وہ پہلی کا چاند ایک امکان ہے

اور یہ بدر تکمیل امکان ہے!

مگر دونوں کے درمیاں اک خلا ہے

سالک: خلا؟ اور خلا کیا ہے؟

حمید نسیم: (مسکرا کر) انسان کی آگہی ہے!

سالک: (حیرت سے) کیا؟ آگہی اک خلا ہے؟

حمید نسیم: ہاں یہی وہ خلا ہے

جو انسان کو

اور ہر چیز سے

مختلف اور جدا کر کے

انساں بناتا ہے!

کیونکہ ہر چیز جو آدمی کے سوا ہے

فقط "ہے"!

یعنی اس کا تعین مقرر ہے

مگر آدمی آگہی کے خلا کے سبب

جو بھی چاہے وہ بننے میں آزاد ہے!

اس لیے...... آدمی کیا ہے؟

آزادی ہے!

چھوڑیئے کافی پیجئے......

سالک: شکریہ!

آپ شاید ابھی مثنوی پڑھ رہے تھے؟

حمید نسیم: ہاں میں رومیؔ کا عاشق ہوں

اور ڈانٹے کا بھی مداح ہوں

مگر میں مسلمان ہونے کے باعث

یا خدا جانے کیوں؟

رومیؔ کو

کچھ زیادہ پسندیدہ شاعر سمجھتا ہوں!

آپ نے مثنوی تو پڑھی ہے؟

سالک: نہیں!

اور پڑھی بھی تو سمجھی نہیں

حمید نسیم: سمجھنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے

پہلے خود کو پڑھو،

اپنے اندر پڑھو،

اور پھر اپنے باہر پڑھو!

جس نے رومیؔ کو سمجھا

وہ خود پہلے...... ہنسئے نہیں،

صاحبِ مثنوی بن چکا تھا

اور جب اس کے اندر کے رومیؔ نے رومیؔ کو پایا

تو سمجھا،

کہ یہ دونوں اک آئینہ ہیں

کہ جو ایک میں ایک کو دیکھتے ہیں!

وہ ریاکار قاری

کہ جو مرا ہم شکل ہے

بھائی ہے!

وہ ''میں'' ہے

جو میری مدد سے مجھے پا رہا ہے!

مگر قول رومیؔ کا یہ ہے

قیامت جسے دیکھنی ہو وہ پہلے ''قیامت'' بنے

''دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں''

دیکھنے اور سمجھنے کے صرف ایک معنی ہیں...... ''ہونا!''

سالک: تو رومیؔ کو پڑھنے کا مفہوم ہے، رومیؔ ہونا!

حمید نسیم: جی ہاں! میرے نزدیک پڑھنا اسی کام کا نام ہے

خیر! ہم کچھ ''انا'' یا خودی کے سوالوں کے گرداب میں پھنس گئے تھے

برا کیا ہے، کچھ دیر چکر لگا لیں

تریں تو تریں ورنہ پھر ڈوب جائیں!

سالک: بجا ہے!

حمید نسیم: ایمرسنؔ کا کہنا وہی ہے کہ جو آپ کا ہے،

کہ ہر ''نقل اک خودکشی ہے''

کہ مرگِ خودی ہے!

وہ کہتا ہے ''جب طفلِ شیطان ہوں میں

تو پھر کیوں نہ شیطان کا ساتھ دوں!

کیوں جہنم کے یا چرچ کے یا محلے کے لوگوں کے ڈر سے

میں ''رحمٰن'' کی گود میں بیٹھ جاؤں!

میں بچہ نہیں ہوں

جو ''رحمٰن'' یا ان کے بھیجے ہوئے

مسیحا، پیمبر یا خود ان کے اوتار کو نقل کا اک نمونہ بناؤں

اور اگر طفل شیطاں نہیں ہوں

"عبدرحمٰن" ہوں!

تو پھر مجھ کو اپنی خودی کے سوا اور کیا چیز درکار ہے؟"

سالک: ٹھیک ہے! مرا مسئلہ بھی یہی ہے

حمید نسیم: یہ "رومانیوں" کا چراغِ تفکر ہے جو ایک مدت سے

مذہب، ادب، آرٹ، اخلاق اور زندگی کے ہر ایک طاق میں جل رہا ہے

اس کا کیا نام تھا جس نے پہلے یہ دعویٰ کیا

کہ "جب بائبل میرے ہاتھوں میں ہے

تو اپنی جگہ خود ہی میں پوپ ہوں!

خدا اور مرے درمیاں کوئی حائل نہیں ہے

کہ اس سے مرا انفرادی تعلق ہے!"

ہمارے یہاں بھی تجدد کے مارے ہوئے لوگ

سو سال سے کچھ اسی قسم کے فلسفے گھڑ رہے ہیں

تو ہاں کون تھا وہ؟

سالک: لیوتھر!

حمید نسیم: ہاں وہ لیوتھر ہی تھا جس نے مغرب میں

مذہب کے تابوت میں اولیں میخ ٹھونکی!

وہ بھولا کہ اس کے خدا اور خود اس کے مابین عیسیٰ ہیں!

مرے اور میرے خدا کے تعلق میں

اک لازمی اور یقینی کڑی

محمد ﷺ ہیں!

"...... بہ مصطفیٰ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست"

محمدؐ نہیں تو خدا بھی نہیں ہے،

توجب......

سالک: ذرا ٹھہریئے!

کیا خدا تک رسائی کا کچھ اور امکاں نہیں ہے؟

حمید نسیم: ہو گا! لیکن برائے مسلماں نہیں ہے

توجب واسطہ درمیاں ہے

تو میری خودی واسطے کے نمونے کی محتاج ہے!

لیجئے رومؔی کا یہ شعر پڑھئے

سالک: برلبِ منصور انا الحق عین نور

برلبِ فرعون انا اللہ عین زُور

حمید نسیم: تو منصور نے بھی "انا الحق" کہا

اور فرعون نے بھی "انا اللہ" کہا

ایک مقبول ہے

ایک مردود ہے

سالک: مگر کیوں؟

حمید نسیم: میں نے تم سے کہا تھا کہ انسان "آزادی" ہے!

یہ آزادی کس چیز کی ہے؟

سالک: کہ میں جو بھی چاہے بنوں!

حمید نسیم: مگر کیا بنوں؟

سالک: آپ بتلایئے!

حمید نسیم: آزادی یہ ہے کہ میں جو بھی چاہے بنوں!

یعنی نیکی، بدی، خیر اور شر کی،

ہر راہ میرے لیے

صرف میرے ارادے کا اک مسئلہ ہے

ورنہ میرے لیے

کچھ بھی کرنے کا دروازہ وا ہے!

"خیر" بھی مجھ میں ہے

"شر" بھی ہے

میں اسفل بھی ہوں اور اعلیٰ بھی ہوں

اور کلید اپنی آزادی کی

گم کروں میں

تو اک بند تالا بھی ہوں!

تو پھر چاہے اسفل بنوں،

چاہے اعلیٰ بنوں،

اور چاہوں تو کچھ بھی نہ کر کے فقط بند تالا بنوں!

اب مری ذات میں دو انا، دو خودی ہیں!

خودی جو کہ اسفل ہے،

خودی جو کہ اعلیٰ ہے،

سمجھئے نہ ہر گز کہ مجبور ہوں میں

میں اسفل خودی کی صدا ہوں تو فرعون ہوں

ورنہ منصور ہوں میں!

راہ فرعون تقلید شیطان ہے

راہِ منصور تقلیدِ "انسان" ہے!

کہ جو مظہرِ نورِ رحمٰن ہے

ایمرسن کو کافی میں ڈالو

نیادور

نئی زندگی تھی نئے حوصلے تھے
کہ در پیش مجھ کو نئے مسئلے تھے
ہر اک چیز کا اک نیا سلسلہ تھا
تغیر ہر اک چیز کو متھ رہا تھا
نئی منزلیں تھیں، نئی شاہراہیں
نئے معرکے تھے نئی تھیں پناہیں
خدا کائنات اور انسان کے رشتے
نئے طرزِ احساس میں ڈھل رہے تھے
وہ کیا دور تھا اور کیسا زمانہ!
مجھے یاد ہے اب بھی اس کا فسانہ
عجب کشمکش میں گرفتار تھا میں
نہ میں سو رہا تھا، نہ بیدار تھا میں
گزر پھر ہوا ایسے عالم میں میرا!

مجھے میرے لفظوں کے مردوں نے گھیرا

وہ بھوتوں کے مانند مجھ کو ڈرائیں

غلیظ اور نجس مرگھٹوں میں پھرائیں

ہر احساس کو میرے آنکھیں دکھائیں

ہر ادراک کا میرے وہ منہ چڑائیں

وہ کیڑوں کے مانند جب کلبلائیں

تو جیسے مجھے نابداں میں پھرائیں

اگر چپ رہوں میں تو وہ بلبلائیں

میں غصے میں آؤں تو وہ کھلکھلائیں

مجھے میرے الفاظ لگتے تھے ایسے!

سڑی لاش میں بھوت گھس جائیں جیسے

اگرچہ مری روح میں برہمی تھی

غزل کو جو دیکھو تو گویا ممی تھی

کہوں کیا؟ مرا حال کیا ہوگیا تھا

کہ زندہ کو جیسے کفن میں سیا تھا

یہی حال کچھ میرے ماحول کا تھا

کہ میرا شعور ادب دیکھتا تھا

عجب طرح کی شاعری ہو رہی ہے

بنام ادب ”مسخری“ ہو رہی ہے

درہجوِ شاعری

ہو رہی ہے ہر طرف سے منمناتی شاعری
منمناتی، چنچناتی، بھنبھناتی شاعری،
حافظ و خیام کو ٹھینگا دکھاتی شاعری
خالی بوتل سونگھ کر نشے میں آتی شاعری
سنگ سینوں پر جمی ہو جیسے کائی شاعری
غازۂ الفاظ سے تھوپی تھپائی شاعری
جیسے کیڑے ہوں گٹر میں بجاتی شاعری
ریڑھ کی ہڈی سے خالی لجلجاتی شاعری
فارم کی جدت سے اک صورت نئی پہنے ہوئے
سوٹ کے اندر پرانی مرزئی پہنے ہوئے
چہرۂ خالی پہ اک فکری سماں لائے ہوئے
دانت پھاڑے، منہ بنائے ہونٹ لٹکائے ہوئے
آدمی سے آدمی کی گفتگو بھولی ہوئی

فکر کے آماس سے گویا زباں پھولی ہوئی
پنیوں کے چاند پر، جھوٹی ضیا چھڑکے ہوئے
کاغذی پھولوں پہ اک عطرِ ریا چھڑکے ہوئے
صدقِ احساس و بیاں کے سب سبق بھولی ہوئی
کال کے موسم میں اک پھیکی دھنک پھولی ہوئی
دل تو پتھر کا مگر اوپر سے غم اوڑھے ہوئے
کانچ کی آنکھوں پہ جھوٹی چشمِ نم اوڑھے ہوئے

مجھے عسکری نے وہ نسخہ بتایا
کہ ردِ بلا کا وظیفہ سکھایا
اسے لکھ رہا ہوں اعادے کی خاطر
نئے شاعروں کے افادے کی خاطر!
کہا "چاہتے ہو کہ ٹالو بلا کو!
جو ہے ذہن میں ایک سانچہ وہ توڑو!
یہ سانچہ تو ہے روح کا ایک زنداں
قیامت ہے گر اس میں پھنس جائے انساں
یہ ہوتا ہے پہلے تو نرم اور کچا
مگر بعد میں مثلِ فولاد پکا!
جتن کوئی کیجئے بدلتا نہیں ہے
کوئی اس میں پھنس کر نکلتا نہیں ہے
کوئی طرز احساس چھوڑے تو ٹوٹے
کوئی روح کو اپنی توڑے تو ٹوٹے

مگر میں تمھیں ایک نسخہ بتا دوں
اگر مان لو حلِ مشکل کرا دوں
تم اس طرح کم بخت سانچے کو توڑو
نئے لفظ لکھو، پرانے کو چھوڑو!
نئے لفظ لکھو جو اتنے کڑے ہوں
کہ جیسے کہیں دل میں پنجے گڑے ہوں
مجھے خوف تھا ہاتھ سے بات جائے
کہیں مجھ سے پھر شعر ہو بھی نہ پائے
کہیں یہ نہ ہو مفت بدنام ہو کر
نیا تجربہ کر کے ناکام ہو کر!
جو تھوڑا بہت کام ہے بھول جاؤں
جو تھوڑا بہت نام ہے سو گنواؤں
مگر مجھ کو رہبر جو کامل ملا تھا
تو آسان میرا ہر اک مرحلہ تھا!
کبھی مجھ سے کہتے چمار آپ لکھیے
اسی طرح کے لفظ چار آپ لکھیے
کوئی معترض ہو تو کہیے یہ فوراً
کہ معنی تو ہیں لفظ میں اتفاقاً
کہ میں تو فقط قافیے جوڑتا ہوں
پہ معنی کا کام آپ پر چھوڑتا ہوں
یاد ہے یارو تمھیں عالم مرا
وہ مزاجِ شاعری برہم مرا

مجھ پہ اک الفاظ کا عالم کھلا
کیا مزا آیا کہ جب میں نے لکھا
آ کے اب جنگل میں یہ عقدہ کھلا
بھیڑیے پڑھتے نہیں ہیں فلسفہ
ریچھنی کو شاعری سے کیا غرض
تنگ ہے تہذیب ہی کا قافیہ
گورخر کی دھاریوں کو دیکھ لو
سوٹ چوپائے بھی لیتے ہیں سلا
لومڑی کی دُم گھنی کتنی بھی ہو
ستر پوشی کو نہیں کہتے حیا
کھال چکنی ہو تو دھندے ہیں ہزار
گیڈری نے کب کوئی دوھا سنا
رنگ وہ سارے شفق کے اڑ گئے
کیا دھماکہ تھا کہ بھک سے اڑ گئے
پنیوں کا چاند کجلانے لگا!
یعنی میری چاند سہلانے لگا

مری زندگی کا نیا دور تھا یہ!
کہ شاخِ غزل پر نیا بور تھا یہ!
مجھے شعر کہنے میں لطف آ رہا تھا
یہ لگتا تھا میں کیریاں کھا رہا تھا
مرے چار جانب مگر شور سا تھا
جسے دیکھئے اک نئی کہہ رہا تھا

کسی نے کہا خوب اسٹنٹ مارا
کسی نے کہا اڑ رہا ہے غبارا
کسی نے کہا ہے یہ شہرت کا چکر
لکھا بعض نے ہے یہ شہوت کا چکر
مرے تجزیے کے لیے بالا بالا
کسی نے بغل سے فرائڈ نکالا
کوئی ایڈلرجی سے فریاد کر کے
کہیں سے ورق دو و رق یاد کر کے
کہے راز ہے یہ نئی شاعری کا
انہیں ایک احساس ہے کمتری کا
کسی نے کہا دل لگی کر رہے ہیں
کسی نے کہا مسخرے بن گئے ہیں
ادب کی، کہے کوئی توہین ہیں یہ
نئے عہد کے ایک چرکین ہیں یہ!
کسی نے بڑی طرح تحقیق ڈالی
تو جعفر زٹلی سے نسبت نکالی
کوئی ان میں شاعر تھا نقاد کوئی
کوئی ماہر فن تھا، استاد کوئی
مگر کون اندر سے پہچانتا تھا؟
یہ چکر ہے کیا کون اسے جانتا تھا
ادب ساری دنیا کا گورٹ لیا ہے
مگر یہ نہیں جانتے لفظ کیا ہے

نیند سے پہلے

ایک دن شام کو بازار میں چلتے پھرتے
سنسناہٹ سی ہوئی سارے بدن میں میرے
سانس بھاری ہوا، سینے میں اٹک کر آیا
کچھ قدم اور چلا ہوں گا کہ چکر آیا
پھر مجھے یاد نہیں کیسے ہوائیں بدلیں
وقت، بازار، سماں اور فضائیں بدلیں
جانے کیوں دیکھ کے بازار کو ڈر آنے لگا
بے ضرر چیزوں سے بھی خوف ضرر آنے لگا
جانے کیا آنکھ کو بن دیکھے نظر آتا تھا
ایک ایک عضو بدن خوف سے تھراتا تھا
جسم قابو میں نہ تھا سینے میں دل اٹکا تھا
پاؤں رکھتا تھا کہیں اور کہیں پڑتا تھا
حبس محسوس ہوا ٹھنڈا پسینہ ٹپکا

چڑھ گیا ذہن پہ دھند اور دھویں کا بھپکا
چلنا کیسا کہ گھسٹتا ہوا گھر میں آیا
مجھ سے دو چار قدم آگے تھا میرا سایہ
کیسا سایہ کہ ہر اک لمحہ بدلتا جائے
دم بدم ایک نئی شکل میں ڈھلتا جائے
کبھی سمٹے، کبھی پھیلے، کبھی سہمے، کانپے
کبھی رینگے کبھی دوڑے کبھی رک کر ہانپے
مجھ کو یوں لگتا تھا میں جان رہا ہوں خود کو
اس کی ہر شکل میں پہچان رہا ہوں خود کو
ڈرتے ڈرتے جو قدم اور بڑھائے میں نے
وحشتِ روح کے ساماں نئے پائے میں نے
بے سبب ہر در و دیوار کو برہم دیکھا
بلب میں چشم غضب ناک کا عالم دیکھا
کیسی آواز چلی آتی ہے گھر گھر گھر گھر
آنکھ اٹھاؤں تو بلا ناچ رہی ہے سر پر
ہاتھ کرسی نے اچانک مری جانب پھیلائے
میں جو پلٹا ادھر میز نے بھی پاؤں بڑھائے
خود بخود جوتوں میں حرکت ہوئی موزے بھاگے
کلبلاتے ہوئے کیڑے تھے کشن کے تاگے
سرسراہٹ سی یکایک ہوئی پردے کے قریب
سانپ سا رینگ رہا تھا مرے تکیے کے قریب
بند گھڑیال میں بجنے لگے اک دم بارا

قہقہہ مجھ پہ ہواؤں نے اچانک مارا
بیٹھنا چاہا تو صوفوں نے دبا کر بھینچا
بھاگنا چاہا تو پردوں نے پکڑ کر کھینچا
پھر ذرا دیر میں جیسے کہ یہ سب کچھ بھی نہ تھا
دل کو وحشت تھی پہ وحشت کا سبب کچھ بھی نہ تھا

ڈِنر

ایک دن رات کو میں ایک ڈنر میں پہنچا
نو بجے ہوں گے کہ اک دوست کے گھر میں پہنچا
روح پتھرا گئی اس طرح کا منظر دیکھا
جُھک گئی آنکھ تو کوشش سے مکرر دیکھا
ہو گیا سنگ نما دیدۂ حیراں کیا کیا
کرسیوں پر نظر آئے مجھے حیواں کیا کیا
سخت کالر میں پھنسے بیٹھے ہیں اور بوٹ میں ہیں
قاعدے کا ہے بہت پاس کہ فل سوٹ میں ہیں
کھانا کھاتے ہیں تو چپ چپ کی صدا آتی ہے
پانی پیتے ہیں تو لپ لپ کی صدا آتی ہے
گھاس کی کرسی پہ بیٹھا ہوا خر کھاتا ہے
جہل کے توس سے دانش کا بٹر کھاتا ہے
پہلوئے نحس میں لنگور ہے اک حور لیے

لومڑی بیٹھی ہے اک خوشۂ انگور لیے
سوپ اشکوں کے سڑپتا ہے وہ اجگر بیٹھا
رَس نگاہوں کا نگلتا ہے وہ بندر بیٹھا
ریچھ اک سمت میں وہ مغز ہنر کھاتا ہے
بھیڑیا پنجوں کے بل قاشِ جگر کھاتا ہے
تیندوا ایک طرف پُشت کیئے بیٹھا ہے
ایک انسانِ مُسلم کو لیے بیٹھا ہے
اور وہ مہمانِ خصوصی کی بڑی کرسی میں
اک سگِ سرُخ نشستہ ہے ہری ٹائی میں
کل ہی اک "تمغۂ و مباز" ملا ہے اس کو
اپنی ناپاکی کا اعزاز ملا ہے اس کو

چہرہ ہاتھوں مٹیں چھپائے ہوئے ڈر کر بھاگا
دور تک تیرہ و تاریک سڑک پر بھاگا
رفتہ رفتہ وہ سڑک جانے کہاں جانکلی
مجھ کو محسوس ہوا راہ نئی آنکلی

قصرِ سیاہ

سوچتا تھا کہ یہ کس راہ قضا میں، میں ہوں
دیکھتا کیا ہوں کہ اک دشت بلا میں، میں ہوں
وسعتِ وقت کی مانند ہے جس کا دامن
ہو کا سناٹا ہے، چلتی ہیں ہوائیں سن سن
بھاگے پھرتے ہیں جھکولے کہیں غولوں کی طرح
رقص کرتے ہیں بگولے کہیں بھوتوں کی طرح
دور سے "بوم" کی اس طرح صدا آتی ہے
قہقہہ مارتا ہو لاش پہ کوئی جیسے
روشنی ہے جو شفق پر کسی موتی کی طرح
تیرگی میں ہے سفیدی لبِ زنگی کی طرح
چاند تاریک فضاؤں میں اتر آیا ہے
برص کا داغ رخِ شب پہ ابھر آیا ہے
کہکشاں دُور تلک آئے نظر میں ایسے

راہ میں لوٹ رہا ہو کوئی اژدر جیسے
ایک تارا ہے ادھر خون چکاں لب کی طرح
اک طرف خوشۂ پروین ہے عقرب کی طرح
خاکِ آفاق میں تارے جو دمک اٹھے ہیں
دانت ہیں کالی بَلا کے جو چمک اٹھے ہیں
ورنہ آسیب ہیں، عفریت ہیں یا سائے ہیں
مشعلیں لے کے سر راہ چلے آئے ہیں

اور اس دشت میں کچھ دُور پہ اک قصرِ سیاہ
سہم کر جس سے پھر آئے درِ مژگاں میں نگاہ
برج کالے ہیں، فصیلیں ہیں سیہ، در کالے
فرش سے سقف تلک سارے ہیں پتھر کالے
شہ نشیں کالے، ستوں کالے، شجر کالے ہیں
شاخیں کالی ہیں، سبھی برگ و ثمر کالے ہیں
روشیں کالی، لکیریں بھی ہیں کالی کالی
کالے پردے پہ شبیہیں بھی ہیں کالی کالی
جا بہ جا اس کی فصیلوں پہ ہے اس طرح گیاہ
دہر پر جیسے مسلط ہو شبِ تار گناہ
اور اس قصر پہ اس طرح نحوست کا ہجوم
"شوم" کے فرق پہ جس طرح سے ہو سایۂ بوم
اور اس میں کوئی جھانکے تو نظر آتا ہے
ایسا منظر کہ جسے دیکھ کے ڈر آتا ہے

پالتی مار کے اک سمت ہے وحشت بیٹھی
منہ پھلائے ہوئے اک سمت عداوت بیٹھی
بغض اک کونے میں بیٹھا ہے جگالی کے لئے
منہ بنائے ہے ہوس کاسۂ خالی کے لئے
آگ کھاتی ہے وہ اک سمت میں نفرت بیٹھی
رال ٹپکاتی ہے اک سمت شقاوت بیٹھی
جہل اک سمت میں کھاتا ہے وہ دانش کے کباب
کاسۂ سر میں اُدھر ظلم وہ پیتا ہے شراب
جام پر جام پلاتا ہے حسد کو کینہ
بے حیائی وہ دکھاتی ہے کمر اور سینہ
ران سہلاتی ہے عریانی فطرت اپنی
چھاتیاں ملتی ہے اک سمت وہ شہوت اپنی
ایک کونے میں نظر جس سے اِبا کرتی ہے
دنیاداری کسی کتے سے زنا کرتی ہے
اپنی فطرت کی دنایت پہ گواہی بن کر
زہر کے جام لنڈھاتی ہے جماہی لے کر
کفر وہ بیچ میں مسند پہ ڈٹا بیٹھا ہے
حاکمِ وقت کی مانند تنا بیٹھا ہے
سیر ہوتی نہیں اک ایسی طلب جاری ہے
جام گردش میں ہیں اور رقصِ طرب جاری ہے
غیرتیں ساز بجاتی ہیں دلوں میں رو کر
عصمتیں بھاؤ بتاتی ہیں برہنہ ہو کر

رقص میں جاں پہ شرافت کی عجب تنگی ہے
ضرب کوڑوں کی پڑی ہے سو کمر ننگی ہے
اشک آنکھوں میں سنبھلتا نہیں، بہتا بھی نہیں
سر پہ عزت کے تقدس کا دوپٹہ بھی نہیں
اور وہ اس کے مقابل میں عیاذاً باللہ
دیکھ کر جس کو تڑپتی ہے جراحت سے نگاہ
رحلِ تقدیر پہ قرآن جلی رکھا ہے
طشتِ زریں پہ سرِ ابنِ علی رکھا ہے

نیند کی وادی

تم نے

تم نے

مارا...... تم نے مارا

کیوں مارا...... تم نے

مجھ کو کیوں مارا

بولو...... بولو

کیوں...... مارا

میری روح میں جلتا ہے

جلتا ہے...... جلتا ہے...... جلتا ہے...... انگارہ......

کیوں مارا......

تھپڑ مارا...... تھپڑ...... تھپڑ...... کیوں مارا

تھپڑ مارا...... زخم لگایا...... زخم لگایا...... باغ لگایا

جنت...... جنت...... باغِ جنت...... میں تھا...... باغ تمہارا

باغ جنت میں تھا...... میں تھا...... میں تھا پھول تمہارا...... دل میں مہکوں

روح میں مہکوں...... خون میں مہکوں...... میں تھا...... پھول تمہارا...... باغ تمہارا

کیوں مارا

ابنِ علی ہو...... ابنِ علی ہو

ابنِ علی ہو

میں ہوں پھول تمہارا

کیوں مارا

انگارا...... انگارا...... انگارا

اطہر (۱)

اطہر

اطہر

اط...... ہر ہر ہر...... ہری ہری...... ہری اوم

اوم...... اوم...... ہری اوم

اوم...... او...... ام...... آدم

آدم...... ابا

ابا...... بابا

بابا...... بابا...... ابابابا...... ابو...... ابو...... ابو...... برہم

برہم...... برہم...... بر...... آدم...... برہم...... برہما

برہما...... براہم...... براہم...... براہیم

برہما آئے

آدم آئے

بیٹھ...... بیٹھو...... ٹھو، ٹھا...... ٹھاکر...... ٹھاکر

مان سنگھ......مان سنگھ......جودھا بائی......نور جہاں

نور جہاں کہاں ہے

نور

جہاں...... جہاں پناہ......

مہابلی

بل

بل

بل

بلدیو...... مہادیو

مہادیو، مہادیو...... کھیولی...... کھیولی......ابو......ابو......ابو کب آئیں گے......

ابو کل آئیں گے

کل......کل......کل......کال مہاکال کل

ابو کل آئیں گے...... مہابلی کل آئیں گے

جہاں پناہ کل آئیں گے

مان سنگھ بیٹھو...... مہابلی کل آئیں گے

مان سنگھ......مان، مان، مان، مسلمان

مسلمان...... مسلمان......راجپوت ہو

پوت ہو

بھائی ہو...... شمیم......ابو کل آئیں گے۔ مہابلی کل آئیں گے......کل کل کال مہاکال

بیٹھو......اطہر...... بیٹھو

عالی

عالی

خالی

عالی آئے

عالی جعلی

عالی......حالی......عالی آئے

عالی خالی آئے

کون آیا ہے......عالی بھائی

بھائی......بھائی......کیا بھائی......کیوں بھائی

صورت بھائی......سیرت بھائی......بھائی عالی......عالی بھائی

بیٹھو عالی

عالی......اعلیٰ......اولی......اولیٰ

اولیٰ مولا......

مولا وہ ہے......اولیٰ وہ ہے......اولی وہ ہے......اعلیٰ وہ ہے

وہ ہے......وہ ہے......وہ ہے......وہ......وہ......ہ،

ھو ھو ھو

ھو احد علی......ھو الاکبر......ھو القادر......ھو الغالب......ھو القہار

ھو القہار

ھو القہار

ھو القہار

قہار، قہار، قہار

بھاگو عالی......بھاگو......قہ، قہ، قہ قہار......قہار......جبار......جبار ھو الجبار

ھو الغفار......ھو الستار......ھو الستار......ھو الرحیم......ھو الرحمٰن......ھو الرحمٰن

ھوالغفار...... آؤ...... آؤ...... عالی آؤ...... آؤ...... کھاؤ

کھاؤ...... تم دونوں کھاؤ۔ دونوں دشمن کھاؤ۔ دونوں بھائی کھاؤ

کھاؤ...... گاؤ...... گاؤ...... گاؤ...... کیا گاتے ہو۔ گانا...... نا...... نالہ...... نالہ...... نالہ

نالہ نے...... بشنو عالی...... بشنو...... بشنو...... گاؤ...... اچھا گاتے ہو......

گاؤ...... گاؤ

بشنو، بشنو

جاؤ...... عالی جاؤ...... عالی جاؤ

پھر آنا...... پھر آنا...... پھر آنا

چہرے...... چہرے...... چہرے

کتنے چہرے...... چاروں طرف

کتنے چہرے

آدھے چہرے

آدھے چہرے

دائیں بائیں آدھے چہرے

روشن چہرے

کالے چہرے

روشن چہرے دائیں...... کالے چہرے بائیں

دائیں چہرے جنت چہرے

بائیں چہرے دوزخ چہرے

دونوں میرے چہرے

میرا چہرہ جنت چہرہ...... میرا چہرہ دوزخ چہرہ

روشن چہرہ...... کالا چہرہ

کالے چہرے کو دھوؤں

کالے چہرے کو دھوؤں

پانی...... پانی...... امی پانی......

پرچم...... پرچم...... چم چم......

چم چم پرچم......

میرا پرچم!

کس کا پرچم

سب کا پرچم...... میرا پرچم......

مشرق...... مغرب...... سب کے پرچم...... میرا پرچم

میرا پرچم...... میں...... کون...... کون...... میں کون

میرا پرچم...... میرا پرچم...... سب کا پرچم

سلامی اتارو...... اتارو...... اتارو...... سلامی

انتظار؟

انتظار

کس کا انتظار

انتظار حسین...... حسین کا انتظار...... حسن کا انتظار...... مہدی کا انتظار

تمہیں کس کا انتظار ہے؟

لاہور سے آئے ہو

دیکھنے...... پہچاننے

حسینی علم اب کہاں ہیں؟

حسین اب کہاں ہیں

حسن اب کہاں ہیں

بلاؤ...... بلاؤ...... بلاؤ

مرے منتظر تھے...... آئے ہو...... انتظار حسین آئے ہو......

یہاں آؤ...... میں...... دیکھو...... پہچانو......

احد...... احد...... ھوالاحد...... الف

الف 'احد'

انا...... الف انا......

انا...... احد...... اناالاحد

احد ہوں......

احد ہوں......

احد ہوں......

میں احد ہوں

نور ہے...... نور ہے...... نور ہوں

میں نور ہوں...... مگر...... ہاں دوسری سمت بھی کوئی ہے

کون ہے...... کون ہے...... کون ہے

دوسری سمت یہ کون ہے

میرا مقابل...... میری تصویر ہے

ہاں یہ احمد ہے

احمد...... احمد...... احمد

احد اور احمد

احد میں ہوں اور یہ احمد ہے

یہ احمد ہے اور میں احد ہوں

بیچ میں پردۂ نور ہے

پردۂ نور ہے...... میم ہے......م م م م م

میم حائل ہے

درمیاں......درمیاں

یہ حائل ہے......یہ پردہ ہے

یہ پردہ ہٹا دو......یہ پردہ ہٹا دو

میں احد ہوں

میں احمد ہوں

ہاں یہی ہے......یہی ہے......یہی ہے

ایک ہیں

ایک ہیں

دونوں

دونوں

دونوں ایک ہیں

نور

نورالسّموات

نورالسّموات والارض

میں نورالسّموات والارض ہوں

مجھ پر اک پردۂ نور ہے

نور ہے......نور ہے

نور ہے......نور پیدا ہوا

نور احمد......نور احد

ایک ہیں......

ایک......

رے......

ا......

الف

الف لام......

الف لام میم

لام جبرئیل ہے

الف، میں احد

الف میں احمد

دونوں کے درمیاں

درمیاں......درمیاں......درمیاں

کیا......کون

کون آیا......وہ......

تین......تین آئے ہیں،

تین یا چار

تین ہیں......اور میں چار

چار

چار

چار کون......جبرئیل......

چار

تین آئے ہیں

تین آئے ہیں مجھے دیکھنے

چوتھے نہیں آئے

تین...... بلاؤ...... بلاؤ...... چوتھے نہیں آئے...... چوتھے نہیں آئے

بازیافت

غزلیں

اظہارِ حالِ دل پہ ہے اصرار دیکھنا
ظاہر پرست کتنے ہیں غمخوار دیکھنا

یارو ہم اہلِ عشق ہیں ہم پر حرام ہے
فردِ حسابِ اندک و بسیار دیکھنا

اس آنکھ کے سوا نہ کسی کو ہوا نصیب
رنگِ مزاجِ عشقِ خود آزار دیکھنا

بیٹھے ہیں سب سکون سے کہتا نہیں کوئی
کیسا یہ شور ہے پسِ دیوار دیکھنا

اے پاسبانِ شب کوئی دزدِ سحر نہ ہو
پچھلے پہر یہ کون ہے بیدار دیکھنا

اِک ساحلِ امید سے طوفانِ یاس تک
موجِ خیالِ یار کی رفتار دیکھنا

دن سا پہاڑ کاٹ لیا، شام ہوگئی
اب کیا سلیم سایۂ دیوار دیکھنا

۲۵ مئی ۱۹۸۰ء

کچھ بھی نہ لغزشِ نگہ یار دیکھنا
بس اپنے آپ ہی کو گنہ گار دیکھنا

کچھ بھی دیکھنے کی اذیت نہیں ہے سہل
کچھ اس سے بھی زیادہ ہے دشوار دیکھنا

گرد و غبارِ شہر میں بارش کی دیر ہے
دھل جائیں گے یہ سب در و دیوار دیکھنا

خواہش تو محترم ہے وہ خواہش کسی کی ہو
اس زاویے سے حسرتِ اغیار دیکھنا

تجھ سے وفا نہ چاہی کہ منظور ہی نہ تھا
اس قید میں تجھے بھی گرفتار دیکھنا

کیا جانے انتظار کو کیا رنگِ خواب دے
یہ شام ہی کو صبح کے آثار دیکھنا

یہ دل ہے اک خانۂ ویراں مگر سلیم
جلتا ہے اک دیا سرِ دیوار دیکھنا

تغافل ہے، تجاہل ہے نہ وہ پندار باقی ہے
ہمارے درمیاں پھر کون سی دیوار باقی ہے

ابھی سے شکوۂ کم قدریٔ اقدار کیا معنی
کہ ہم زندہ ہیں دل زندہ ہیں کوئے یار باقی ہے

وہی شہرِ تمنا ہے وہی نازِ خریداراں
وہی اب تک ہجومِ کوچہ و بازار باقی ہے

وہ سورج ڈھل گیا، روزِ محبت ختم پر آیا
مگر کچھ دھوپ سی اب بھی سر دیوار باقی ہے

دل نالاں غنیمت ہے سکوں آباد عالم میں
یہی اک یادگارِ فرصتِ آزار باقی ہے

کرم کا کوئی خانہ ہے، نہ گھر کوئی توجہ کا
مگر چاہو تو ہاں اک گوشۂ اقرار باقی ہے

یہ جو اندر میرے تنہائی ہے
وجہہ صد انجمن آرائی ہے

کیسے چپ چاپ کھڑے ہیں لیکن
ان درختوں میں بھی گویائی ہے

پھر بکھر جائیں گے تاروں کی طرح
ایک دو لمحے کی یکجائی ہے

اب تو وہ دورِ محبت بھی نہیں
آنکھ کس درد سے بھر آئی ہے

جو ستاروں پہ چلا کرتے تھے
ان کو قسمت کہاں لے آئی ہے

روشنی سی ہے مشامِ جاں میں
تیری خوشبو مری بینائی ہے

نقشِ دیوار وہ صورت بھی گئی
میری آنکھوں کی وہ وحشت بھی گئی

وہ دیا بجھ گیا میرے اندر
وہ ہواؤں سے رقابت بھی گئی

سر بھی رسوا ہیں کہ سودا نہ رہا
سنگِ دیوار کی عزت بھی گئی

جاں سپاری کے بہت دعوے تھے
اب تو جینے کی ندامت بھی گئی

سعیِ آسودگی گئی وصل تو کیا
گریۂ شب کی وہ فرصت بھی گئی

دن کو سائے سے تو کچھ ساتھ بھی تھے
رات کو پھر یہ رفاقت بھی گئی

جس سے زندہ تھے، ضمیر و احساس
اب وہ اندر کی ملامت بھی گئی

ترے سلوک کو سمجھا نہیں ہے دنیا نے
ابھی تو عام ہیں جور و کرم کے افسانے!

گزر چکے ہیں مقامِ جنوں سے دیوانے
تری نگاہ اب اٹھی ہے کس کو سمجھانے

ازل سے گوش بر آوازِ پا ہیں ویرانے
جنوں کی کونسی منزل میں اب ہیں دیوانے

وہ جن کو راس نہ آئی تھی تیری قربت بھی
ہیں تجھ سے چھوٹ کے کس حال میں خدا جانے

ہوا اہلِ دل پہ ہیں الزام سب بجا ہیں مگر
تری نظر سے بھی منسوب ہیں کچھ افسانے

وہ اپنے درد کا احوال کیا کہیں کہ جنہیں
مٹا دیا ہے ترے التفاتِ بیجا نے

یہاں نہ ڈھونڈ انہیں اب کہ کوئے جاناں سے
چلے گئے ہیں تلاشِ سکوں میں دیوانے

سلیم تو ہی سمجھ لے مزاجِ دنیا کو
ترا مزاج تو سمجھا نہیں ہے دنیا نے

بھٹک کے قافلہ اہل دل جہاں نکلا
وہیں سے منزل مقصود کا نشاں نکلا!

نہ زادِ رہ، نہ رہ بر، نہ منزلِ مقصود
عجیب شان سے یاروں کا کارواں نکلا

ترا کرم کہ جسے ہم کرم ہی سمجھے تھے
سو وہ بھی ایک ترا طرزِ امتحاں نکلا

نہ تیری خوئے تغافل، نہ میری خودداری
حجابِ عشق مرے تیرے درمیاں نکلا

جو اہلِ درد کے ہونٹوں پہ اِک تبسم تھا
سو وہ بھی ان کے غمِ دل کا ترجماں نکلا

یہ وہ مقام ہے جس کو سکون کہتے ہیں
ارے سلیم! ادھر آج تو کہاں نکلا

تھا ترے حسن کا چرچا سحر و شام بہت
بارے اب دل کی حکایت بھی ہوئی عام بہت

ہم خطا وارِ محبت ہیں، بجا ہے لیکن
آپ کی چشمِ کرم پر بھی ہیں الزام بہت

آج کا عہدِ وفا بھول نہ جانا کل تک
حسن خاکم بدہن، اس میں ہے بدنام بہت

یاس میں اس کے ستم کی بھی توقع چھوٹی
جس سے تھی مجھ کو، کرم کی ہوسِ خام بہت

اف وہ آغازِ تمنا کہ بعنوان خلوص
دونوں جانب سے ہوئے نالہ و پیغام بہت

اب سلیم اس سے ملاقات کی صورت کیا ہو
فرصت اس کو بھی نہیں، ہم کو بھی ہیں کام بہت

وضع اپنی چھوڑ کر، یوں مہرباں ہونا نہ تھا
تجھ کو ہم سے اس قدر بھی سرگراں ہونا نہ تھا

اب ترے غم سے کہاں وہ رونقِ بزمِ جنوں
جور میں تجھ کو حریفِ آسماں ہونا نہ تھا

عذر کیا کیجیے کہ تھی دشوار وضع احتیاط
شکوہ کیا کیجیے کہ اتنا سرگراں ہونا نہ تھا

ایک دھوکا بھی نہ کھا پائے بنامِ آرزو
یوں بھی عمر رائیگاں کو رائیگاں ہونا نہ تھا

ہیں مزاجِ حسن میں نیرنگیاں کیا کیا سلیم
تجھ کو بھی پابند یک رسمِ فغاں ہونا نہ تھا

مزاج دانِ محبت نگاہِ یار نہیں
دلِ خراب! ترا بھی تو اعتبار نہیں

غمِ فراق کو کیا اہلِ درد روتے ہیں
نشاطِ وصل بھی کچھ دل کو سازگار نہیں

وہ بے وفائی کا شکوہ تو تجھ سے کیا کرتے
کہ اہلِ عشق کو خود اپنا اعتبار نہیں

حیاتِ عشق کی تکمیل میں غموں کے سوا
مسرتیں بھی ہیں، جن کا کوئی شمار نہیں

سکوں تو خیر کہاں ہم ستم نصیبوں کو
بس اس قدر ہے کہ اب اتنے بیقرار نہیں

ملے تو ایسے ملے اور چھٹے تو ایسے چھٹے
سلیم آپ کا بس کوئی اعتبار نہیں

مزاج دانِ محبت نگاہِ یار نہیں
دلِ خراب! ترا بھی تو اعتبار نہیں

غمِ فراق کو کیا اہلِ درد روتے ہیں
نشاطِ وصل بھی کچھ دل کو سازگار نہیں

وہ بے وفائی کا شکوہ تو تجھ سے کیا کرتے
کہ اہلِ عشق کو خود اپنا اعتبار نہیں

حیاتِ عشق کی تکمیل ہیں غموں کے سوا
مسرتیں بھی ہیں، جن کا کوئی شمار نہیں

سکوں تو خیر کہاں ہم ستم نصیبوں کو
بس اس قدر ہے کہ اب اتنے بیقرار نہیں

ملے تو ایسے ملے اور چھٹے تو ایسے چھٹے
سلیم آپ کا بس کوئی اعتبار نہیں

کیا جھوٹ، کیا سچ، اللہ جانے
تیری نگہ کے لاکھوں فسانے

مانے تو کس کی دیوانہ مانے
جتنی زبانیں، اتنے فسانے

انداز اس کا، احوال میرا
کچھ میں نہ سمجھوں، کچھ وہ نہ جانے

اللہ رے یہ خود اعتمادی
میں اب چلا ہوں انکو بھلانے

گم کردہ رہ! کیا سوچتا ہے
چھوڑ آیا پیچھے کتنے ٹھکانے

مری وفا کا وہ معترف ہے
اپنی خطا کو مانے نہ مانے

چاہو تو آؤ، چاہو نہ آؤ
دونوں کے یکساں حیلے بہانے

کچھ میرے غم سے نسبت ہے انکو
یاد آرہے ہیں کتنے فسانے

کیا ہے سلیم ان باتوں کا حاصل
کس کو چلا ہے تو آزمانے

جس نے ہم کو جگایا تھا
خواب میں چلنے والا تھا

مشعل جس کے ہاتھ میں تھی
وہ تو خود ہی اندھا تھا

تیری منزل مجھ سے تھی
میں منزل کا رستا تھا

سوکھی دھرتی کی تہہ میں
امرت جل کا سوتا تھا

سننے والے بہرے تھے
بولنے والا گونگا تھا

اونچی موج خیالوں کی
دریا سا اک بہتا تھا

باہر والے کیا جانیں
اندر کیا ہنگامہ تھا

مجھ کو دشوار ہوا جس کا نظارا تنہا
کاش مل جائے کہیں مجھ کو دوبارا تنہا

اے شبِ ہجر مجھے تو نے تو دیکھا ہوگا
میری مانند نہ تھا صبح کا تارا تنہا

تم نہ ٹھہرے تو کہاں موجِ گریزاں رکتی
میری آغوش کی صورت ہے کنارا تنہا

عذر کیا کیا نہ تراشا کیے اربابِ ہوس
جان دینے کا ہوا عشق کو یارا تنہا

یوں بھی محسوس ہوا جیسے کہ میں ہی تو ہوں
ایک لمحہ میں جسے میں نے گزارا تنہا

یوں تو دنیا میں بہت ہیں کہ رہے ہیں ناکام
بازیِ عشق کو میں جان کے ہارا تنہا

تو نے اے یادِ عزیزاں یہ عنایت کیوں کی
زندگی یوں بھی نہ تھی مجھ کو گوارا تنہا

عمر بھر کاوشِ اظہار نے سونے نہ دیا
حرفِ ناگفتہ کے آزار نے سونے نہ دیا

دشت کی وسعتِ بے قید میں کیا نیند آتی
گھر کی قیدِ در و دیوار نے سونے نہ دیا

تھک کے سو رہنے کو رستے میں ٹھکانے تھے بہت
ہوسِ سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا

کبھی اقرار کی لذت نے جگائے رکھا
کبھی اندیشۂ انکار نے سونے نہ دیا

ہوگئی صبح بدلتے رہے پہلو شب بھر
ایک کروٹ پہ دلِ زار نے سونے نہ دیا

فیض مری یاد کا پہونچا وطن کی خاک تک
میری آہِ سرد سے آبِ چمن ٹھنڈا ہوا

پھونک ڈالا میری ہستی کو تمہاری جنگ نے
کچھ کلیجہ اے خدا و اہرمن ٹھنڈا ہوا

ایک جھونکا یاد کا آیا ہے ایسا گرم و سرد
جاں میں گرمی آگئی ہے اور تن ٹھنڈا ہوا

اک ہوائے وصل میری روح میں ایسی چلی
وہ مزاجِ اختلافِ جان و تن ٹھنڈا ہوا

میری محنت نے مجھے بخشی قبا آسودگی
جب عرق آیا بدن میں پیرہن ٹھنڈا ہوا

دکھائیں گے تری تصویر مو بمو اب کے
کہ دل نے عکس اتارا ہے ہو بہو اب کے

نیا ہے شعلۂ مے، دل کی آگ بھی ہے نئی
بدل گئے ہیں مرے ساغر و سبو اب کے

شبِ فراق سے کہدو طویل تر ہوجائے
نئے چراغ جلاتی ہے آرزو اب کے

وفا جفا سے وہ مطلب ادا نہیں ہوتا
کچھ اور ہے مرے خاطر نشیں کی خو اب کے

یہ تیرے رنگ تو آغازِ شوق میں بھی نہ تھے
ملا ہے ٹوٹ کے جس طرح مجھ سے تو اب کے

سکوتِ نیم شبی کی اُداس گہرائی
سمٹ کے بن گئی ہے تیری گفتگو اب کے

مرا وجود دعا ہے کشادِ زخم ملے
سلیمؔ دل کو نہیں حاجتِ رفو اب کے

روکے نہ یہ فریبِ بہاراں چلے چلو
یہ دامِ رنگ ہے کہ گلستاں چلے چلو

پھولوں نے آنکھ بھر کے نہ دیکھا تو رنج کیا
کانٹوں کے اِلتفات پہ نازاں چلے چلو

منزل نظر میں ہے تو اندھیروں کی فکر کیا
یارو مثالِ شعلۂ رقصاں چلے چلو

مدت سے دشتِ درد کی راہیں اداس تھیں
اب کے ادھر ہے زورِ بہاراں چلے چلو

روکے جو راستے میں سو رہزن سے کم نہیں
وہ پھول ہو کہ خارِ بیاباں چلے چلو

ہر لمحہ بے کراں ہے جہاں تک سفر کریں
اور رک گئے تو پھر وہی زنداں چلے چلو

جو چپ رہا سلیمؔ سو پتھر سا بن گیا
نالاں سہی، نہیں جو غزل خواں، چلے چلو

خود اپنی لو میں تھا محرابِ جاں میں جلتا تھا
وہ مشتِ خاک تھا لیکن چراغ جیسا تھا

میرے خیال کی تجسیم ہے وجود ترا
تیرے لیے بڑی شدت سے میں نے سوچا تھا

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے وہ روئے نادیدہ
بغیرِ منتِ چشم و نگاہ دیکھا تھا

معانی شبِ تاریک کھل رہے تھے سلیم
جہاں چراغ نہیں تھا وہاں اُجالا تھا

ایک خوشبو دل و جاں سے آئی
اک مہک زخمِ زباں سے آئی

دشتِ بے آب کی مانند تھا میں
یہ نئی موج کہاں سے آئی

سرد تھی موت کی مانند حیات
آنچ سی شعلہ جاں سے آئی

اتنی رونق سرِ بازارِ وفا
میرے سودائے زیاں سے آئی

کتنی تاریک تھیں راتیں میری
روشنی کس کے مکاں سے آئی

عشق کی دولت بیدار سلیم
حُسن پر حُسنِ گماں سے آئی

اک نفس میں لاکھ عذاب
اے دل دشمن خانہ خراب

نازِ تشنہ لبی مجھ کو
ایک ہوئے آب و سراب

وصل میں کیا تسکین ملے
موج ہے دریا میں بیتاب

ایک میں دونوں میں اور تو
لیکن اپنے اپنے خواب

دنیا کو سرسبز کرے
میریِ آنکھوں کا سیلاب

سجدہ گاہِ اہلِ وفا
تیرے ابرو کی محراب

امرت تیری آنکھوں میں
میرے جام میں ہے زہر آب

ایک لمحہ میں کھنچ آیا
ساری عمر کا پیچ و تاب

تیری دین بڑی داتا
درد کی دولت تھی نایاب

نہیں کہ چشمِ محبت سوئے مآل نہیں
میں سوچتا ہوں مگر جرأتِ سوال نہیں

ہر ایک سمت ہنسی گونجتی ہے پھولوں کی
بہارِ ناز ابھی واقفِ ملال نہیں

نگاہِ حُسن بہت پُر خلوص ہے لیکن
وفا کے مسئلہ میں میری ہم خیال نہیں

کہاں کی شیشہ گری دل کو جوڑ دیتا ہے
یہ کام وہ ہے کہ جس میں تری مثال نہیں

اسی نے گُل کو تری ہمسری پہ اُکسایا
کہ پیرہن میں ترے نکہتِ وصال نہیں

اہلِ دل نے عشق میں چاہا تھا جیسا ہو گیا
اور پھر کچھ شان سے ایسی کہ سوچا ہو گیا

عیب اپنی آنکھ کا یا فیض تیرا کیا کہوں
غیر کی صورت یہ مجھ کو تیرا دھوکا ہو گیا

تجھ سے ہم آہنگ تھا اتنا کشش جاتی رہی
میں تیرا ہم قافیہ تھا عیب ایطا ہو گیا

یاد نے آ کر یکایک پردہ کھینچا دور تک
میں بھری محفل میں بیٹھا تھا کہ تنہا ہو گیا

کشتیِ صبر و تحمل میری طوفانی ہوئی
رات کو تیرا بدن جب موجِ دریا ہو گیا

کیا ہوا اگر تیرے ہونٹوں نے مسیحائی نہ کی
تیری آنکھیں دیکھ کر بیمار اچھا ہو گیا

عشق مٹی کا عجب تھا مجھ کو بچپن میں سلیم
کھیل میں کیا سوچتا میں جسم میلا ہو گیا

کام جو میں نے کیا قسمت سے الٹا ہوگیا
عاشقی کے کھیل میں گھر کا گھروندا ہوگیا

یار لوگوں کو مرا جلنا تماشا ہوگیا
دیکھ کر اٹھتا دھواں میلا اکٹھا ہوگیا

کسمپرسی میں دلالوں نے اضافہ کردیا
تو نے پوچھا درد میرے دل کا دونا ہوگیا

چار دن جی کر بھی کیا کرتا میں تیرے ہجر میں
تو گیا میرے لیے مرنے کا حیلہ ہوگیا

خوش گمانی تیری تعمیر میں بنی تھیں ریت پر
جب حقیقت کھل گئی دریا کی، صحرا ہوگیا

فیض مٹی کا عجب ہے مانجھیے یا کھیلیے
روح اُجلی ہوگئی جسم میلا ہوگیا

لفظ کو چمکا دیا لکھنؤ کے فیض نے
تم پہ قابو پالیا جب شعر عمدہ ہوگیا

وصل کی فکر بھی اندیشۂ فرقت بھی نہ تھا
وہ محبت تھی کہ احساسِ محبت بھی نہ تھا

بے حسی تھی کہ محبت کی ہوئی تھی تکمیل
دل میں اک شائبہ رنج و رقابت بھی نہ تھا

بھول بیٹھے تھے کہ یادوں پہ کہاں تک جیتے
اور اس پر کوئی اظہارِ ندامت بھی نہ تھا

یاد یاراں کی بھی توفیق کہاں سے لاتا
میں وہ بے درد کہ شرمندۂ فرصت بھی نہ تھا

دل پہ جو کچھ بھی گزرتی تھی سو کہہ دیتے تھے
اور اس پر ہمیں کچھ نازِ صداقت بھی نہ تھا

یاد رکھا تو بڑی بات کہ اس مدت میں
بھول بھی جاتے تو پہلوئے شکایت بھی نہ تھا

کیا محبت میں مجھے طالع بیدار ملا
دل ملا، جان ملی، درد ملا، یار ملا

اپنی تنہائی کے اندوہ میں رہتے بستے
میری خاموش وفا کو لبِ اظہار ملا

دل کو قرارِ محبت کی تمنا نہ رہی
ایسا اس شوخ کو پیرایۂ انکار ملا

نیند آئی تو تجھے خواب میں لے کر آئی
کیا شبِ ہجر مجھے طالع بیدار ملا

جاگتے شہر کے کوچوں میں جسے بھی دیکھا
اپنے ہی خواب کے زنداں میں گرفتار ملا

فیض پہونچا ترے گیسو کے پرستاروں کو
حشر کی دھوپ میں ایک سایۂ دیوار ملا

غم کا مضمون سنانا ہے اگر ان کو سلیم
اس میں کچھ اور بھی لذتِ گفتار ملا

ہر لمحہ سوال ہو گیا ہے
یہ کیا مرا حال ہو گیا ہے

مرنا بھی نہیں ہے اتنا آساں
جینا بھی محال ہو گیا ہے

ہر لمحہ نشاط آرزو کا
اب رنج مآل ہو گیا ہے

جو وقت کہ تیرے ساتھ گزرا
اب جاں کا وبال ہو گیا ہے

وہ عشق کیا ہے میں نے تجھ سے
جو ایک مثال ہو گیا ہے

پوچھے بھی کوئی تو کیا بتاؤں
بے وجہ ملال ہو گیا ہے

جو لمحۂ ہجر مجھ پہ گزرا
ہمرنگِ وصال ہو گیا ہے

کیا فیض ہے داغ آرزو کا
تو ماہِ کمال ہو گیا ہے

چڑھتا ہوا آفتاب تھا میں
اب میرا زوال ہو گیا ہے

یاد آئی ہے تو آرامِ دل و جاں کی طرح
تیرے الطاف کی خوشبو کہ تھی مہماں کی طرح

آج سوچا ہے تو احساسِ زیاں ہے کتنا
میں اسے بھول گیا خوابِ پریشاں کی طرح

سعیِٔ راحت سے علاجِ غمِ پنہاں نہ ہو
زخمِ دل سی نہ سکے چاکِ گریباں کی طرح

وسعتِ فکر میں آئے تو بیاباں ہوجائے
ورنہ ہر لحمہ موجود ہے زنداں کی طرح

دل ویراں میرے اشکوں سے ہوا ہے سرسبز
میں نے رکھ دی ہے بیاباں میں گلستان کی طرح

جس کو زیبا تھا اگر ناز خدائی کرتا
وہ میرے سامنے آیا ہے تو انسان کی طرح

دریا کی طرح ہے فیض اُس کا
صحرا کی طرح میں تشنہ لب ہوں

محروم جواب ہوں ازل سے
کیا جانئے کس کی میں طلب ہوں

ہر بات کی فکر یوں مجھے ہے
ہر چیز کا جیسے میں سبب ہوں

ہنستی ہوئی آنکھ میں جگہ دو
گریہ ہوں پہ گریۂ طرب ہوں

بگڑا ہوں کہ بن گیا بہرحال
پہلے جو نہیں تھا، میں وہ اب ہوں

ہے میرا خدا، خدائے قہار
اندر سے میں شعلہ غضب ہوں

تجھ سے ملا تو خوش نہیں تھا
میں بھی کوئی آدمی عجب ہوں

پہلی ہی نظر میں یوں لگا تھا
جیسے وہ مرے لئے بنا تھا

ایک بات سی بن گئی تھی ورنہ
میں کون سا ایسا باوفا تھا

کچھ مجھ ہی سے ضد سی ہوگئی تھی
ویسے تو وہ آدمی بھلا تھا

دھوکا تو نہیں ہوا ہے مجھ کو
میں پہلے سے اس کو جانتا تھا

وہ شام بھی کچھ اُداس سی تھی
میں اس سے خفا سا ہوگیا تھا

اب یاد نہیں کہ بات کیا تھی
کچھ تھا کہ مجھے بُرا لگا تھا

وہ اس کا خموش بیٹھنا بھی
تنہائی کی طرح کھل رہا تھا

پھر اس کے کچھ اور پوچھنے سے
ایک بار سا دل پہ ہوگیا تھا

میں آج بھی ہوں اُداس لیکن
اس وقت کچھ اور ہی مزا تھا

اس کے سوا کہ فرض کریں ہم محال کو
تجھ سا کوئی ملا نہیں تیری مثال کو

اب تک کھلا نہیں مرے دل پر یہ رازِ عشق
میں تجھ کو چاہتا ہوں کہ اپنے خیال کو

تھا ہجر ناگوار مگر فیضِ ہجر سے
وہ غم ملا کہ بھول گیا ہوں وصال کو

کہتے ہیں لوگ حُسن کو اپنی خبر نہیں
کیا جانے کیسے جان گیا میرے حال کو

ہر لمحہ اک بہشت تصور ہے ان دنوں
ایسے میں کیا کروں گا میں فکرِ مآل کو

کائنات ایک ادھورا جواب ہے
رکھا ہے التوا میں ہمارے سوال کو

قطعات

اسی کے گرد گردش کررہا ہوں
جو طے ہوتا نہیں وہ فاصلہ ہوں
مرا اس سے تعلق دائمی ہے
وہ مرکز ہے میں اس کا دائرہ ہوں

☆

مکاں کے دائروں کو ناپتا ہے
کراں سے تا کراں پھیلا ہوا ہے
یہ نقطہ جس کی ہیں شکلیں ہزاروں
خود اپنی وسعتوں میں چھپ گیا ہے

☆

کوئی تازہ تمنا چاہتا ہوں
مرا دل ایک غم سے تھک گیا ہے
میں اس کو شاخ پر رہنے تو دیتا
مگر یہ پھل زیادہ پک گیا ہے

☆

ستارے آسماں سے گر رہے ہیں
یقیناً اک قیامت بھی اٹھے گی
یہ دنیا جو بظاہر مر رہی ہے
یہ خاکستر سے اپنے جی اٹھے گی

☆

مجھے خود میری ہستی کی خبر دی
مسرت میرے جان و دل میں بھر دی
وہ اخفائے محبت چاہتا تھا
دیا بوسہ لبوں پر مہر کر دی

☆

شعاعیں جذب اس میں ہو رہی ہیں
یہ ذرہ جو ابھی کجلا رہا ہے
کوئی اس کی توانائی تو دیکھے
یہ سورج کو زمیں پر لا رہا ہے

☆

بگولا بن کے ہر سُو پھر رہا ہوں
اشارے پر ہوا کے ناچتا ہوں
حقیقت میری ہستی کی ہے اتنی
خود اپنی گرد سے پیدا ہوا ہوں

☆

بات کی ہے مختلف اوقات میں
خامشی بڑھتی گئی ہے ذات میں
خود بخود چھپتا گیا ہوں اِس قدر
جس قدر ظاہر ہوا ہوں بات میں

☆

کسی ذرے کو تابندہ کیا ہے
کسی لمحے کو پائندہ کیا ہے
فنا سے صرف وہ چیزیں ہیں محفوظ
محبت نے جنہیں زندہ کیا ہے

☆

مسلسل دید بھی شاید کبھی ہو
ابھی تو اس کے ڈر سے کانپتا ہوں
مرا دل جیسے ہمسائے کا گھر ہے
کبھی روزن سے خود کو جھانکتا ہوں

☆

جو ذرہ ہوں تو تابندہ کریں گے
جو لمحہ ہوں تو پایندہ کریں گے
نہ جانے دُور ہے کتنی قیامت
نہ جانے کب مجھے زندہ کریں گے

☆

طبیعت صبر کی خوگر ہوئی تھی
غموں کا مرحلہ سر کرلیا تھا
یہ اس میں ڈال دیں کس نے دراڑیں
کہ میں نے دل کو پتھر کرلیا تھا

☆

رجسٹر میں ہوں اس کے مدِ فاضل
لکھا ہے پھر قلمزد کردیا ہے
میں تخمینہ سے اس کے بڑھ گیا تھا
سو فطرت نے مجھے رد کردیا ہے

☆

ہم اپنی خود کلامی میں ہیں مصروف
ہر اک کچھ اپنی اپنی کہہ رہا ہے
جزیرے ہیں کہ جن کے درمیاں میں
زمانے کا سمندر بہہ رہا ہے

☆

وہاں بھی زندگی کے گل کھلیں گے
وہاں بھی شاد اور ناشاد ہوں گے
ازل کے دن سے جو سونے پڑے تھے
وہ ویرانے بھی اب آباد ہوں گے

ستاروں کی طرف اُڑنے لگا ہوں
نظر سے تیز ہے رفتار میری
ملی تھی روح کو پرواز اب تک
ہوئی اب خاک بھی پرواز میری

☆

خلا آباد ہوگی زندگی سے
فضا جذبات سے معمور ہوگی
ابھی ہونے کو ہیں سب فاصلے طے
یہ منزل اور تھوڑی دُور ہوگی

☆

جلاوطنی کے دن پورے ہوئے ہیں
حیاتِ تازہ پانے جارہا ہوں
کیا ہے طُور کو زندہ کسی نے
میں پھر سے آگ لانے جارہا ہوں

☆

نہ جانے کتنے جلوے تھے سر راہ
نہیں دیکھا کبھی نظر اٹھا کے
محبت پارسائی بن گئی ہے
اسے تیرے لیے رکھا بچا کے

☆

نہ جانے دیکھتی کیا ہیں یہ آنکھیں
بھروسہ کیوں نہیں ہے زندگی پر
ملی ہے کون سی اُن کو بصیرت
یہ کیوں رونے لگی ہیں ہر خوشی پر

☆

میں دُنیا کو بدلنا چاہتا ہوں
مجھے دُنیا بدلنا چاہتی ہے
مشیت نے کشاکش کی ہے پیدا
وہ اپنی چال چلنا چاہتی ہے

☆

منتشر تھی مری کتاب حیات
اب فراہم ہوا ہے شیرازہ
ہو خدا سے کہ کائنات سے ہو
آدمی نام ہے تعلق کا

☆

مری جرأت کو ہیں دعوے ہزاروں
جہاں ڈر ہے وہاں مردوں کا گھر ہے
میں اپنی بُزدلی سے ڈر رہا ہوں
نہیں ہے شیر کا، ٹپکے کا ڈر ہے

☆

میرا ماضی مرے پیچھے نہ آئے
مجھے یادوں کی اب فرصت نہیں ہے
نئے خوابوں میں اُلجھایا گیا ہوں
رہی تعبیر سو عُجلت نہیں ہے

☆

تعلق پر مدارِ زندگی تھا
نہ جانے مر گیا یا سو گیا ہے
جو ہر شے اپنی جانب کھینچتا تھا
وہ مقناطیس اب گم ہو گیا ہے

☆

نہیں کھلتا کہ میرا جہل کیا ہے
کہاں تک آگہی کا سلسلا ہے
میں جس کے درمیاں ہوں زندگی میں
وہ میری روشنی کا دائرا ہے

☆

اس تعلق کی ابتدا کیا ہے
جذبۂ دل کی انتہا کیا ہے
عمر آدھی گنوا کے سوچتا ہوں
عشق کیا ہے مرا، وفا کیا ہے

☆

ایک گُم کردہ راہ اور سہی
اور ہوگا تباہ اور سہی
ابنِ آدم جہانِ نَو کے لیے
ایک تازہ گناہ اور سہی

☆

اُسے جب اس کی فطرت نے پکارا
فریضے اور ہی اُس نے سنبھالے
وفا کیا سنگریزوں سے نبھاتا
وہ جس نے آنچلوں میں لال پالے

☆

وفا اک انفرادی مسئلہ ہے
صداقت کی یہی ہے ترجمانی
وفا سے مسئلہ اس کا بڑا ہے
کرے اک نسل کی جو پاسبانی

☆

وہ مجھ کو چھوڑ بیٹھا آخرِ کار
سبب اس کا نہیں ہے بے وفائی
وفا تو اس کی گھٹی میں پڑی ہے
نہیں مجھ سے زمانے نے نبھائی

☆

کثافت جس قدر ہے جل گئی ہے
ہوا ہوں پاک میں شعلہ سے تن کے
ادا جب کی نمازِ عشق میں نے
تیمّم کرلیا خاکِ بدن سے

☆

آخری درد بھی ہوا رُخصت
آج ویراں ہوا ہے خانۂ جاں
سارے ہنگامے لے کے ساتھ اپنے
گھر میں آکر چلا گیا مہماں

☆

بہت تیزی سے گذری جا رہی ہے
یہ سانسیں زندگی رائیگاں کی
اگر پھر ہو ترے ملنے کا امکاں
میں باگیں کھینچ لوں عمرِ رواں کی

☆

دل میں تھی کس کی طلب یاد نہیں
حال جو کل تھا وہ اب یاد نہیں
گریۂ شب سے ہیں آنکھیں نم ناک
اور رونے کا سبب یاد نہیں

☆

روح میں ہوتی ہے سرگوشی سی
آہ وہ لہجہ مانوس ترا
یاد آیا کوئی گذرا موسم
جیسے اترا ہوا ملبوس ترا

☆

کبھی اپنی خوشی پر شاداں ہوں
کبھی اپنے غموں پہ نوحہ خواں ہوں
تواضع خود ہی کرلیتا ہوں اپنی
میں اپنے گھر میں اپنا مہماں ہوں

☆

کشش سے باہمی قائم ہیں دونوں
میں اس کا ہوں وہ میرا ہے سہارا
ستارے ایک ہی برجِ وفا کے
مگر ملنا نہیں ممکن ہمارا

☆

مدتوں میں پرستشِ چشم کرم
کرگئی ہے اور بھی مجھ کو اُداس
گرمیوں کی دوپہر میں جس طرح
برف کے پانی سے بڑھ جاتی ہے پیاس

☆

بھلا بیٹھا تھا جن یادوں کو دل سے
وہی یادیں ہیں جن پر جی رہا ہوں
اُدھیڑا تھا جسے لاکھوں جتن سے
وہ پیراہن میں پھر سے سی رہا ہوں

☆

تمہارے دوش پر بھاری نہیں تھا
یہ احساس کس لیے فرما دیا ہے؟
عزیز اس قدر عجلت بھی کیا تھی
مجھے زندہ ہی کیوں دفنا دیا ہے؟

☆

معمے کی طرح پر پیچ ایسا
کہ وہم و عقل سے جانا نہ جائے
کبھی ایسا کہ جیسے مرا سایہ
کبھی ایسا کہ پہچانا نہ جائے

☆

کبھی اس کی طرف پاسنگ ڈالا
کبھی مری طرف پلڑا جھکایا
رکھا ہر حال میں قائم توازن
وہ دو روحوں میں ہے یکساں سمایا

☆

نہاں ہیں جتنے فطرت میں تضادات
وہ سارے ہیں بروئے کار اُس میں
بظاہر ہے سراپا صلح لیکن
عجب رہتی ہے اِک پیکار اُس میں

☆

ترے انفاسِ تازہ میں بسا کر
میرے سینے میں پہنچا دی گئی ہے
جو صرف زندگی رائیگاں تھیں
وہ سانسیں مجھ کو لوٹا دی گئی ہیں

☆

وہ لمحہ جو فنا ناآشنا تھا
حیاتِ تازہ مجھ کو دے رہا ہے
میں گویا از سرِ نو جی رہا ہوں
کوئی پھر مجھ میں سانسیں لے رہا ہے

☆

وفا، ایثار، قربانی، محبت
یہ نکتے زندگی کے پا رہا ہوں
سمجھتا جا رہا ہوں آدمی کو
اُسے جتنا پرکھتا جا رہا ہوں

☆

کبھی ہمراہیوں میں تری دن بھر
کبھی راتوں کو تنہا جاگنے میں
جو ترے پاس رہنے میں مزہ ہے
وہی ہے لطف تجھ سے بھاگنے میں

☆

فراق و وصل کے گر جانتا ہے
وہ اپنی فطرت میں سادہ میں سچا
کھلونے دے کے بہلاتا رہا ہے
سمجھتا ہے مجھے بھی کوئی بچہ

دھنک تھا، پھول تھا، شعلہ تھا، کیا تھا
جو اک کھیتی کا بادل بن گیا ہے
کوئی رنگیں سی شے تھا مگر اب
وہ آنچل ماں کا آنچل بن گیا ہے

غموں کو بھول جانا سیکھتا ہوں
کہ جینے کا بہانہ سیکھتا ہوں
مرے بچے یہ ننھے پھول میرے
میں ان سے مسکرانا سیکھتا ہوں

☆

نثریے

(۱)

میرے تجربے کی سچائی، زبان کی کثافتوں سے آلودہ ہو کر پرانے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے نوزائیدہ بچہ کی طرح بلک رہی ہے۔ میں بول نہیں سکتا کیونکہ جھوٹے لوگوں نے ہر لفظ کو غلاظتوں میں لپیٹ کر اپنے گھر کے باہر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا ہے، اور تو اور میری خاموشی بھی گونگے کی خاموشی ہے کیونکہ میں بولنے والوں کی بامعنی خاموشی سے محروم ہوں۔ کل میں دیکھ رہا تھا۔ ایک بھلامانس بلک بلک کر رویا۔ اس کی چیخیں سنی نہیں جاتی تھیں۔ وہ خاردار جھاڑیوں پر کھنچی ہوئی چادر کی طرح زخموں سے چور چور تھا مگر جب لوگوں نے تالیاں بجا کر خوشنودی کا اظہار کیا تو وہ اپنے پیسے لے کر چلتا بنا۔ ایکٹروں نے ہر انسانی جذبہ کو مال تجارت بنا کر کالے بازاروں میں بیچ دیا ہے۔ اب آنسو گلیسرین بن چکے ہیں اور آنکھوں کے گرد غم ناک حلقے جن میں عیسیٰ کے کرب کی جھلک دکھائی دیتی ہے، کالی پنسل سے بنائے گئے ہیں۔ جھوٹے یوحنا اپنے جھوٹے مسیحاؤں کی آمد کے اعلان نامے اپنی بغلوں میں دبائے سرکس کے مسخروں کی طرح اچھل کود کر رہے ہیں۔ ایسے میں کون ہے جو ہم سب کی اور یونان، مصر اور روم کے دیوتاؤں کی موت کا اعلان کر سکے، کیونکہ اس موت کے بعد کوئی پیدائش نہیں ہے۔ اور ہم سب جھوٹے ہیں۔

(۲)

شرافتوں کی بات نہ کرو۔ تمہارے منہ سے نکلتے ہوئے بدبو کے بھبکارے تمہیں جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جاؤ پرانی نجابتوں کو آبرو باختہ لڑکیوں کی طرح سڑکوں اور چوراہوں پر اپنے چھپائے جانے والے اعضا کی نمائش کرتے ہوئے دیکھو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ صدیوں سے بچا کر رکھی جانے والی عصمتوں پر وقت کی گھناؤنی اور فحش مہریں ثبت کی جاچکی ہیں اور ہر وہ چیز جو کبھی عظمت کہلاتی تھی، چند کھوٹے ذلیل سکوں کے عوض اس کا نیلام اٹھایا جاچکا ہے۔ کل

رات بوڑھی صداقتوں کو سنگسار کرنے کے بعد جب ننگی صلیبوں پر لٹکایا جارہا تھا، اس وقت تم کہاں سو رہے تھے؟ تم نے ندامت کا بوجھ اٹھانے سے بھی انکار کر دیا اور اسٹاک ایکسچینج میں صرف اپنے مفادات کے گرتے چڑھتے ہوئے بھاؤ کا حساب لگانے میں مصروف رہے۔ پھر قدروں کو زندہ کرنے کے لیے کیا خدا آسمان سے اپنے فرشتے اتارے گا؟ انسان ایک ذمہ داری کا نام ہے اور افسوس کہ تم نے، میں نے اور ہر اس شخص نے جو روٹی کھانے کے بعد آرام کی نیند سو سکتا ہے، ریاکاری کو ذمہ داری کا بدل سمجھ لیا ہے۔

(۳)

اختلاف کرنے کے معنی ہیں اہمیت کھو دینا کیونکہ پتھروں سے کوئی اختلاف نہیں کرتا، لیکن میری حیرت زدہ آنکھوں نے ایسے تماشے بھی دیکھے ہیں۔ جب اختلاف کو نامرد کی شہوت کی طرح نظر انداز کر دیا گیا یا اپنی بیوی سے آشنائی کے عمل کی طرح دشمنی کی بنیاد سمجھ لیا گیا۔ یاد رکھو جب تک تم اختلاف کو برداشت کرنا...... نہیں، اختلاف کو پسند کرنا نہیں سیکھو گے، تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ جہاں تم ہو، وہاں تم نہیں ہو اور جہاں تم نہیں ہو، وہاں تمہارے ہونے کا امکان ہے۔ جھوٹا معاشرہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک بزدلانہ سمجھوتے پر اپنی سودا بازی کی بنیاد رکھتا ہے۔ اختلاف کے معنی حقارت کے ساتھ اس سودا بازی سے انکار کر دینے کے ہیں۔ جاؤ اختلاف کا احترام کرو اور آئینے سے اس کی بینائی چھیننے کی حماقت نہ کرو۔

(۴)

بندر اگر آئنہ سامنے رکھ کر ریزر سے شیو کرنے بیٹھ جائے تو وہ انسان نہیں بن جائے گا۔ پھر تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ انسانوں کا مذہب بندروں کا مذہب ہو سکتا ہے۔ بندروں نے تو استرے کی طرح

اپنے مذہب سے صرف اپنے آپ کو اور دوسروں کو زخمی کرنے کا کام لیا ہے۔ یقین کرو میں مذہب کو استرا نہیں سمجھتا، مگر مشکل تو یہی ہے کہ نقالوں، بہروپیوں اور سوانگ بھرنے والوں نے کسی بھی حقیقی چیز کی پہچان مشکل بنا دی ہے۔ کنفیوشس نے کہا تھا "میں سب سے زیادہ نفرت ان چیزوں سے کرتا ہوں جو غیر حقیقی ہیں، مگر حقیقی ہونے کا دھوکا دیتی ہیں۔" لفظ کم از کم ایسے ہونے چاہئیں جن کو چالاک تاجر اور اس سے بھی زیادہ عیار سیاست دان اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔ مساوات، اخوت اور عدل عمرانی...... کیا تم سمجھتے ہو کہ ٹی وی، ریڈیو اور ماس میڈیا کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے بقراط انہیں اپنے معاوضے کی لازمی شرط سمجھنے کے علاوہ کسی اور طرح بھی سمجھ سکتے ہیں؟ اے میرے بھائی! ابھی تو میں خود بھی ارتقاء پر کتابیں پڑھ پڑھ کر یہ سوچنے میں مصروف ہوں کہ بندر اور انسان کی درمیانی کڑی کہاں گم ہو گئی ہے؟

(۵)

میں نے جب پورے آدمی کی تلاش کا اعلان کیا تو نہ جانے کتنے ادھورے جانور اپنی اپنی انا کی دولتیاں جھاڑتے ہوئے میرے پیچھے پڑ گئے، مگر بعد میں ان کی محبوباؤں نے حقیقت انہیں بتا دی اور سارتر کی انٹی میسی کی محبوبہ اپنے نامرد شوہر کو چھوڑ کر عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔ بات یوں ہے کہ جھنجھوڑنا، بھنبوڑنا اور بستر پر ہانپنا کتنی بری بات کیوں نہ ہو مگر زیر ناف نمی کے بغیر کھیتیاں سرسبز نہیں ہو سکتیں۔ میں نے بس اتنا جو کہا تھا کہ جنس اور معاش کو ہم شیطان کے حوالے نہیں کر سکتے، ورنہ عوام کا نام لے کر عوام کو سودا کرنے والے جھوٹے مسیحا ہمارے سروں پر بیٹھ کر ڈھول بجانے لگتے ہیں اور ہماری محبوبائیں کوٹھی، کار اور بینک بیلنس کے لیے اپنی محبتیں بیچ دیتی ہیں۔ پس آؤ ہم سب مل کر اس گم شدہ صداقت کی تلاش کریں جسے رومانی شاعروں، ریاکار اصلاح پسندوں اور جھوٹے انقلابیوں نے گہرے پانیوں میں پتھروں کے ساتھ باندھ کر غرقاب کر دیا ہے۔

(۶)

میں نے مانا وہ تمھیں بینک کے لاکر میں محفوظ سرمایہ کی طرح عزیز رکھتا ہے، لیکن مجھے تو جنگلی گلاب کی خوشبو، رنگ اور غیر محفوظ زندگی سے پیار تھا۔ نغمہ سیارگان کے سننے والے ڈفلی کی ڈھب ڈھب کو پسند نہیں کرتے حالانکہ پیسہ اسی سے کمایا جاسکتا ہے۔ تم اپنے شوکیس میں سجی ہوئی گڑیوں کی طرح اس کے پرس کے خانوں میں بیٹھی ان حسرتوں کا شمار کرتی ہو جو پوری ہو سکتی تھیں۔ اگر تم نے اپنے خوبصورت جسم کی ایسی حماقت آمیز توہین نہ کی ہوتی، مگر چھپی ہوئی آشنائیوں میں بھی کیا حرج ہے؟ فہمیدہ کو دیکھو۔ جب اپنے خالی بستر اور تنہائی سے گھبراتی ہے تو رات کی رات کے لیے اپنے شوہر کا نعم البدل تلاش کر لیتی ہے اور اس کا احمق شوہر یہی سمجھتا ہے کہ اس کے بچے واقعی اس کے بچے ہیں۔ تمھیں بے وفائی کا طعنہ نہیں دے رہا ہوں کیونکہ وہ ان جاگیرداروں کا تراشا ہوا ڈھکوسلا ہے جو اپنی داشتاؤں کو بھی دوسروں کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ یہ وفا کا نہیں، جسم کی زندہ پکار کا ذکر ہے جس کی ہم رنگ نغمگی کے بغیر زندگی کا ہر سر جھوٹا پڑ جاتا ہے۔ بہر حال اتنی بات سچ ہے کہ وہ چاہے تو تمھاری ہر مسکراہٹ کی قیمت اپنے ڈالروں سے ادا کر سکتا ہے۔

(۷)

جب ہم نے اپنی کشتیوں کے بادبان کھولے تو ہواؤں کے جھکڑ ساحلی پرندوں کی طرح اڑنے کے لیے اپنے پر تول چکے تھے۔ آن کی آن میں ہمیں طوفان نے آن لیا اور ایک سیاہ فام ملاح لڑکی نے اپنے جوان سینے کی طنابیں کھینچتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''ہمیں اپنی موت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'' موت کا انتظار فلیٹوں کے تنگ و تاریک کمروں میں وہ پاک باز عورتیں بھی کرتی ہیں جن کی بکارت کا معاوضہ مہر کے پیسوں اور درجن بھر بدصورت بچوں کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے اور جن کی چھاتیاں الٹی لٹکی ہوئی مردہ چمگادڑوں کی طرح جھولتی رہتی ہیں۔ ہمیں طوفان اور موت کے درمیان زندگی

یولیس کے سفر کی طرح بامعنی معلوم ہوتی اور میں نے سیاہ فام لڑکی سے کہا۔ ''ہم نہیں مریں گے کیونکہ موت کے لیے تیار رہنے والے کبھی موت کا شکار نہیں ہوسکتے۔'' رات ہونے تک ہم نئے ساحلوں پر نئی زندگی کی روشنیاں دیکھ رہے تھے۔

(۸)

اس جزیرے میں صرف تین آدمی تھے۔

ایک میں کہ غیر ملکی سیاحوں کی طرح اپنی روح کی دریافت کے لیے چلا تھا اور پہلے ہی قدم پر راستہ بھول گیا تھا۔ دوسرے تم کہ اکتائے ہوئے بچوں کی طرح اپنے سارے کھلونوں سے بیزار ہو کر گھر سے باہر اپنے سائے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں اور تیسرا وہ جس کے بارے میں، میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے اس سے محبت کرنا چاہیے یا نفرت۔ ہاں ایک بات کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گیا۔ اس جزیرے کے بیچوں بیچ ایک قدم آدم آئینہ لگا ہوا تھا جس میں ہر شخص کو اپنی وہ شکل نظر آتی تھی جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ہم تینوں جزیرے میں دیر تک گھومتے رہے اور جب کبھی ہم نے کسی اور طرف جانا چاہا، آئینے کے جادو نے ہمیں گم شدگی کا خوف دلا کر روک دیا۔ شاید ہم اس جزیرے سے کبھی نہ نکل سکتے کیونکہ خواہشیں، دلدل اور جزیرے ایسے ہی ہوتے ہیں، مگر خوشی اور غم سے یوں ہوا کہ تم نے آئینے میں اپنا آخری روپ اپنے بچوں کی مسکراہٹ میں دیکھ لیا۔

(۹)

خواہش اور قدروں کے ٹکراؤ نے مجھے پاش پاش کر دیا مگر تم پر کچھ بھی گزری، اسے تو میں بھی نہیں جانتا کیونکہ پراسرار سمندر کی طرح تم کوشش کیے بغیر رازوں کو چھپانا جانتی تھیں اور تمہارے مقابلہ پر مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اتھلے دریاؤں کی سیپوں کی طرح میری باتیں کچھ خالی خالی

سی ہیں۔ میرے اتھلے پن کو معاف کر دو۔ میں جانتا ہوں، یہ باتیں الفاظ میں نہیں آتیں تو زیادہ بامعنی ہوتیں۔ مگر اس کے باوجود جب تم میری باتیں سنو گی تو ہمیشہ کی طرح در گزر سے کام لیتے ہوئے، ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں طنز کا شائبہ بھی نہ ہو گا، صرف اتنا ہی کہو گی معلوم نہیں کیوں تمہیں عورتوں سے ہمدردی حاصل کرنے کا شوق ہے اور لفظوں کی محبت نے تمہیں شاعر بنا دیا۔

(۱۰)

ہر سیارہ اپنے ہی محور پر گردش کرتا ہے۔

مگر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ پنہائی فلک کے دو آوارہ گرد اپنی نامعلوم اور پراسرار گزرگاہوں پر تنہا شب روی کرتے کرتے، آن کی آن کے لیے ایک دوسرے کی کشش کے دائرے میں در آتے ہیں اور یک جائی کے اس اتفاقی لمحہ کو ہم کبھی محبت کہتے ہیں اور کبھی مکالمہ۔ محبت یوں کہ مکالمہ محبت کے بغیر اسی طرح ناممکن ہے جیسے وسعت کے بغیر مکان۔ اور مکالمہ یوں کہ محبت اگر مکالمہ نہ بنے تو اسے خود پرستی کی توسیعی جارحیت کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ مکالمے کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ دو مکانوں کے درمیان کی دیوار ہٹا دی گئی ہے اور جس محبت نے دیواروں کو گرانا نہیں سیکھا، اس سے وہ کاروبار اچھا ہے جس سے ملبہ ڈھونڈنے والے اپنی روزی کماتے ہیں۔ پھر بھی ایک بات ہے جسے تم ہمیشہ بھول جاتے ہو۔ محبت مکالمہ اور ستاروں کی یکجائی گھڑی کی سوئیوں کی طرح صرف ایک ہی لمحہ کی بار بار بازیافت کا نام ہے۔

(۱۱)

سورج ڈھلنے میں تھوڑی دیر باقی ہے۔

ابھی چند ساعتوں کے بعد شام کے سائے گزرگاہوں پر پھیلنے لگیں گے اور ٹریفک کی رفتار کسی مریض کے دل کی طرح خود بخود تیز ہو جائے گی۔ پرندے جب شام کو آشیانوں کی طرف لوٹتے ہیں تو ہمیں یہ بھی یاد نہیں آتا کہ زندگی ہم سے کتنی دور ہو گئی ہے۔ ننھی چڑیا چوں چوں کرتی اپنے بچے کو دانہ کھلا رہی ہے۔ اسے میرے کمرے کی ویرانی پسند تو نہ ہو گی مگر شہروں میں چڑیوں اور کبوتروں کے اپنے فلیٹوں اور بینکوں کی اونچی اونچی چھتوں کے علاوہ کوئی جگہ بھی تو نہیں ہے۔ تنہائی کسی ویران گوشے میں اونگھتے اونگھتے یکایک جاگ جاتی ہے اور دیوار سے کود کر میرے بستر میں چھپ جاتی ہے۔ معلوم نہیں وہ شامیں، جب چائے کا ذائقہ اچھا لگتا تھا، اب کن قہوہ خانوں میں بھٹک رہی ہوں گی۔

ایک دفعہ تم نے مجھے لکھا تھا ''آج کل شام کو کس وقت چائے پیتے ہو، میں بھی ٹھیک اسی وقت چائے پیا کروں گی، اور دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچا کریں گے۔'' محبت کو ایسی حماقت آمیز باتیں کرنے کا کتنا شوق ہوتا ہے، مگر تب تم محبت کی حماقت کو نہیں سمجھتی تھیں۔ صرف بچے، شاعر اور دیوانے ہی جانتے ہیں کہ دکھائی نہ دینے والی چیزیں دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ اہم اور بامعنی ہوتی ہیں اور بوسوں کو گننے سے کوئی مالدار نہیں ہو جاتا اور ذائقہ کی موت سے پہلے کوئی سوچتا بھی نہیں کہ چائے کا ایک گھونٹ بھی کتنا قیمتی ہو سکتا ہے۔ کتنی باتیں تھیں جنہیں میں بھول گیا کیونکہ اب تو بچوں کو بھی یاد نہیں رہا کہ دھنک کے رنگ کیسے ہوتے ہیں؟ یادیں راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح کریدنے سے چمک اٹھتی ہیں مگر آن کی آن میں انہیں بھی راکھ بنا دیتی ہے۔

کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے میں زندہ ہو جاتا ہوں اور بیتی ہوئی ہر شام اپنی ایک ایک ساعت کو یوں دہرانے لگتی ہے جیسے وہ لمحے ابھی تک گزرے نہیں ہیں اور وقت تمہاری مسکراہٹ کی طرح دائمی ہو گیا ہے۔ زندہ تو صرف وہی چیزیں ہیں جنہیں محبت نے زندہ کیا ہو، ورنہ مسکراہٹ کو ننھی ننھی کونپلوں کو اور پاؤں کے نیچے محسوس ہونے والی اوس کی نمی کو کون یاد رکھتا ہے۔ ہر شام میں اپنی

بکھری ہوئی زندگی ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچوں کی طرح سمیٹنے میں زخمی ہو جاتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ شاید زندگی، زخم اور محبت تینوں ایک ہی چیز کے نام ہیں۔

(۱۲)

دسمبر کی خنک افسردہ رات میرے تھکے ہوئے احساس کی طرح خود اپنی ہی خنکی سے ٹھٹھری ہوئی، اپنے سفر کی آخری منزلیں طے کر رہی ہے۔ زرد اور پھیکا چاند تنہا افق پر کسی ویران گزرگاہ کے شکستہ پا مسافر کی طرح خلا کے موڑ پر بھٹکا ہوا ہے۔ بند کھڑکیوں کے روتے ہوئے شیشوں پر ملگجی کہر دور افتادہ ماضی کی یادوں کی طرح جمی جا رہی ہے اور دور کھمبوں پر اونگھتے بلب، نم خوردہ شراروں کی طرح رات کی راکھ میں چمک رہے ہیں۔ خلوتوں میں حساس دھڑکنیں اور نرم سرگوشیاں آہستہ آہستہ ہوتی جا رہی ہیں۔ سردیاں ہمیشہ باہر سے اندر آتی تھیں مگر اب کے برس ہمارے اندر سے باہر آئی ہیں۔

(۱۳)

تم کہتی تھیں...... "وہ بوسے جو ابھی ہونٹوں میں محفوظ ہیں، پچھلی بہار کے لگائے ہوئے زخموں میں ان کا سراغ ڈھونڈنا مستقبل کی توہین ہے۔" شاید اس لیے کہ عورت ہو۔ حوا کی بیٹی کا کام مستقبل کی تخلیق ہے ورنہ جنت کے بعد تو کوئی گھر آباد نہ ہوتا۔ خود کلامی اور ماضی کی محبت آدم کے پچھتاووں کا نام ہے۔ میں نے تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ پہلی نگاہ کے بعد تم کتنی بدل گئی ہو۔ موسموں کا تغیر اس کے سوا اور کیا ہے کہ تم نے جب چاہا، مجھے بھلا دیا اور جب چاہا یاد کر لیا، لہٰذا پھر اس اعتماد کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا کہ میں کتنا ہی دور کیوں نہ چلا جاؤں، دائرے کی طرح اپنے مرکز کے گرد ہی گھومتا رہوں گا۔
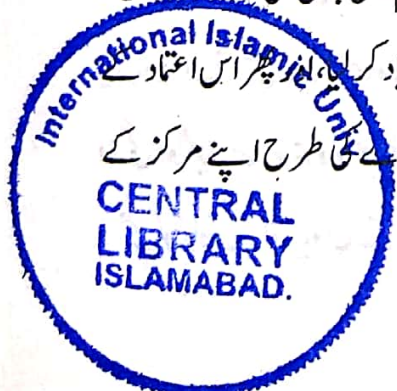
''اس جنگل میں آپ سلیم احمد کو کہاں تلاش کریں گے۔ سلیم احمد جو ایک بڑا غزل گو
شاعر ہے، جو بہت اچھا ڈرامہ نگار ہے، جو تنقید میں اصولی معاملات پر امام غزالی کی طرح
ہنٹر کھینچے بیٹھا رہتا ہے، جو ایک بڑے خاندان کا تنہا کفیل ہے، جس نے دوستوں سے ایذا
اٹھانے کے بعد بھی انہیں دعائیں دی ہیں، جو نروان کی تلاش میں جس درخت کے نیچے
جا کر بیٹھا، اس کی تپش سے وہ درخت ہی جل اٹھا۔ بہت مجبور ہو کر اب وہ شیخ اکبر محی
الدین ابن عربی کے پاس جا بیٹھا ہے۔ جہاں نہ کوئی صحرا ہے اور نہ کوئی درخت، ہر طرف
آگ ہی آگ ہے۔''
(اقتباس از بیاض)
Pakistan Rs. 495
ISBN 969-516-111-1
9789695161111
www.alhamra.com